۹۰۶

یہ کتاب چوہدری بشیر حسین ضیائی مرحوم (ایم۔اے طلہ گنگ) کے اس
ذخیرہ کتب کی جو اس کتب خانے کو عطیہ کیا گیا ہے۔ قارئین
سے درخواست ہے کہ مرحوم کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ شکریہ!

دُنیائے ادب کے وہ درخشاں سِتارے

جن کے بلند پایہ

مضامین نظم ونثر عید نمبر کی زینت ہیں

IQBAL ACADEMY PAKISTAN
LIBRARY
Acc. No: 39574

سلیم
محمد حسین آزاد
عبدالرحمن بجنوری
سید امتیاز علی
خدیجہ بیگم ایم اے
چغتائی
پطرس
تاثیر
امتیاز علی تاج
سالک
حفیظ
حسن نظامی
بہسر
شفق عماد پوری
خواجہ دل محمد
عزیز لکھنوی
بسمل
عشرت
ذوالفقار بخاری
اسلم
پریم چند
سُہا
دلگیر
فانی
اصغر
ریاض
اخلاق فاطمہ
عبدالباسط ایم اے
تہذیب فاطمہ
سلطانہ سعید
علامہ سر محمد اقبال

چچا چھکن نے تصویر ٹانگی ۵۱
ازجناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے
بارات کے ساتھ۔ حضرت رفیعی ۵۴
ظرافت، دو باکمال۔ مترجم ۵۷
ٹرین میں گفتگو کرنے اور گفتگو روکنے کا فن ۵۹
ازجناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے
شعرخوانی۔ ازجناب عبدالبشیر صاحب آذری ۶۴

پنکھڑیاں

ستارے۔ ایڈیٹر ۶۷
دفاچی۔ جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے ۶۸
عورت کا لباس۔ پنیچی گزٹ ۶۸
نگار خانۂ چین۔ جناب غلام عباس صاحب ۶۹
فرشتۂ غم۔ ایڈیٹر ۷۰
دعوتِ عمل۔ جناب مالک رام صاحب ۷۲
آنسو۔ ایڈیٹر ۷۳
سب سے پہلا تیرہ۔ جناب نذر محمد صاحب ۷۳
حقیقی مسرت ایڈیٹر ۷۴
مصوری اور فوٹوگرافی۔ نظامی قدوسی ایم اے ۷۵
نیند۔ ایڈیٹر ۷۵
سکھیاں۔ محترمہ اخلاق فاطمہ صاحبہ ۷۶

ڈرامے

ایک ایک روپ کے تین ڈرامے

پہلا ڈرامہ دکاندار ایڈیٹر ۷۶
دوسرا ڈرامہ ایجنٹ " ۷۸
تیسرا ڈرامہ عورت کی عدالت " ۸۲

نیرنگِ محبت، ایک سچا واقعہ ۸۵
ازجناب ریاض حسین صاحب بی اے
زمزمۂ تغزل۔ جناب رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب ۸۹
محمد سجاد علی خاں نواب آف کرنال
نعرۂ عاشقانہ۔ مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی اے ۹۰

مقالات

اصولِ تمدن۔ ازجناب عبدالباسط صاحب ایم اے ۹۱
ایڈیٹر علیگڑھ میگزین
نصیرالدین حیدر شاہ۔ خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی ۱۱۲
فریبِ عمل۔ حضرت تاثیر ایم اے ۱۱۵
اردو کا دورِ انقلاب۔ حضرت شفق عمادپوری ۱۱۶
شاہنشاہ رضا خان۔ محمد عبداللہ قریشی بی اے ۱۲۳
انگورہ مترجم ۱۳۲
مسولینی " ۱۳۶
ہمارے شاعروں کی نفسیات۔ مولانا وحیدالدین صاحب ۱۳۹
سلیم رکن اردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن
الف ب ت۔ مولوی سید ممتاز علی صاحب ممبر ۱۴۹
کورٹ آف مسلم یونیورسٹی
حقیقتِ دنیا۔ محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ بی اے آنرز
ایم اے۔ ایم او ایل پروفیسر گورنمنٹ کالج ۱۵۳

عیدنمبر کے بےمثل و لاجواب افسانے

(۱) صحرا کا لڑکا۔ ازجناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے ۱۵۶
(۲) شہیدِ جفا۔ ازجناب ایم اسلم صاحب ۱۶۶
(۳) اکسیرگر کا کمال۔ ایڈیٹر ۱۷۷
(۴) ناگو نکا دیوتا۔ محترمہ تہذیب فاطمہ عباسی کے قلم سے ۱۷۷

(۵) تجزیہ روح ۔ جناب منشی پریم چند صاحب ۱۸۲
(۶) ترکی ٹوپی ۔ ایک فرانسیسی افسانہ ۱۸۵
جناب غلام عباس صاحب
(۷) تارا ۔ محترمہ سلطانہ سعید کے قلم سے ۱۹۱
(۸) کالاعلم ۔ طبعزاد ۔ ایڈیٹر ۱۹۷
سالنامہ نیرنگ خیال ۲۰۲
(۹) سرخ پھول (ایک روسی افسانہ)
از جناب محمد اکبر خاں صاحب ۲۰۳
نقد و نظر ۔ جناب نظامی قدوسی ایم اے ۲۱۸

منظومات

میٹھے بول ۔ خواجہ دل محمد صاحب ایم اے ۲۱۹
صبح ۔ حضرت عزیز لکھنوی ۲۲۰
مزدور کا گیت ۔ جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے ۲۲۱
حسن ۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر بی اے ۲۲۲
گلشن جنت ۔ حضرت ابوالاثر حفیظ ۲۲۳
برکھا رت ۔ جناب حامد علی خاں بی اے ۲۲۴
کلام سیفی ۔ حضرت سیفی سیوہاروی ۲۲۴
خمخانۂ عرفان ۔ حضرت نظام الدین شاہ دلگیر اکبر آبادی ۲۲۵
حضرت حفیظ کی تازہ غیر مطبوعہ غزل ۲۲۶
کلام اصغر ۔ حضرت اصغر گونڈوی ۲۲۷
غزل ۔ حضرت سیماب ۲۲۸
غزل ۔ جناب ذوالفقار علی خاں بخاری ۲۲۸
کلام فانی ۔ حضرت فانی بدایونی بی اے ۲۲۹
زمزمۂ تغزل ۔ پنڈت ہری چند صاحب اختر بی اے ۲۲۹
غزل ۔ جناب آزاد انصاری ۲۳۰
غزل ۔ جناب اکبر حیدری صاحب ۲۳۰
غزل ۔ جناب قمر بدایونی ۲۳۱
خیالات مختار ۔ جناب مختار ۲۳۱
کلام تاثیر و کلام فانی ۲۳۲
اشتہارات ۲۵۴

ضروری اطلاع

خط و کتابت کے وقت خریداری نمبر کا حوالہ نہایت ضروری ہے،

منیجر

چندہ سالانہ تین روپے بذریعہ منی آرڈر
" " بذریعہ وی پی ۳/ ہے
ممالک غیر ۶ شلنگ

ششماہی ایک روپیہ بارہ آنہ
فی پرچہ عید نمبر ۸/

نیرنگ خیال کا عید نمبر ریلوے بک سٹالوں پر ۸/ کو مل سکتا ہے،

نوٹ:۔ عید نمبر سے ششماہی کے لئے رسالہ جاری نہیں ہو سکتا۔

منیجر

کاتب الحروف اشفاق احمد بریلوی

"مکافاتِ عمل"

علامہ سر آقبال کا غیر مطبوعہ کلام

خواجہ را از بندہ پیغامے بگو — کامگارے را زِ ناکامے بگو

آدمی کو صیدِ آدم می کند — سنگِ خود بر شیشۂ خود می زند

مُہلتش بخشد خدائے دیر گیر — تا بہ بندِ دیگرے آید اسیر

تا جزا ہا در عمل ہا مضمر است — پیشِ من پایانِ کارِ کیخسرؔ است

پیکرِ او را زمیں گورے نداد — جانِ خود جُز در یمِ شورے نداد

اند کے اندیش اگر داری نظر — انتقامِ خاکِ درویشے[1] نگر

"گندم از گندم بروید جَو ز جَو"

"از مکافاتِ عمل غافل مشو"

[1] مہدی مشہور مصری درویش جسکی ہڈیاں لارڈ کچنر نے غرق نیل کردیں۔

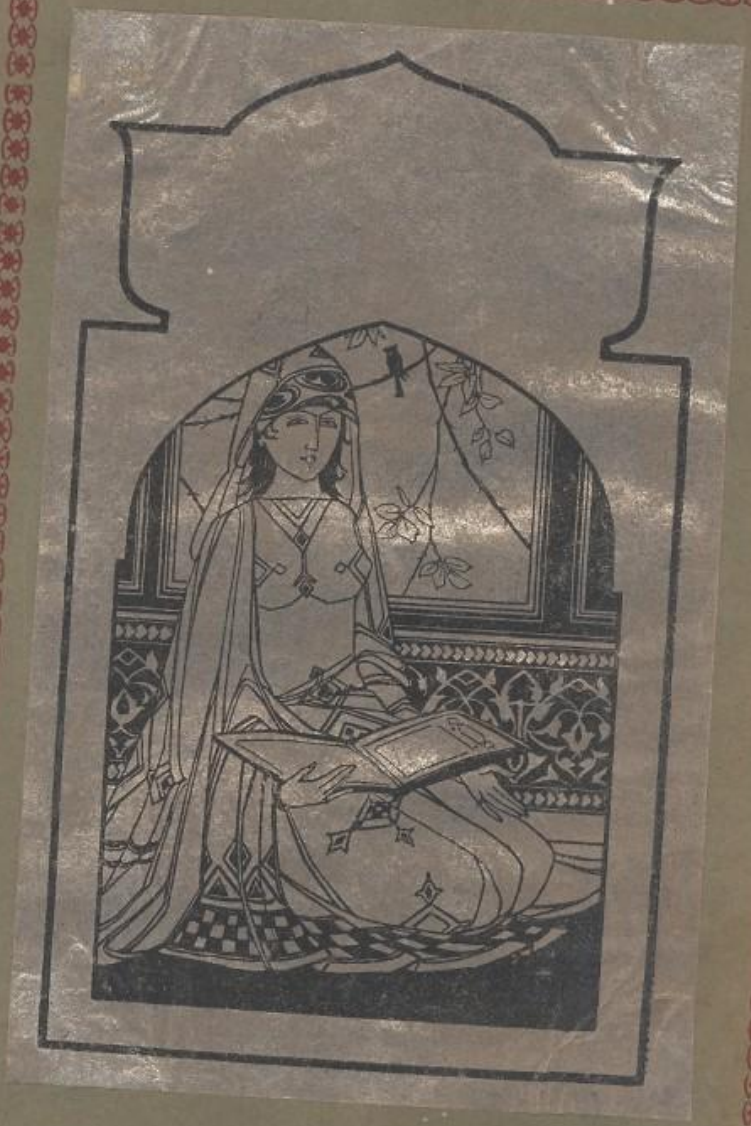

A pen drawing of Chughtai.

عید نمبر

الحمدللہ کہ آج نیرنگ خیال کا عید نمبر شایع ہوگیا، اور ہندوستان کے ہر حصّہ میں عید کے دن یہ علمی اور ادبی تحفہ شائقین ادب کے ہاتھوں میں پہنچ جائیگا +

نیرنگ خیال کا یہ تیسرا عید نمبر ہے، اگر پہلے اور دوسرے سال کے عید نمبروں سے اس کا مقابلہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق محسوس ہوتا ہے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، کہ نیرنگ خیال کا جو قدم بھی اُٹھتا ہے وہ ترقی کی طرف ہی اُٹھتا ہے، اور ہر نمبر پہلے نمبر پر سبقت لے جاتا ہے +

اس عظیم الشان اور بلاشک و شبہ عدیم النظیر نمبر کی تیاری میں جو کچھ محنت مجھے کرنی پڑی ہوگی اُس کا اندازہ وہ اصحاب بخوبی کر سکتے ہیں جنہیں کبھی کوئی کتاب یا رسالہ چھپوانے کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہو، اس نمبر کی تیاری کے لئے ہمیں صرف پینتیس ۳۵ دن کی مُہلت ملی تھی، اس لئے اس کو وقت پر شایع کرنا ایک کارنامہ ہوگا، اور اگر میرے عزیز دوست جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے جو نیرنگ خیال کے ازلی ابدی معاون ہیں، اور جناب سیّد امتیاز علی صاحب تاج بی اے، جو خود ایک شاندار پبلشنگ ہاؤس کے مالک اور مہتمم ہیں قدم قدم پر اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید نہ فرماتے تو اس شان کا رسالہ مرتب نہ ہوسکتا +

میں اُن ادیبوں کا بھی تہ دل سے ممنون ہوں جنہوں نے نیرنگ خیال کے خاص نمبر کے لئے میری درخواست پر یا بعض احباب کی سفارش پر اپنے رشحاتِ قلم مرحمت فرمائے، اگر ہندوستان کے وہ معدودے چند اہلِ قلم جو اُردو زبان میں اظہارِ خیال پر قادر ہیں، اپنے ملک کے رسائل کی قلمی اعانت پر کمربستہ نہ ہوں تو اُردو زبان کیسے ترقی کر سکتی ہے، وقت آگیا ہے کہ اُردو کے قدردان اُس کی حقیقی ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں، اہلِ قلم حضرات بلند پایہ اور جدید خیالات سے اُردو کے ذخیرہ کو وسعت دیں (خواہ اس کے لئے وہ معاوضہ بھی قبول کریں تو مضایقہ نہیں) اور ہر اُردو پڑھے لکھے آدمی کا فرض ہونا چاہئے کہ اپنی ضروریات زندگی میں **اُردو اخبارات اور اُردو رسائل** کی "خریداری" بھی شامل کرلے خصوصاً وہ اصحاب جو مغربی علوم اور مغربی زبانوں کے مطالعہ کے شایق ہیں اپنی ہندوستانی زبان کے اخبارات و رسائل کو سب سے اوّل اپنے مطالعہ کی میز پر جگہ دیں +

میں اُن اصحاب کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے کسی سبب سے عید نمبر کے لئے نہیں لکھا، یا رزندہ صحبت باقی، نیرنگ خیال کے خاص نمبر شایع ہوتے ہی رہتے ہیں، پھر سہی، نیرنگ خیال کے سالنامہ (ANNUAL.) کے لئے ہی سہی، جس کی تیاری ابھی سے شروع کردی گئی ہے +

میں پنجاب کے نامور مصوّر جناب عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کا خاص طور پر ممنون ہوں جن کی بلند نظر نیرنگ خیال کو عالیشان

مذاق سے پاک رکھتی ہے، کہا جاتا ہے کہ نیرنگ خیال "عام پسند" تصاویر شایع نہیں کرتا، اور ہمیشہ ایسی "بلند تر" آرٹ کی تصاویر شایع کرتا ہے، جنہیں ادب العالیہ کی طرح سمجھنے کے لئے طبع موزوں اور فکر بلند کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن باوجود بلند تر آرٹ کے نمونے شایع کرنے کے نیرنگ خیال اُن رسائل سے تین گنا اور چہار گنا زیادہ اشاعت رکھتا ہے جو "عام پسند" اور "سوقیانہ" تصاویر شایع کرتے ہیں! اس سے ثابت ہے کہ نیرنگ خیال عوام و خواص دونوں کے مذاق کی تربیت میں کامیاب رہا ہے، اور اب پبلک حقیقی اور مصنوعی آرٹ میں تمیز کرنے لگی ہے، اور جو لوگ نقاد فن تو کیا مصوّری سے دُور کا لگاؤ بھی نہیں رکھتے اگر وہ اپنی شپرہ چشمی کی وجہ سے صحیح آرٹ کو نہ سمجھ سکیں تو ع چشمہ آفتاب را چہ گناہ + اُنہیں یہ تو سوچنا چاہئے کہ جس آرٹ پر فنون لطیفہ کی نمائشوں پر درجۂ اوّل کے انعامات ملتے ہیں، اور جن تصاویر کو ماہرین فن ہزارہا روپے میں خریدتے ہیں، اگر وہ اُن تصاویر کو اپنی کوتاہ فہمی کی بدولت سمجھنے سے قاصر ہیں، تو وہ اپنی بے بضاعتی پر نادم ہو کر خاموش ہو رہیں ہر کسے را بہر کارے ساختند +

نیرنگ خیال کا مطمح نظر آرٹ کے متعلق صاف اور واضح ہے، ہم آرٹ کے سبھی قسم کے نمونے شایع کرتے ہیں، تاکہ اُردو داں پبلک ہر قسم کے نمونوں کے مطالعہ سے ذہنی تربیت حاصل کرتی رہے، اور آہستہ آہستہ اُن کی نظر اس فن کی باریکیوں اور خوبیوں سے آشنا ہو جائے، چنانچہ اس عید نمبر میں بھی، انڈین آرٹ کے علاوہ جرمنی، انگلستان، فرانس، روس، اور دیگر ممالک کے مشہور مصوّروں کے شاہکار درج ہیں، آرٹ کے علاوہ بعض فوٹو کی تصاویر بھی ہیں جن پر آرٹ کا شبہ ہوتا ہے، مشاہیر اور مقدس عمارات کے فوٹو بھی ہیں، فوٹو کارٹون اور لیتھو کے کارٹون، الغرض اس ادبی خوان پر سبھی قسم کے نمونے چُن دیئے گئے ہیں +

عید نمبر کے لیتھو کی تمام نقاشی اور کارٹون سازی مسٹر عنایت اور مسٹر علاؤ الدین صاحب آرٹسٹ کے قلم سے ہوئی ہے، جس سے عید نمبر کی دلکشیوں اور دلچسپیوں میں دہ چند اضافہ ہوا ہے +

نیرنگ خیال کی کتابت منشی اشفاق احمد صاحب بریلوی نے کی ہے، جنہیں یہ کمال حاصل ہے کہ کسی رسالے کے دو صفحے کا مضمون نیرنگ خیال کے ایک صفحہ میں ایسا خوشخط لکھ دیتے ہیں کہ آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے، یہ آپ کی باریک خوشخطی کا نتیجہ ہے کہ نیرنگ خیال میں اس کثرت کے ساتھ مضامین درج ہو سکتے ہیں +

رسالہ کی طباعت لاہور کے بہترین پریس یعنی کریمی پریس میں مکمل ہوئی ہے، جنہوں نے باوجود کثرت کار کے رسالہ نیرنگ خیال کو کبھی "لیٹ" نہیں ہونے دیا، اگرچہ اس میں ہمارے دفتر کے معتمد حافظ عبدالرزاق صاحب کی کوششوں کا بھی بہت دخل ہے +

نیرنگ خیال کے بلاکس مشہور بلاک سازی فوٹو آرٹ کمپنی بیرون موچی دروازہ لاہور نے تیار کئے ہیں، جن کے کام کی تعریف خود آپ کا کام ہی ہے، بلاکس کی اکثر تصاویر بھی وہیں چھاپی گئی ہیں +

نیرنگ خیال کا ٹائیٹل جناب چغتائی کے برادر اصغر جناب عبدالرحیم صاحب اصغر کا تیار کردہ ہے، "ٹائیٹل شب عید کے جذبات کا مظہر ہے، اسے عورت کی تصویر نہ سمجھئے +

الغرض یہ عدیم النظیر عید نمبر مختلف کامل الفن اصحاب کی مشترکہ کوشش اور مساعی کا کامیاب نتیجہ ہے، کیا یہ عید نمبر اکیلا ہی

تین روپیہ قیمت میں ارزاں نہیں ؟ ابھی ہم نے تین روپیہ میں اس نمبر کے علاوہ دس اور رسائل مہیا کرنے ہیں، جن میں سے ہر ایک ادبی دلچسپیوں اور مصوری کی دلفریبیوں کا مرقع ہوگا +

کارکنانِ نیرنگِ خیال اور خاکسار کی طرف سے جملہ خریدارانِ رسالہ اور احباب و معاونین کی خدمت میں "عید مبارک !!"

اُن تمام معاصرین کی خدمت میں بھی عید مبارک کا تحفہ پیش کرتا ہوں جو میری کوششوں کو استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور بعض اُن معاصرین کی خدمت میں بھی جو بلا ضرورت بازاری منتظات سے میری تواضع کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں، میں اُن کی خدمت میں یہ عید کا تحفہ بھیجتے ہوئے بہ ادب ملتجی ہوں، کہ اُردو کی خدمت میں پبلک ہمارے **کام** کو بغور دیکھتی اور صرف **کام** ہی کو پسند کرتی ہے + ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند جوانانِ سعادت مند پیرِ پند دانا را

ایڈیٹر

عیدنمبر کی تصاویر

اب کے ہم نے تصاویر کے متعلق یہ خاص التزام کیا ہے کہ خاص موضوعات کو خواہ اُن کی تقسیم فن کے اعتبار سے کی گئی ہو یا مضامین کے اعتبار سے الگ الگ کر دیا ہے، اور تصاویر کا قد عام اُردو رسائل کی شایع کردہ تصاویر سے بڑا کر دیا ہے ہم سائز گھٹا کر تعداد کو بڑھا سکتے تھے، لیکن اگر محض گنتی مدنظر ہوتی تو ہم تین تین رنگ کی چار پانچ تصاویر نہ شایع کرتے، بلکہ ایک ایک کی جگہ تین تین یک رنگ تصاویر شایع کرتے، اس طرح خرچ میں بھی کفایت ہوتی اور گنتی بھی بڑھ جاتی مگر ——

آپ خود ہی انصاف کیجئے کہ ایڈمنڈ ڈیولک جو محض اپنے رنگوں کے لئے مشہور ہیں، اس کی تصویر کو ایک رنگ میں چھاپنے کا کیا فائدہ تھا، اس تصویر پر حضرت تاثیر کا مطلع کسقدر بلیغ ہے ؎

محمل سجا ہوا جو بعزمِ سفر ہے آج اے جانِ قیس! تیرا ارادہ کدھر ہے آج

حقیقت یہ ہے کہ ڈیولک کا تمام فن رنگوں اور خطوں کی "**سجاوٹ**" ہی ہے، یہ تصویر مولانا محمد علی کی فوٹو گیلری میں آویزاں تھی اور ہم مولانائے محترم کے شکر گذار ہیں کہ اُنہوں نے ہمیں یہ تصویر بکمال نوازش مستعار دیدی +

ہم ایک اور سہ رنگ تصویر شایع کر رہے ہیں، جو بمبئی سکول آف آرٹ کا نمونہ ہے، یہ تصویر درندھر کی ہے اور بمبئی کے مشہور آرٹ نواز مسٹر فضل بھائی کریم بھائی کی ملکیت ہے اس پر غالب کا یہ شعر چسپاں ہوتا ہے ؎

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

حضرتِ چغتائی کی تصاویر

حضرت چغتائی بقول "اسٹیٹسمین کلکتہ" رنگوں کے بادشاہ ہیں ہم اس کنگ آف کلرز کی ایک مشہور تصویر شہرزاد تین رنگ میں شایع

کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں +

"شہرزاد" الف لیلہ کی ملکہ ہے جو تہذیب نسائیت کے جوہر سے ایک آہنی دل مرد کی فطری قہاریت پر غالب آگئی ہے، یہ تصویر اُس لمحہ کی منظر ہے جب شہرزاد اپنے مقصد نسائیت میں کامیاب ہوکر کامرانی کے نشہ میں مخمور ہے، مصوّر کا کمال ہے، اُس نے فاتحانہ جذبہ کی درشتیوں میں بھی نسوانی لچک پیدا کردی ہے، اور یہ کامیابی خطوں سے زیادہ رنگوں کی جذبات نگاری سے پیدا ہوئی ہے، ہر چند یہ بلاک بہت محنت سے تیار ہوا ہے، مگر جب اصل تصویر سے جو ہندوستان کے ایک نامور راجہ کے تصویر خانے سے خاص ہمارے لئے منگوائی گئی تھی موازنہ کرتے ہیں تو یہ نقل یوں معلوم ہوتی ہے کہ جیسے کوئی جنّت کشمیر کے حسن کا منظر کسی اسفل السافلین بازاری کو ——— سمجھے +

چغتائی کی دوسری تصویر ع "مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے" لارڈ ریڈنگ سابق وائسرائے ہند کی ملکیت میں ہے، یہودی کی نظر کی داد دیجئے کہ اُس نے اپنے خزانے کے لئے کیسا انمول موتی انتخاب کیا ہے +

تیسری تصویر "آغوشِ مادر" گویا ایک "پنجابی مریم ہے" یورپ والے مے ڈونا کی تصاویر خوب بناتے ہیں، مگر یہ تصویر اپنے اندر ایک اور ہی دلکشی رکھتی ہے، مصوّری کے مشہور نقاد مسٹر سٹینلے نے اسی تصویر سے متاثر ہوکر چغتائی کے متعلق انگریزی اخبارات میں طویل مضامین لکھے تھے، یہ تصویر مسٹر سٹینلے نے ہی خریدی تھی، روپہلے کاغذ پر شایع کردہ تصویر سیاہی میں انگارہ کشی کے فن کا مکمل نمونہ ہے، اس شعبۂ فن میں شاہکار کم نظر آتے ہیں، روسی مصوّر فیٹر جین کی ایک اسی قسم کی تصویر سُنہری زمین پر شایع کی گئی ہے +

چغتائی کے کام کی فضیلت اسی سے ظاہر ہے کہ ابھی ابھی مدراس کی نمائش تصاویر میں حضرت چغتائی کے فن کو مشرقی تو خیر مغربی مصوّری سے افضل ترقسلیم کیا گیا ہے، اور بہترین تصویر کا انعام اُنہیں ملا ہے، مدراس کے تمام اخبارات حضرت چغتائی کو اس کامیابی پر مبارکباد دے رہے ہیں، اور اسے مشرقی آرٹ کی مغربی آرٹ پر فتح تصور کرتے ہیں

ہمارا آرٹ کا ضمیمہ چار تصاویر پر مشتمل ہے :-

"لہر" جاپان کے بہترین مصوّر ہوکیسائی کے موقلم کی نگارش ہے، لہروں اور کشتیوں کے خطوں کو اس طرح ہم آہنگ کیا گیا ہے کہ کشتیاں سمندر کی موج میں جھولا جھولتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں +

"قاصدِ بہار" راجپوت مصوّری کا ایک دلکش نمونہ ہے، راجپوت مغلوں کے شاگرد تھے، مگر ان کی تصاویر میں الگ الگ شانِ تفرّل پائی جاتی ہے، جو اس تصویر میں بدرجہ احسن موجود ہے +

"جنگ" میونخ گیلری کی تصویر ہے، اس سے زیادہ بھیانک منظر شاید ہی کسی مصوّر نے کھینچا ہو، مصوّر اپنے مقصد میں کامیاب ہے، دیکھنے والا تصویر پر نظر ڈالتے ہی جنگ سے متنفر ہوجاتا ہے +

"فراعنہ کا آئینہ خانہ" جدید آرٹ کا ایک دلپسند نمونہ ہے. عمودی خطوں کی کثرت سے ظاہر ہے کہ مصوّر نے قدیم مصری آرٹ کا تتبع کیا ہے +

ان کے علاوہ آرٹ کی تصاویر بھی شامل کی گئی ہیں جن میں "دامِ خیال" خاص طور پر مستحق توجہ ہے ، "چاندنی رات کی سیر" ایک تبسم خیز لطیفہ ہے، جو مناظر قدرت کے عشاق کے لئے کھینچا گیا ہے +

رسالہ کے آخری حصہ میں ایک اور سہ رنگی تصویر "رنگترے" بھی شایع کی جا رہی ہے، یہ وہ آرٹ ہے جس پر فوٹو ہر گھڑی فتح پا سکتی ہے +

"عیدگاہوں" کے فوٹو اور "ع" دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں" اور "ع" اور کبھی ریت کے تپتے ہوئے صحراؤں میں" خاص عید کا تحفہ ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی اسلام کا مستقبل ایسا ہی درخشاں ہے جیسا زمانہ ماضی میں تھا، دیکھو تو سہی مسلمانوں کے پاؤں دنیا میں کہاں کہاں جمے ہوئے ہیں!

چار رہبرانِ عالم کے فوٹو درج ہیں، دیکھئے غلام ملک کے لیڈر بھی غلام ہوتے ہیں، اور آزاد ملکوں کے لیڈر بھی آزاد اور جوانمرد +

لیتھو کے کارٹون تو خیر کبھی کبھی کوئی دوسرا رسالہ بھی شایع کر دیتا ہو، مگر ہم اب کے فوٹو بلاک کے کارٹون شایع کر رہے ہیں +

"نگاہِ حیرت" یعنی خزاں کی پیدائش" اور "کنیچوے کا شکاری" خاص طور پر اچھے ہیں، یہ ہے ہماری چیدہ چیدہ تصاویر کا اجمالی غرض سے

ہر کس کہ دید روئے تو بر سید چشمِ من کارے کہ کرد دیدہ فنِ لاجواب کرد

گران تصاویر کی تیاری کے لئے حسنِ انتخاب اور محنت کے صرف کے ساتھ روپیہ بھی پانی کی طرح بہایا گیا ہے، آجکل ادبی رسالوں کی ادارت کے لئے وسعتِ نظر کے ساتھ فراخ دستی بھی درکار ہے، ہمعصر نگار کی طرح نہیں کہ تصاویر چھاپنے کی ریس کرنی چاہی، مگر جب پہلی بار ہی محض طباعت کا بل پہنچا تو وی پی فری کرا لی اور پھر ادائیگی سے بھی گھبرا گئے اور لگے کھسیانے ہو کر کھمبا نوچنے، اور جس طرح اناطول فرانس کی ایک کہانی کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ لکھ کر کہ اناطول فرانس (جنہیں نوبل پرائز کا انعام مل چکا ہے) ہیں خوبی نہیں اپنے مذاق کی صحت کا ثبوت دیا تھا، اسیطرح اب ہندوستان کے مشہور مصور چغتائی کے متعلق واہی تباہی لکھ کر اپنی دون فطرتی کا ثبوت دیا، تصاویر مانگتے وقت تو گڑگڑاتے تھے اور اب دانت دکھانے شروع کر دیئے، خدا جانے اگر سہ رنگ کی تصویریں ہوتیں تو کیا کرتے ، اور عذر گناہ دیکھئے اپنی بدمذاقی کو خریداروں کے سر تھوپا ہے ، لطف یہ ہے کہ نگار کے اسی نمبر میں جناب اعجاز کا ایک مضمون تاج محل کے متعلق نکلا ہے، اور انہی اعجاز صاحب نے نگار کی اس جہالت کے متعلق نیرنگ خیال کو ایک مراسلہ روانہ فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نگار کے تمام خریدار ایسے بدمذاق نہیں جیسا نیاز صاحب ظاہر کرتے تھے، ہم اس مراسلہ کو کسی آیندہ اشاعت میں شایع کر رہے ہیں +

ایڈیٹر

لمعات

عید نمبر کی اشاعت

الحمد للہ کہ عید نمبر شایع ہوگیا، ایسا عدیم النظیر نمبر نکالنے کے لئے ہمیں صرف پینتیس ۳۵ دن کی مہلت ملی تھی +

فروری نمبر میں ہم نے لکھا تھا کہ عید نمبر کے لئے دو آنہ کے ٹکٹ بھیجدیجئے تاکہ رسالہ بذریعہ رجسٹری روانہ کیا جائے ہماری اس ضروری اور اہم درخواست پر قریباً چار سو خریداروں نے دو دو آنہ کے ٹکٹ بھیجدیئے تھے، اس لئے اُن کی خدمت میں عید نمبر بذریعہ رجسٹری بھیجدیا گیا ہے، بقایا میں سے ساڑھے تین سو خریداروں کا چندہ ختم ہوگیا تھا یعنی وہ گذشتہ عید نمبر سے خریدار ہوئے تھے، اس لئے اُن کی خدمت میں عید نمبر بذریعہ رجسٹرڈ وی پی پیکٹ ارسال ہے، بقایا تمام خریداروں کو پوسٹنگ رسید لیکر روانہ کیا گیا ہے، اس لئے اب اگر کسی خریدار کا عید نمبر کسی "دشمن علم و ادب" محکمۂ ڈاک کے کارندہ نے ہضم کر لیا ہو تو ہم دوبارہ بھیجنے کے ذمہ دار نہیں، بلکہ رسید روانگی پیش کریں گے، کیونکہ ہمارا فرض تو رسالہ پوسٹ کر دینا تھا، ایک روپیہ قیمت کا رسالہ دوبارہ کیسے مہیا کیا جا سکتا ہے +

نیرنگ خیال کے خاص نمبر

نیرنگ خیال نے تیسرے سال میں تین خاص نمبر شایع کئے ہیں، ادبی نمبر، لاہور نمبر، اور عید نمبر (اگرچہ بعض احباب نے ہمارے دسمبر نمبر کو بھی خاص نمبر ہی سمجھا تھا) پہلے دو نمبروں کی اشاعت میں باوجود اپنے اخراجات بڑھا لینے کے ہم نے ناظرین پر کسی قسم کا بار نہیں ڈالا اور کوئی تعطیل نہیں منائی تھی، عید نمبر کے بعد اب مئی کا نمبر حاضر خدمت ہوگا، جس کا اشتہار کسی دوسری جگہ درج ہے، اس وقفہ کو کم کرنے کے لئے ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ رسالہ بجائے ۲۰ مئی کو شایع ہونے کے یکم مئی کو شایع کیا جائے +

نیرنگ خیال کی تاریخ اشاعت میں تبدیلی، بجائے ۲۰ تاریخ کے ہر ماہ کی یکم تاریخ کو شایع ہوا کرے گا

نیرنگ خیال کی تاریخ اشاعت ۲۰ تاریخ تھی، اور بفضل خدا گذشتہ ۲½ سال میں ایک رسالہ بھی دیر سے شایع نہیں ہوا، اب اکثر احباب کے اصرار پر ہم نے اسے تبدیل کر کے یکم تاریخ مقرر کر دی ہے، امید ہے کہ جس طرح ہم ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کو ٹھیک پابندی اوقات سے رسالہ شایع کیا کرتے تھے، اسی طرح اب ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو بھی پابندی کے ساتھ رسالہ شایع کیا کرینگے + انشاء اللہ

اب مئی کا رسالہ بجائے ۲۰ مئی کے یکم مئی کو پوسٹ ہوگا، آپ نوٹ کر لیجئے، اور اپنا نمبر خریداری جو چٹ پر درج ہے اُسے بھی کسی پاکٹ بک میں محفوظ کر لیجئے تاکہ خط و کتابت میں تکلیف نہ ہوا کرے +

ہم نے اپنا فرض ادا کردیا ہے، اب آپ اپنا فرض ادا کیجئے

ہمارا فرض تھا محنت یعنی موزوں ترین طریقہ پر بے دریغ روپیہ خرچ کرنا، یہ اسی اولوالعزمی کا نتیجہ ہے کہ اُردو زبان میں ایسا شاندار مجموعہ شائع ہوگیا جو یقیناً اُردو رسائل کی تاریخ میں لاجواب ہے، دعاوی تو ہر ایک رسالہ کرتا ہے اور وہ بھی بہت بلند آہنگی کے ساتھ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسے رسایل اگر نیرنگ خیال کی تقلید کی کوشش میں ہی نہ لگے رہتے تو یقیناً اتنی ترقی بھی نہ کرسکتے، مگر نقالی آخر نقالی ہے، اور ترقی کے لئے جدت کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ نیرنگ خیال کی اشاعت ایسے رسائل سے دوگنا سہ گنا اور چہارگنا ہے، نیرنگ خیال کی اس کامیابی کا راز غیر مطبوعہ بلند پایہ مضامین کی اشاعت، حُسنِ انتظام، پابندیٔ اوقات، بے مثال ارزانی، فوٹو اور آرٹ کی ایسی تصاویر شایع کرنا ہے، جو اعلےٰ مذاق کی مظہر ہوں، اور انشاءاللہ نیرنگ خیال کی ان خصوصیات میں ماہ بماہ ترقی ہی ہوتی رہیگی +

بہرحال جو کچھ ہم سے ہوسکا وہ آپ کے ہاتھ میں ہے، نیرنگ خیال کو فخر ہے کہ آپ اس کے سرپرست ہیں، اور آپ کو ناز ہے کہ نیرنگ خیال آپ کا رسالہ ہے، پس عید نمبر کو اچھے سے کاغذ میں لپیٹ کر رکھئے، نہ اسے مروڑیئے نہ لپیٹئے بلکہ نہایت احتیاط سے محفوظ رکھئے، اور اپنے حلقۂ احباب میں تحفہ پیش کرکے انہیں اس کی خریداری پر مستعد بنایئے کیا ہمارے فرائض کی بجاآوری کے بعد بھی آپ خاموش رہیں گے؟ آپ کی معمولی سی توجہ سے دو چار نئے خریدار پیدا ہوسکتے ہیں، اگر ہر ایک معاون نے اپنا فرض محسوس کیا تو نیرنگ خیال کی مستقل اشاعت یقیناً پانچ ہزار ہوجائیگی +

عید نمبر دکھا کر برابر خریدار بناتے جایئے، پچھلے سال کا عید نمبر جو اس کے سامنے کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتا آج تک لوگ طلب کررہے ہیں، اس لئے وقت ہے کہ آپ اسے جلدی خرید لیجئے، ورنہ یہ نایاب تحفہ کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہوسکیگا +

نیرنگ خیال کا چندہ

نیرنگ خیال کا چندہ بہت قلیل ہے، صرف تین روپے، اگر آپ عید نمبر سے خریدار ہونا چاہیں تو تین روپے دو آنہ منی آرڈر بھیجدیجئے، تاکہ روپیہ وصول ہوتے ہی عید نمبر بذریعہ رجسٹری بھیجا جائے یا ہمیں کا وی پی روانہ کرنے کی اجازت دیجئے ششماہی کے لئے عید نمبر سے پرچہ جاری نہیں ہوسکتا +

نیرنگ خیال اور اشتہارات

تجویز کیا گیا تھا کہ نیرنگ خیال کے عید نمبر کا حجم ۱۶۰ صفحات ہو، اور اُس میں ۴۰ صفحہ کے اشتہارات لگاکر ۲۰۰ صفحہ کا حجم بنادیا جائے، لیکن مضامین کی کثرت ہمارے اس ارادہ کے راستہ میں سدِّ سکندری بن گئی، رسالہ میں صرف ایک کاپی بڑھادینے سے ایک سَو کا خرچ بڑھ جاتا تھا، مگر ہم نے ایک نہیں بلکہ قریباً چھ سات کاپیوں کا اضافہ کردیا، اب اس مجموعہ کا حجم قریباً ۲۵۸ صفحات تک جا پہنچا ہے، ۲۵۸ صفحات (جو دیگر رسائل کے ۵۰۰ صفحات کے برابر ہیں) میں تمام غیر مطبوعہ بلند پایہ، دلچسپ اور مفید مضامین شایع کرنے کا انتظام ہمیں صرف ۳۵ دن میں کرنا پڑا تھا، آخر وقت میں چھاپہ خانہ والوں، تصاویر چھاپنے والوں، کاتب، الغرض سبھی نے جواب دیدیا، کہ ہم اتنا بڑا مجموعہ ۱۵-۲۰ دن شایع نہیں

کر سکتے ، رسالہ کی اشاعت کے آخری ہفتہ میں ایک کی جگہ چار کاتب کام کرنے لگے ، نیرنگِ خیال کا عملہ محیّر العقول ہمت کے ساتھ شبانہ روز محنت کرتا رہا تاکہ وقت پر رسالہ شایع کر سکے چنانچہ نیرنگ خیال کا اتنا ضخیم عید نمبر عید سے قبل شایع ہوگیا +

نیرنگ خیال پورا چار ہزار شایع ہوا ہے ، اور ابھی تک مشتہرین نیرنگ خیال کو ۱۳ یا ۱۴ روپیہ صفحہ پر اشتہار دینے سے گریز کرتے ہیں ، اُن کے خیال میں نیرنگ خیال بھی دوسرے رسائل کی طرح ہزار بارہ سو ہی شایع ہوتا ہے ، اور اپنی اشاعت بڑھا کر بتلاتا ہے ، اگر ہم صحیح اشاعت ۴ ہزار بتلاتے ہیں ، تو وہ ہزار سوا ہزار سے زائد یقین نہیں کرتے ، اس طرح سے اگر ہم نیرنگ خیال کی اشاعت ۱۲ ہزار کہتے تو وہ اس پر یقین کر لیتے ، ہمعصر ریاست نے رسائل و اخبارات کے اس جھوٹ پر قلمزار کی تحت میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے ، لکھتے ہیں :-

" اخبارات کے شایع ہونے کی تعداد بھی کئی قسم کی ہوتی ہے ، ایک وہ تعداد جس میں فی الحقیقت اخبار شایع ہوتا ہو ، دوسری وہ تعداد جو مشتہرین کو بتائی جاتی ہے ، اس تعداد اشاعت کے متعلق پچھلے دنوں ایک دلچسپ واقعہ ہوا ، دو ماہ ہوئے ایک اخبار کے مدیر صاحب دفتر " ریاست " میں تشریف لائے ، تو باتوں باتوں میں ایڈیٹر " ریاست " نے دریافت کیا کہ آپکے اخبار کی آجکل اشاعت کتنی ہے ، آپ نے نہایت انکساری اور کسر نفسی کے ساتھ جواب دیا ، جناب آجکل تمام بازار سرد ہے مگر غنیمت ہے کہ سوا تین ہزار خریدار ہیں ، دو تین سو پرچہ زاید چھپتا ہے ، اس طرح سے گذارا ہو رہا ہے "+

اب پچھلے ہفتہ اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب نے دفتر " ریاست " میں آکر ایک تصویر چھاپنے کا معاملہ کیا جو آپ اپنے اخبار میں دینا چاہتے تھے تو معلوم ہوا کہ اخبار کی اشاعت اڑھائی سَو ہے اور اسی تعداد میں آپ کو تصاویر کی ضرورت ہوگی ، ممکن ہے کہ دوسرے اخبارات بھی اشاعت کے لحاظ کچھ فرق بتاتے ہوں ، مگر ان مدیر صاحب کو جھوٹ بولنے کے اعتبار سے اوّل درجہ کا تمغہ ملنا چاہئے "+

اگر مشتہرین کو نیرنگ خیال کی اعلان شدہ اشاعت کا یقین ہوتا تو وہ بخوشی ۱۵ روپیہ فی صفحہ اُجرت دیکر اپنا اشتہار شایع کرا لیتے ، اور ہمیں عید نمبر کے لئے اکستو صفحات کے اشتہارات ہی مل جاتے ، بہرحال آہستہ آہستہ مشتہرین پر یہ حقیقت منکشف ہوتی جائیگی کہ نیرنگ خیال جو اشاعت رسالہ پر لکھتا ہے وہ واقعی صحیح ہوتی ہے ، اور جو اُجرت ہم طلب کرتے ہیں وہ اشاعت کے لحاظ سے بہت کم ہے +

چند خریداروں کا پتہ درکار ہے

ہمارے پاس چند ایسے کوپن بھی موجود ہیں جن پر روپیہ بھیجنے والے کا نام پڑھا نہیں جاتا ، ایسے اصحاب کو رسالہ نہیں ملیگا ، اس لئے وہ توجہ فرمائیں اور پورا نام و پتہ خوشخط لکھ کر بھیجدیں +

ایڈیٹر

چاندنی رات کی سیر

اس کتاب کا اندازہ صرف اتنی سی بات سے کیجئے کہ اس پر تیس ہزار روپیہ صرف ہو رہا ہے +

اس کتاب کی قیمت فروخت بارہ اور پندرہ روپیہ کے درمیان ہوگی، اور حضرت چغتائی کا ارادہ ایک محدود سی ایڈیشن ہی شایع کرنے کا ہے، اس لئے آرڈر ابھی سے بھیجدینے چاہئیں +

اُردو رسائل کی اشاعت

معزز معاصر معارف نے اُردو رسائل کی محدود اشاعتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "اُردو کا کوئی رسالہ بھی بتائیے جس کی اشاعت دو ہزار سے آگے ہو، پھر ہندی رسالوں کی اشاعت کی کثرت دیکھئے، مالی سرمایہ کی طرف سے اطمینان ہو تو آگے نئے نئے ابواب زیب و آرایش کے لئے صرف والی کوششیں، مضمون نگاروں کے انعامات، اچھے اصحاب قلم کو معاوضہ دیکر مضامین کے حصول کی صورتیں پیدا ہوں" +

معزز معاصر کی مندرجہ بالا تحریر سے ہمیں حرف بحرف اتفاق ہے، سوائے اس امر کے کہ "کسی اُردو رسالہ کی اشاعت بھی دو ہزار سے آگے نہیں" بفضل خدا نیرنگ خیال کی مستقل اشاعت تین ہزار ہے، عید نمبر چار ہزار شایع ہو رہا ہے، جو انشاءاللہ نیرنگ خیال کی سال حال کی مستقل اشاعت کا نمبر ہوگا، مگر نیرنگ خیال کے کثیر اخراجات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے لئے یہ اشاعت بھی خرچ و آمد کے پلڑے کو مساوی رکھنے کے لئے پوری تسلی بخش نہیں، اُردو رسایل کی ناکامیابی کے کئی اسباب ہیں، اور اُن میں سے سب سے بڑا سبب وہی ہے جس سے معزز معاصر معارف نے متاثر ہو کر یہ شذرہ سپرد قلم کیا تھا، یعنی اُردو داں پبلک کی بے حسی، اُردو داں پبلک میں وہ انگریزی خواں بھی شامل ہیں جنہوں نے اوایل عمر میں اُردو زبان پڑھی تھی اور اب بی اے یا ایم اے پاس کرنے کے بعد اُردو رسایل اور اخبارات کا مطالعہ کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ جبتک آپ انگریزی میگزینوں کی طرح اُردو رسایل کی خریداری قبول نہ کریں گے اُردو رسایل کیسے ترقی کر سکینگے +

اُردو انسائیکلو پیڈیا

معزز معارف نے مرہٹی انسائیکلو پیڈیا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ایک دل آزار مضمون شایع ہونے پر جو صدائے احتجاج بلند کی تھی الحمد للہ کہ وہ کامیاب رہی، اور کارکنان انسائیکلو پیڈیا نے اُس کی جگہ دوسرا مضمون درج کر کے ایک بہت بڑی شکایت کا انسداد کر دیا ہے، اب ڈاکٹر کیتکر چیف آڈیٹر مرہٹی انسائیکلو پیڈیا نے مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط لکھا ہے جس میں مرہٹی سائیکلو پیڈیا کو اُردو زبان میں ترجمہ کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ "براے عنایت اپنے ناظرین کو یہ بھی بتا دیجئے، کہ اگر میں ڈیڑھ برس کے اندر اندر یہ نہ دیکھ لوں کہ اُردو انسائیکلو پیڈیا کی تیاری کا بندوبست ہو رہا ہے، تو میں خود اس کام کو شروع کر دونگا، اس سے میرا مقصد محض یہ ہے کہ کوئی زبان بلا انسائیکلو پیڈیا کے نہ رہ جائے" +

مولانا سید سلیمان صاحب نے اس خط کو شایع کر کے ایک درجن سے زاید اہل قلم حضرات کو اس عظیم الشان کام میں حصّہ لینے کی دعوت دی ہے، اور اسی سلسلہ میں لکھا ہے، "ایک سال سے زیادہ ہوا لاہور سے ایک صاحب نے "ادب عربی" پر ایک مضمون مجھ سے اس غرض کے لئے طلب کیا تھا کہ وہاں کوئی اُردو انسائیکلو پیڈیا ترتیب دی جارہی ہے جس میں عربی ادب کی ذمہ داری مجھے سپرد کی گئی ہے، میں نے معذرت کی، پھر اُس کے متعلق کوئی آواز سنائی نہ دی، اور نہ یہ معلوم ہوا کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی حقیقت بھی تھی"؟

ہمیں جہاں تک علم ہے لاہور میں اُردو انسائیکلو پیڈیا کا کام کئی برسوں سے جاری ہے، ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ بڑے بڑے مسودات سے الماریاں بھری پڑی ہیں، لیکن اس قدر عظیم الشان کام کے لئے اشتراکِ عمل کی ضرورت ہے، بہتر ہو کہ مولانا سید سلیمان ندوی اپنے کسی قابل قائم مقام کو لاہور بھیجیں جو اس تمام کام کا بغور مطالعہ کر کے اس کی تکمیل کے متعلق باہمی اشتراکِ عمل کی کوئی تجویز مرتب فرمائیں، اور اس طرح سے اس ضروری کام کی تکمیل کا انتظام کیا جائے +

اُردو کے بعض نئے رسالے

مجلّہ عثمانیہ، کلیۂ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کے طلبا نے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے، جس کا پہلا نمبر ہمارے پیشِ نظر ہے، مجلّۂ عثمانیہ کے اجرا سے اُردو کے سہ ماہی رسایل میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے، اُردو اورنگ آباد، سہیل علیگڑھ، اور مجلّۂ عثمانیہ حیدر آباد کیا بلحاظ علوِ مضامین اور کیا بلحاظ ضحامت یورپ کے وقیع علمی رسایل کے ہم پلّہ ہیں، مجلّۂ عثمانیہ اُردو یونیورسٹی حیدر آباد کے دو ہونہار طالب علموں سید غلام محی الدین قادری زور بی اے، اور سید معین الدین قریشی بی اے کی زیر ادارت شایع ہوا ہے، پہلے نمبر میں کل ۲۳ مضامین ہیں، جن میں **شاعری اور شاعر**، اُردو زبان اور افسانے، فارسی نثر کا آغاز، اور بوعلی بلعمی، تخیل اور داستان امیر حمزہ، کتاب کے کیڑے، ڈاک کے ٹکٹ، وغیرہ قابلِ تعریف ہیں، بقیہ مضامین بھی شایانِ شان ہیں، اُردو حصّہ ۱۸۲ صفحات پر ختم ہوا ہے، آخر میں انگریزی حصّہ ہے جس میں انگریزی علم ادب کے شاہکار درج ہیں، یہ حصّہ ۴۰ صفحوں پر مشتمل ہے، انگریزی ٹائپ بہت ہی خوشنما ہے، اُردو لیتھو کی طباعت اور کتابت بہت ہی قابلِ تعریف ہے، کاغذ بھی انگریزی رسایل کے ہم پلّہ ہے، پہلے نمبر کی قیمت دو روپے اور سالانہ چندہ چھ روپے، محمد عبد الجلیل بی اے منیجر عثمانیہ یونیورسٹی کالج میگزین حیدر آباد دکن سے طلب کیجئے +

مخزن

جنوری ۱۹۲۷ء کی اطلاع کے مطابق ناظرین نیرنگ خیال یہ سُنکر مسرور ہونگے کہ اُردو کا پُرانا علمی و ادبی رسالہ مخزن از سرِ نو جاری ہوگیا ہے، اور ہمارے عزیز دوست حضرت ابوالاثر حفیظ نے اس کی ادارت فرمائی ہے حضرت ابوالاثر کی زیر ادارات مخزن کے کامیاب ہونے کی ہمیں پوری پوری توقع ہے، مخزن کے اجرا سے ہندوستان کے وقیع علمی ادبی رسایل میں ایک قابل قدر رسالہ کا اضافہ ہوا ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہئے کہ جن مقاصد جلیلہ کی بجاآوری میں

ہم شبانہ روز مصروف ہیں اُن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مخزن نیرنگ خیال کا دستِ راست ثابت ہوگا، پہلے نمبر میں حضرت چغتائی کی ایک تصویر "سکوت" کے علاوہ جناب شیخ عبدالقادر صاحب کی تصویر بھی شامل رسالہ ہے، مضمون نگاروں میں جناب شیخ عبدالقادر صاحب، سید امتیاز علی صاحب تاج، علامہ عبداللہ یوسف علی، پنڈت ہریچند اختر، خواجہ حسن نظامی، مسٹر غلام عباس، جناب ایم اسلم صاحب، جناب تاثیر صاحب جیسے بلند پایہ ادیبوں کے اسمائے گرامی موجود ہیں، حجم ۴۸ صفحات، سالانہ چندہ صرف چار روپے، ہم ناظرین نیرنگ خیال سے سفارش کرتے ہیں کہ ۲ روپے میں پہلا پرچہ ضرور ہی طلب فرماکر ملاحظہ فرمائیں +

دلکش

نئے رسایل جاری کرنے سے یہ بہتر ہے کہ مردہ رسایل میں از سر نو زندگی کی روح پھونکی جائے، اور فرسودہ پیکروں کو دلکش بنایا جائے، دلکش کئی مہینوں سے بند تھا، جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے ال ال بی کی ادارت اور محمد سعادت علی خاں سعادت منہاس کی معاونت سے اس کا اجرا ہوا ہے، ہمارے سامنے مارچ ۳۳ء کا نمبر ہے، حجم ۴۸ صفحات، قیمت سالانہ تین روپے +

رضا خان شاہ ایران کی ایک تصویر بھی زینتِ رسالہ ہے، مضامین رسالہ بیمانہ کی طرح مختلف ابواب میں تقسیم کر دیئے گئے ہیں، ادبیات، خمریات، نقوشِ حیات، نسائیات، ذخیرہ وغیرہ، حضرت شاداں، اثر صہبائی، سعادت منہاس، ہادی مچھلی شہری، شوکت تھانوی، جناب حمید، درد کاکوری، اکبر، جناب رفیق، یوسف گجراتی، ریاض شروانی، جناب فائق سطوی، جناب راز چاندپوری، محترمہ میمونہ غزالہ، شوکت دلہن، سعیدہ وغیرہ کے مضامین نظم و نثر درج ہیں، جہاں تک ہمارا خیال ہے مارچ کا رسالہ جنوری اور فروری کے رسایل سے بہتر ہے، اور کتابت و طباعت میں بھی کافی ترقی ہے، اگر ترقی کا یہ سلسلہ جاری رہا تو دلکش صحیح معنوں میں ادبی دنیا کے لئے دلکش ثابت ہوگا، جناب عابد سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں و مصروفیتوں کے باوجود دلکش پر زیادہ توجہ دے کر اُس کی نشاۃ ثانیہ کو ہر نوع کامیاب بنانے میں کوشش کریں +

مستقبل

اپنی طرز کے مخصوص جرعہ کشِ خمخانۂ ادب جناب ساغر نے اپنے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک نیا جریدہ پُرکیف موسومہ مستقبل علی گڑھ سے اجرا فرمایا ہے، جس کا مجلۂ اولیٰ زیر تبصرہ ہے، مضامین علمیہ و ادبیہ مختلف مباحث پر مشتمل ہیں، رسالہ خمریاتِ ادب سے مملو و مشحون ہے عکاس خانہ سے ماخوذ ایک ڈرامہ عمر خیام زینت دہ قراطیس رسالہ ہے، رضا خاں کی ایک پُر جلال تمثال بھی شایع کی گئی ہے، اُمید واثق ہے کہ یہ صحیفۂ نفیسہ منجذبِ قلوب ثابت ہوگا، ہم اپنے ادیبِ لبیب دوست سے بعد تمنا عرض پرداز ہیں کہ وہ اپنی تمام تر توجہ عالیہ محض مستقبل پر منعطف رکھیں، توقع ہے کہ آپ ہماری اس التجا کو شرف پذیرائی سے ضرور مفتخر و مشرف فرمائینگے، مستقبل کا مستقبل شاندار معلوم ہوتا ہے، سالانہ چندہ چار روپے، دفتر رسالہ مستقبل علی گڑھ سے نمونہ طلب کیجئے +

دار المصنفین اعظم گڑھ

موقر ہمعصر معارف نے دار المصنفین اعظم گڑھ کی امداد پر اہلِ قلم حضرات کو توجہ دلاتے ہوئے ایک نہایت معقول تجویز پیش کی تھی، جس پر ہندوستان بھر سے صرف ۶۵ حضرات نے صدائے لبیک کہی ہے، اور ان ۶۵ حضرات میں صوبہ پنجاب سے درخواست کرنے والوں کی تعداد صرف ۹ ہے، مولانا سید سلیمان صاحب پنجاب کی اس بے حسی پر لکھتے ہیں:-

"مگر ابھی ملک پنجاب کی طرف سے کوئی نویدِ بشارت نہیں آئی، حالانکہ اُردو مطبوعات کی سب سے بڑی قدر شناس آبادی اسی ملک میں بستی ہے، اور وہی اُردو کی آج سب سے بڑی منڈی ہے، پنجاب کے زندہ دلو کچھ ہماری زندہ دلی کا بھی سامان کرو۔"

ہم زندہ دلانِ پنجاب کو اس حقیقت سے باخبر کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ دار المصنفین اعظم گڑھ مولانا شبلی نعمانی کی یادگار میں قایم کی گئی تھی، اور کارکنانِ دار المصنفین نے اپنے فرض کو بوجہ احسن پورا کیا ہے، اور نہایت قلیل مدت میں پچاس سے زاید اعلیٰ پایہ کی علمی اور مذہبی کتابیں شایع کی ہیں، جس کی نظیر ہندوستان بھر میں اور کسی جگہ ملنی محال ہے، دار المصنفین کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ آپ بیس روپے سالانہ ادا کر کے اس کی رُکنیت قبول فرمائیں، جس کے معاوضہ میں دار المصنفین کے علمی اور مذہبی ماہوار رسالہ معارف (جس کا سالانہ چندہ پانچ روپے ہے) کے علاوہ سال بھر میں جسقدر مطبوعات شایع ہونگی وہ مفت آپکی نذر کی جائیں گی، ہمارے خیال میں ۲۰ روپے سالانہ میں یہ سودا گراں نہیں، اس سے ایک تو یک مُشت ایک گرانقدر رقم جمع ہو جائے گی جس سے نئی نئی کتابیں شایع کی جا سکیں گی، دویم دار المصنفین کے مستقل ارکان کی ایک ایسی معقول تعداد جمع ہو جائیگی جو ایسی بلند پایہ تصنیفات کو شایع ہوتے ہی حاصل کرنیکا فخر حاصل کریگی، ہم ناظرین نیرنگ خیال کی خدمت میں استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس نہایت ضروری اور مفید تحریک میں عملی حصہ لیکر ہندوستان کی اس واحد علمی ادبی انجمن کی امداد کا فرض بجالائیں۔

روسی مسلمان

روسی مسلمانوں کے متعلق حال ہی میں چند اعداد شمار شایع ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی مسلمان ہر حالت میں ترقی کر رہے ہیں، روسی مسلمانوں کی تعداد قریباً پونے دو کروڑ ہے، جو روسی آبادی کا بارہواں حصہ ہیں، سب سے زیادہ تعداد تاتاریوں، کرغانیوں اور

مکافاتِ عمل!

علامہ سر اقبال کی نظم "مکافاتِ عمل" خاص عطیہ ہے جو ان کی تازہ ترین تصنیف ..... "زبور عجم" میں بھی شائع نہیں ہوئی +

سالنامۂ نیرنگ خیال

دسمبر ۲۷ء میں شائع ہوگا

اپنا آرڈر رجسٹرڈ کرا لیجئے

صفحہ ۲۰۲ پر مفصل اشتہار ملاحظہ فرمائیے

منیجر

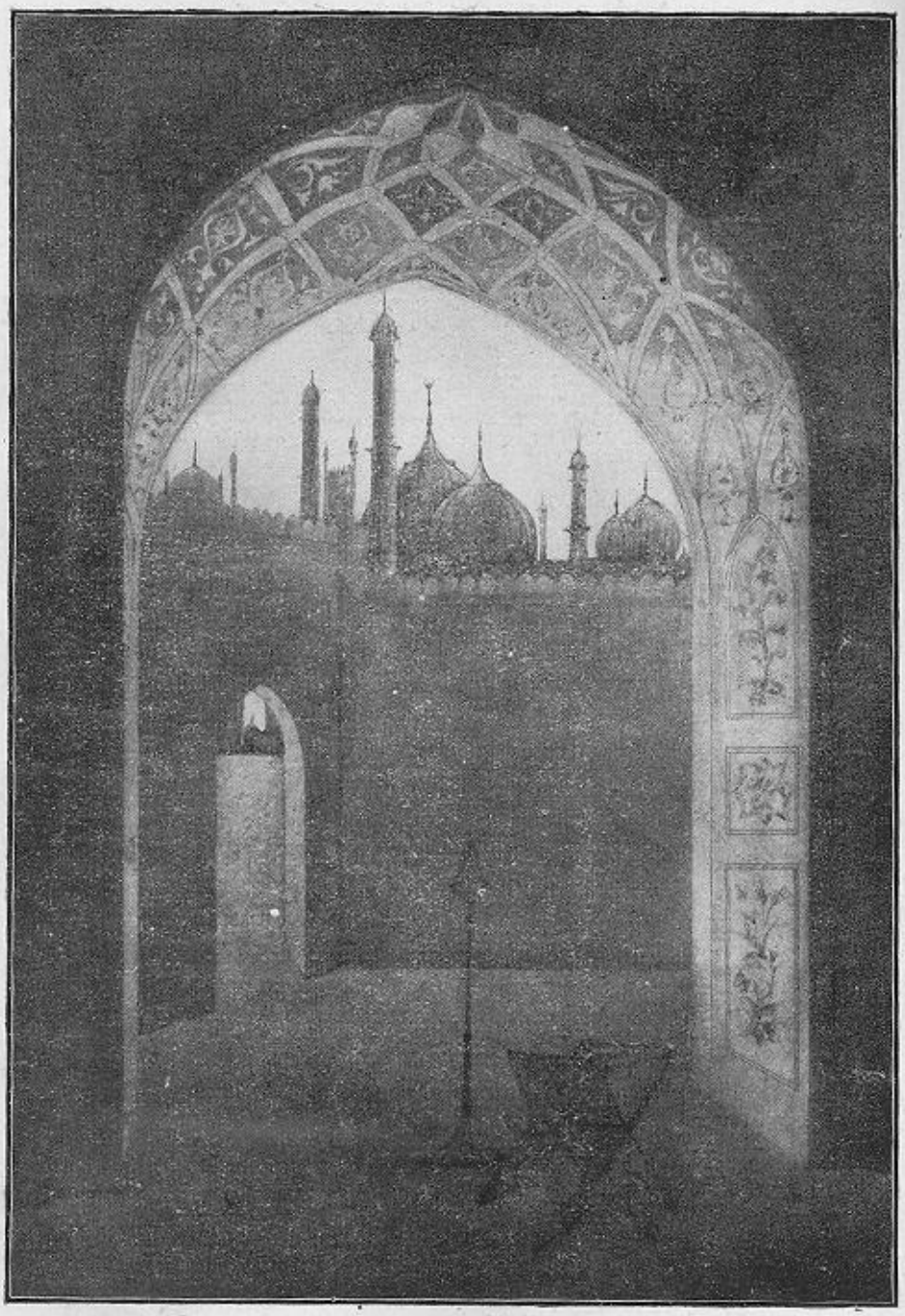

مسجدیں ہیں نوحہ خواں کہ نمازی نہ رہے — (اقبال)

شبے برغم فلک رُوئے خویشتن بنما
کہ زہرہ را بدرم ماہ را دو پارہ کنم

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(غالب)

نقش مادر

کلیاتِ اقبال کا ایک ورق

ہلالِ عید

اے مہِ عید بے حجاب ہے تو
حُسنِ خورشید کا جواب ہے تو
اے گریبان جامۂ شبِ عید
شاہدِ عیش کا جواب ہے تو
اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور
نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو
اے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز
طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس
قابلِ ذٰلک الکتاب ہے تو
چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا
کہہ دیا خواب سے کہ خواب ہے تو
طوفِ منزل گہِ زمیں کے لئے
ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو
یہ اُبھرتے ہی آنکھ سے چھپنا
روشنی کا مگر حباب ہے تو
تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شورِ طفلی ہے

اقبال

مضامین عید

چاند کے ۲ دو ٹکڑے

رُو کر عید، ہنس کر عید

از جناب مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی

(خاص برائے نیرنگ خیال)

میرا نام گل رُخ بیگم، اکبر شاہ ثانی کی پڑوتی، وہ دلّی کے بادشاہ تھے، میں نے اُن کو نہیں دیکھا، دادا حضرت بہادرشاہ کو دیکھا، مگر اَبّا حضرت سے وہ ناراض تھے، ہم کو میرزا سلیم کی بیوی کا طرفدار سمجھا جاتا تھا، جنھوں نے حضرت بہادر شاہ پر انگریز کے ہاں نالش کردی تھی +

ہم قلعہ کے باہر خانم کے بازار میں رہتے تھے، ابا جان کی تنخواہ تھی، حضرت بادشاہ سلامت کے ساتھ ہی وہ تنخواہ انگریز دیا کرتے تھے +

غدر سے ایک سال پہلے رجب کی ۲۷ شب معراج کو میرا عقد میرزا تیمور عرف میرزا نشیلے سے ہوا، وہ بھی حضرت بادشاہ سلامت کے معتوب تھے، اسی لئے قلعہ سے باہر رہتے تھے +

شب برات گزری رمضان آیا، وہ بھی گیا، تو عید کے دن آئے، شادی کے بعد پہلا چاند آیا تھا، میں بھی اَمّاں اَبا کی اکلوتی، وہ بھی ماں باپ کے اکلوتے خوب چاؤ چو چلے تھے +

چاند رات کو میں سسرال میں گئی، عید کا نیا جوڑا کشتی میں سجا سجایا تیار رکھا تھا، بادام چھوکری عید کی خوشی میں تھرکتی پھرتی تھی، میری ساس نے اُس کے بال کٹوا دئے تھے، اُن کو اس کی شوخیوں اور میرزا نشیلے کی مہربانیوں سے کچھ شبہ ہوگیا تھا، میں نے میکہ میں یہ خبر سُنی تھی، آج اس کو دیکھا تو مُنڈی مُنڈی بنی پھرتی تھی، میں نے اس کو پاس بُلایا، اور بالوں کا حال پوچھا، مُسکرا کر مُنہ پھیر لیا، میں سمجھ گئی، ضرور کچھ دال میں کالا ہے +

شام ہوئی، بادام چھوکری نے افطاری سامنے لاکر لگائی، میرزا نشیلے بھی آگئے، اُن کی اَماں دوسرے دالان میں تھیں، بادام بھی وہیں چلی گئی +

توپ چلی، نقارے بجے، روزہ والو روزہ کھولو کا غُل ہوا، میرزا نے اپنے ہاتھ سے کھجور مجھے کھلائی، میں شرمائی، مگر کھائی، نماز پڑھی، میرزا بولے چلو چھت پر چلو چاند دیکھو، ابا حضرت جامع مسجد میں ہیں، اَمّاں حضرت کو کچھ دکھائی نہیں دیتا، تیسری چوتھی کا چاند دیکھتی ہیں +

میں بالاخانہ پر گئی، ۲۹ کا باریک چاند فوراً نظر آگیا، میرزا نے کہا گل رُخ دیکھو وہ ہے چاند، میں نے جواب نہ دیا، دعا

پڑھنے لگی، میرزا میرے سامنے آ گئے، اور بولے، انبساط عید دیدن روئے تو، میں نے ہنسکر مُنہ پھیر لیا، اور کہا بادام آتی ہوگی، یہ فارسی تو وہ سمجھیگی، میرزا نے قہقہہ لگایا، اور کہا گل رُخ تم کو بھی یہ وہم ہوا، اماں نے بچاری کے ناحق بال کاٹ ڈالے میرزا نشیلے میرے شوہر تھے، میرے تو وہی چاند تھے خدا رسول نے اُن کو مجھے دیا تھا، عید کا چاند آسمان پر تھا، اس کو لاکھوں نے دیکھا ہوگا، اور لاکھوں دیکھنے والے مر گئے اور لاکھوں پیدا ہو ہو کر دیکھیں گے اور مر جائینگے، مگر جس کو دینے چاند کہا وہ فقط میرا تھا، اور میں اُس کے لئے فقط اکیلی میں ہی تھی +

عید کی چاند رات سب جگہ ایک سی نہیں ہوتی، مینے میکہ میں بھی عید کے چاند دیکھے تھے، آج سے زیادہ خوشی ہوتی تھی، مگر آج جیسی خوشی کبھی نہیں ہوئی، نہوگی، نہ ہوسکتی ہے عمر تھی، دن تھے، وقت تھا، سب ہی کچھ تھا، میں کیا کہوں اس چاند کو دیکھ کر اور میرزا کے سامنے آجانے سے بچکر مجھ پر کیا اثر ہوا تھا، عید کا چاند سب کے لئے ایسا ہوا کرتا تو عید کا چاند نہ کہلاتا

رات گذری، عید کا دن گذرا، شام ہوئی، تو میں نے پھر میرزا سے کہا چلو آج پھر چاند دیکھیں، بولے چلو، دیکھا، چاند ذرا بڑا ہو گیا تھا، مگر کم سنی کی بات نہ تھی، نہ وہ اثر تھا، نہ وہ میں تھی، نہ وہ میرزا تھے +

دوسرے رمضان کی راہ دیکھا کرتی تھی، وہ آئے، تو عید کو بھی لائے، پھر شام ہو، پھر بادام افطاری سجائے، پھر کوٹھے پر جائیں، چاند دیکھیں اور وہی مزہ آئے جو ایکبار آیا تھا اور دوسری بار کی ہوس تھی +

رمضان آیا، مگر غدر ساتھ لایا، اسی کو ۱۸۵۷ء کہتے ہیں، اباحضرت میرے بھی اور میرزا نشیلے کے بھی غدر سے پہلے، ایک میراں جی کے مہینے میں، دوسرے مدار کے مہینے میں مر چکے تھے، میری اماں زندہ تھیں، میرزا کی اماں عین غدر کی شروعات میں فالج سے مریں، میری اماں غدر ہوتے ہی میرزا نشیلے کے مکان میں جو میرا تھا کہ میں میرزا کی بھی مالک تھی، آگئی تھیں، اور وہیں آکر مریں +

میرزا نشیلے کا انگریزوں سے تعلق تھا، انگریزوں کا قتل عام ہوا تو پوربیوں نے میرزا کو بھی پکڑ لیا، کہ یہ انگریزی جاسوس ہے، مگر ہزار دقت رہائی ہوئی، میں نے اپنا سب زیور دیا جب جان بچی +

کشمیری دروازہ لوٹا، انگریز گھسے، بادشاہ حضرت ہمایوں کے مقبرہ میں گئے، دلّی کی خلقت بھاگی، میرزا مجھکو بھی رتھ میں سوار کر کے قطب صاحب لے چلے جہاں مینے جھرنہ کے پاس ایک باغ لگایا تھا، اور بارہ دری بنوائی تھی +

راستہ میں گوروں کی فوج ملی، رتھ کو گھیر لیا، میرزا نشیلے رتھ میں میرے پاس پردہ کے اندر تھے، میں حاملہ تھی، آٹھواں مہینہ تھا، ہمارے پاس زیور نہ تھا، بچاس اشرفیاں اور سونے کے چار کڑے اور موتیوں کا ایک ہار تھا، جو بہت قیمتی تھا +

گوروں نے پردہ ہٹا کر دیکھا، میرزا کا ہاتھ پکڑ کر باہر کھینچا میں اُن کو چھٹ گئی، رتھ بان بھاگ گیا، میرزا رتھ کے باہر کرے میں بھی اُن کے ساتھ گری، میرزا نے گرتے ہی کھڑے ہو کر گورے کے چہرہ پر مُکا مارا، گورے نے سنگین اُن کے پیٹ میں ماری جس کی نوک کمر کے پار نکل گئی وہ آہ کہکر گر پڑے مجھے غش آگیا +

آنکھ کھلی تو شام تھی، میرزا کی لاش سامنے پڑی تھی، اور ایک مردہ بچہ میرے سامنے پڑا تھا، جو رتھ سے گرنے کے صدمہ سے مر گیا یا پیدا ہونے کے بعد مرا، کب پیدا ہوا مجھے خبر نہیں، میں کئی گھنٹہ بیہوش رہی +

شام تھی، جنگل تھا، ہار، اشرفیاں، کڑے کچھ بھی نہ بچا

وارث خاک پر پڑا تھا، خون میں لتھڑا ہوا، پھر غش آگیا +

آدھی رات کو ہوش آیا، گیدڑ خون چاٹ رہے تھے، لاش کے پاس کھڑے تھے، میں ڈر گئی، پھر خوف نے بیہوش کردیا، پھر آنکھ کھلی، اب بھی رات تھی، اے ہے، بڑی اندھیری بڑی ڈراؤنی، میں نے تو کبھی خواب میں بھی یہ رات، یہ بےکسی، یہ بےوارثی، اور یہ غم نہ دیکھا تھا، برابر میرے سرتاج پڑے تھے، سامنے میرا لال پڑا تھا، دونوں چپ تھے، دونوں مجھ سے بےخبر تھے، دونو مجھ سے بے پروا تھے، اور میں دونوں کی رکھوالی تھی +

یا اللہ دشمن کو بھی یہ وقت نہ دکھائیو، دور سے کسی کے غرانے کی آواز آئی، گیدڑ تھے یا کچھ اور تھا، کلیجہ لرزنے لگا پھر غش آگیا +

صبح ہوئی تو میں ایک جاٹ کے گھر میں تھی، ہندو تھا، مگر بڑا رحمدل، خود بھی بڈھا تھا مگر اُس کی ماں بھی زندہ تھی، نسو برس کی بڑھیا بڑی خاطر کرتی تھی، اور خوب مضبوط ہاتھ پاؤں تھے، بولی میرا بیٹا جنگل سے تجھے لایا، میں نے کہا وہاں لاشیں تھیں، کیا اُن کو جناور کھا گئے، ہائے اُن کو مٹی بھی نصیب نہ ہوئی؟

امن چین ہوا تو میں نے بڈھے جاٹ سے دہلی جانے کو کہا، کہ شاید کوئی رشتہ دار جیتا جاگتا میسر آجائے، اس بچارے نے اپنی ماں کی چادر اُڑھائی، دہلی میں لایا، اُس کا گاؤں دہلی سے دو کوس تھا، میں بڑی مشکل سے پیدل چلی، خانم کا بازار ویران پڑا تھا، مکان ٹوٹ رہے تھے، توڑے جارہے تھے، کسی جان پہچان کا پتہ نشان نہ ملا، ایک چوبدار دکھائی دیا جس نے انگریز کے ہاں نوکری کرلی تھی +

میں نے اُس کو قدرت کہہ کر آواز دی، میرزا کے پاس ہمیشہ آیا کرتا تھا، اور قلعہ کی خبریں دیا کرتا تھا، قدرت نے نہ پہچانا، میں نے اپنے پتے دئے، رُونے لگا، اپنے گھر لے گیا اور کہا تم میری بہن میں تمہارا بھائی، یہاں رہو، جاٹ رخصت ہوا جس کو باپ کہتی تھی، اور قدرت کے ہاں رہنے لگی +

ایک رمضان اور اُس کی وہ عید جس کی راہ دیکھ رہی تھی غدر میں گذر گئی، خبر نہیں کب آئی کب گئی، ایک رمضان پھر آیا، اور ختم ہوا، پھر ۳۰ رمضان کو چاند کی تلاش ہوئی، قدرت کے ہاں بالاخانہ کہاں کھپریل کا مکان تھا، صحن میں کھڑے ہوکر چاند دیکھا +

غمگین صورت بنائے دکھائی دیا، میرزا اس کو گود میں لئے معلوم ہوتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے آٹھ مہینے کے معصوم بچے کی لاش کو لئے کھڑے ہیں، شاید میرے دل میں زخم تھے، ان میں جبک سی ہوئی، میں رُونے لگی، میں بےگھر ہوئی تو نہ روئی، بےدر ہوئی تو نہ روئی، رتھ سے گری تو نہ روئی، غش پر غش آئے تو نہ روئی، جاٹ کے ہاں میلے کچیلے اور بڑے بدبودار گھر میں رہی تو نہ روئی، مگر آج اس عید کے چاند نے رُلادیا، خبر نہیں کیا کیا یاد دلا دیا، وہی چاند ہے، ویسا ہی چاند ہے، وہیں ہے، جہاں میرزا کے گھر میں دیکھا تھا، چمک بھی ہے، دمک بھی ہے، رمضان ہی کے بعد آیا ہے، عید ہی کی خبر لایا ہے، مجھے رونا کیوں آتا ہے، کیا اب میرزا بچہ کی لاش کو اور میرے بچہ کی میت کو میری گود میں دینگے، میں انکو بادام کا طعنہ دوں گی +

چاند تو چمکے جاتا ہے، چاند تو دمکے جاتا ہے، اس چاند کی تو باہر خوب ہی دھوم ہو رہی ہے، مجھے کیا ہوگیا، اسکی خوشی میرے پاس کیوں نہیں آتی، میں نے بھی روزے رکھے ہیں، مینے تو یہ بات بھلادی کہ میں شہنشاہ ہند کی اولاد ہوں، اب تو میں ایک خدمتگار کی لے پالک ہوں، ایک غریب مگر مطمئن مسلمان عورت ہوں، پھر عید کی خوشی اس چاند نے مجھے کیوں نہ دی +

چاند کی خطا نہیں میرے دل کی خطا ہے، میری حالت کی خطا ہوگی، خطا کسی کی بھی نہیں، دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے، اور یہی ہوتا رہیگا، ایک چاند ہنسکر دیکھا ایک چاند روکر دیکھا، وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھا، زندگی اسی کا نام ہے + حسن نظامی

ہلالِ عید سے خطاب

از جناب میر ولی اللہ صاحب بی اے
ایل ایل بی پلیڈر ایبٹ آباد

فلک کی آنکھ میں نورِ بصر بھی ہے کہ نہیں
زمیں کے دورِ پہ اس کی نظر بھی ہے کہ نہیں
ہلالِ عید! تجھے کچھ خبر بھی ہے کہ نہیں
کہ ہم تو عید کی خوشیوں سے ہو چکے محروم

ازل سے تیرا وہی راستہ وہی منزل
سفر وہی ہے وہی کارواں وہی محمل
وہی سفینہ ہے دریا وہی وہی ساحل
ولے ہمارا قرار ایک رنگ پر معلوم!

ہمارے ہاتھ میں تھا جامِ اختیار کبھی
ہمارے قبضہ میں تھا دورِ روزگار کبھی
ترے پیام کا رہتا تھا انتظار کبھی
مگر یہ باتیں ہی صدیوں سے ہو چکیں موہوم

بتا کہ ہوتی ہے زندانیوں کی عید بھی عید؟
قفس میں مرغِ قفس کو بہار کی اُمید؟
غلامِ بے سر و ساز اور ہلالِ عید کی دید؟
منا کے عید بھلا کیا کریں گے ہم مظلوم

ہلالِ عید! وہ پہلی سی بات ہی نہ رہی
کہ ہم پہ وہ نظرِ التفات ہی نہ رہی
جو ساتھ لاتا تھا تو وہ برات ہی نہ رہی
بگڑ چکا ہے ہمارا نوشتۂ مقسوم

ترا پیامِ مسرت ہمیں ستاتا ہے
کہ یاد ہم کو وہ خوشیوں کے دن دلاتا ہے
ہنسانے آتا ہے اُلٹا ہمیں رلاتا ہے
یہی ہے اپنے لئے روزِ عید کا مفہوم

یہ مانا تو بھی ہے پابستۂ رضائے خدا
پیام لانے میں تو نے کیا ہے فرض ادا
مگر یہاں سے بھی اب اک پیام لیتا جا
کہ عرض کرتا ہے اک مسلمِ جہول و ظلوم

الٰہی! عید تو آئی ہے پر وہ عید کہاں
کہ جس کو دیکھ کے کرتا تھا رشک سارا جہاں
ہمارے پاس کہاں ہیں وہ عید کے ساماں
کہ اب تو اُمتِ احمدؐ ہے غیر کی محکوم

وہ عید بھیج کہ لائے نویدِ آبادی
ہلالِ عید کو کر دے کلیدِ آزادی
ترا غلام ہُوا تیرے در کا فریادی
الٰہی! آج نہ سائل ترا پھرے محروم [illegible]

ہلالِ ابرو

ازجناب مولانا سید محمد الیاس صاحب رضوی
(خاص برائے نیرنگِ خیال)

اے لاجوردی بامِ فلک سے جھانکنے والے ماہرو! تیری رویت، بے شمار آنکھوں کا نور اور دلوں کا سرور ہے، اے منازلِ فلکی کو بسرعت طے کرنے والے پیکِ تیز گام! تیرا پیکر، پژمردہ جذبات اور مُرجھائی ہوئی اُمنگوں کو فرحت و تازگی کا پیام ہے +

اے ظلماتِ شب میں رہبری کرنے والے خضرِ دیرینہ سال! تیری نمود صحرائے طلب میں بھٹکنے والے مسافروں کے لئے چشمۂ رہنما،

تو کیا ہے؟ یہ مانا آج تو عالمِ اسلامی کے لئے نویدِ مسرت، عید کے جشن و انبساط کا اعلان، ماہ رمضان المبارک کے خاتم کا روشن نگینہ، روزہ داروں کے لئے اجرِ جمیل کی دعوت ہے، مگر تیری حالت بھی عجیب ہے، تو کبھی مسرت و انبساط کا پیامی بنتا ہے، اور کبھی رنج و الم کی دعوت اپنے ساتھ لاتا ہے، تیرا اُفق پر نمودار ہونا کبھی تو دنیا کے اہم ترین تاریخی حادثات کی یاد دلاتا ہے، اور کبھی کسی آنے والے یادگار واقعہ کی خوشخبری دیتا ہے، بہر حال تیرا کوئی خاص مقصد نہیں معلوم ہوتا، جس طرح تیرا جسم مختلف صورتیں بدلتا ہے، اسی طرح تیری ہر بات میں گوناگوں تغیرات پائے جاتے ہیں، یہ سچ ہے کہ تو ہمیشہ ایک حالت پر نمودار ہوتا ہے، مگر دنیا کبھی کسی آنکھ سے تجھے دیکھتی ہے اور کبھی کسی آنکھ سے، اور تو بھی نہ معلوم چپکے چپکے اُن کو کیا کہہ دیتا ہے اور دنیا بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ معلوم کیا سمجھ لیتی ہے کہ کبھی تیرا مطلب کچھ سمجھا جاتا ہے اور کبھی کچھ +

ہاں! محرومِ دید، یا حرماں نصیب انسان، ہمیشہ تجھے ایک نظر سے دیکھنے کا عادی ہے، اُسے نہ اس کا خیال تو کیا پیام لایا ہے، نہ اس کی فکر کہ تیرے طلوع ہونے کا کیا مقصد ہے، اس کو تجھ سے صرف اس لئے دلچسپی ہے کہ تو ان کی ابروئے خمدار سے مشابہ ہے +

اُسے نہ ہلالِ عید کو دیکھ کر مسرت ہوتی ہے، نہ ہلالِ محرّم اُس کے لئے غم و اندوہ کا سامان، اس کے نزدیک دونوں کا ماحصل ہلالِ ابرو کی یاد ہے، اور . . . . . بس +

ہلالِ عید ہمی بینند و من پیوستہ ابرویت   مبارکباد برتو عید و برمن دیدن رویت

سیّد محمد الیاس رضوی

(اجمیر)

ہلالِ عید

از جناب حضرت ہادی صاحب بی اے ال ال بی وکیل علیگڑھ

ہلالِ عید نکلا زندگی کی داستاں ہوکر
کہیں جوشِ طرب بن کر کہیں شورِ فغاں ہوکر

توقع ہے کہیں ہنگامہ آرا اس کے دامن میں
کہیں برقِ بلا کی ہے تگ و دو اس کے خرمن میں

کہیں کوشش تمنا میں نویدِ کامرانی ہے
کہیں آفت کا ساماں ہے بلائے زندگانی ہے

کہیں چہرے پہ اس کے ثبتِ غم کی یادگاریں ہیں
کہیں دامن میں اس کے گلشنِ دل کی بہاریں ہیں

کہیں آہنگ نغماتِ خوشی اس کی حقیقت ہے
کہیں یہ ترجمانِ نالہ ہائے رنج و کلفت ہے

کہیں ٹھنڈک ہے اسکی روشنی سوزِ نہانی کی
کہیں تسکین ہے اس کی ضیا آشفتہ جانی کی

کہیں نغموں میں اس کے زندگی کا رازِ پنہاں ہے
کہیں اک سوختہ ساماں کے حق میں برقِ سوزاں ہے

کہیں ہے اس کے سائے سے عیاں قسمت کی تاریکی
کہیں ہے اس کے پرتو میں چمک مہرِ تمنا کی

کہیں دل کے لئے سرمایۂ جوشِ مسرت ہے
کہیں تصویرِ آفت ہے نشانِ دردِ فرقت ہے

گلِ امید بن کر ہے کہیں آغوشِ داماں میں
کہیں ڈوبا ہوا ہے سیلِ اشکِ چشمِ گریاں میں

کہیں دستِ تمنا بن کے دل کو گدگداتا ہے
کہیں پہلو میں لے کر چٹکیاں پہروں رُلاتا ہے

کہیں ہے تارِ دل کے واسطے مضراب کی صورت
کہیں ہے آفتِ جانِ مسرت ، نالۂ حسرت

کہیں سرمایۂ دل غازۂ روئے تمنا ہے
کہیں داغِ جگر تصویرِ رنجِ بے سر و پا ہے

کہیں ہے رونما تسکینِ جانِ پُرمحن بن کر
کہیں اک خوں شدہ دل کے لئے ہے کاوشِ نشتر

ضیا بخشِ توقع ہے کہیں نورِ رواں اس کا
کہیں تاریک ہے اس کے اثر سے دل کا ہر گوشا

دلِ صد چاک کے حق میں کہیں تسکین مرہم ہے
کہیں آہ و بکا و نالہ و فریاد و ماتم ہے

کہیں ہے جلوہ آرا جنتِ چشم و نظر بن کر
متاعِ اشکِ حسرت ہے کہیں سوزِ جگر بن کر

کہیں تسکینِ خاطر ہے کہیں کلفت کا ساماں ہے
کہیں گلشن بکف ہے اور کہیں آتش بداماں ہے

کہیں اس کے اثر سے دل ہے خرمن آہِ سوزاں کا
مداوا ہے کہیں ہاتھوں میں اس کے دردِ پنہاں کا

ہمیشہ مختلف شکلیں ہیں ہادی مختصر یہ ہے
کبھی تاریکیٔ شب اور کہیں نورِ سحر یہ ہے

(غیر مطبوعہ)

ہادی مچھلی شہری

عیدالفطر

رقمزدہ مسلم بی اے
(خاص برائے نیرنگ خیال)

راقم الحروف "نیرنگ خیال" کے گذشتہ "عید نمبر" میں مرقومہ موضوع پر اپنے خیالات بالتفصیل ظاہر کر چکا ہے، واجب التعظیم حکیم صاحب کے ارشاد کی تعمیل میں چند سطور اس "عید نمبر" کے لئے بھی تحریر کر دی ہیں، ناظرین سے استدعا ہے کہ وہ اس تحریر کو محولہ و متذکرہ مضمون کا تتمہ و تکملہ تصوّر فرمائیں +

جامع مسجد

یہ واقعیت کسی ثبوت کی محتاج نہیں، کہ اسلام کا دامن انفرادیت نوازی کے دھبّوں سے منزّہ واقع ہوا ہے، اور اس کی تعلیمات کا ایک اہم منشا یہ بھی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، قومی اور جماعتی طریق پر ایّام حیات بسر کریں، اور بالخصوص فرائضِ مذہبی کی ادائگی میں کامل یگانگت اور وحدت کا نقشہ دنیا کے سامنے پیش کریں، خود غرضانہ جلب منفعت اور اور دفع مضرّت کا تقاضا تو یہی ہے کہ کرۂ ارضی کا یہ عجیب ترین جانور جسے اہل منطق حیوانِ ناطق کے خطاب سے یاد کرتے ہیں دائماً اس امر میں منہمک رہے، کہ جہان بھر کی راحتیں اور نعمتیں سمیٹ سمیٹ کر اپنے پلّو میں ڈال لے، اور کسی کو بھی ان میں سے کچھ نہ دے، اور اگر اس پر کوئی اُفتاد آن پڑے تو اپنی مصیبتوں کو تمام اہل جہان میں بانٹ دے، اور حریص و نفس پرست عاشق کی طرح یہ فہمائش کرے ؎

رقیبوں کو بھی دے دینا یہ شغلِ نالہ و زاری
تبرّک بن کے بٹ جائیں مری فریاد کے ٹکڑے

مگر اسلام نے اپنے مطلب کی پڑھے ہوئے انسان کے پاؤں میں اتنی بوجھل بیڑیاں ڈال دی ہیں، اور اس پر اتنی بندشیں عائد کر دی ہیں، کہ وہ ہل نہیں سکتا، اور اس کو تنگ آکر نفسِ امّارہ کی نہیں بلکہ نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ کی آواز پر صدائے لبّیک بلند کرنی پڑتی ہے، قرآن کریم کی دعاؤں میں یہ بات آپکو عجیب نظر آئیگی، کہ ایک مسلمان محض اپنے لئے کسی بھلائی کی خواہش نہیں کر سکتا، بلکہ اس کو کل افرادِ قوم کو ساتھ شامل کرنا پڑتا ہے، تو یہی کہتا ہے :-

ربّنا آتنا فی الدّنیا حسنۃ وّفی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النّار +

اے ہمارے رب ہم سب کو دنیا اور دین میں باآبرو اور شادکام بنا، اور ہماری ساری قوم کو آتشِ دوزخ سے محفوظ رکھ +

اسی طرح وہ عرض کرتا ہے، "ربّنا لا تزغ قلوبنا" اے پروردگار ہر مسلمان کے دل کو گمراہی سے بچا +

ربّنا اھدنا الصراط المستقیم، اے خالق ہماری ساری جماعت کو صحیح راستے پر چلا +

یہانتک کہ اولاد کی خواہش کے وقت بھی کہنا پڑتا ہے "ربّنا ھب لنا من ازواجنا" اے پالنے والے ہم میں سے ہر ایک کو اُس کی منکوحہ بیوی کے بطن سے صالح اولاد

39574

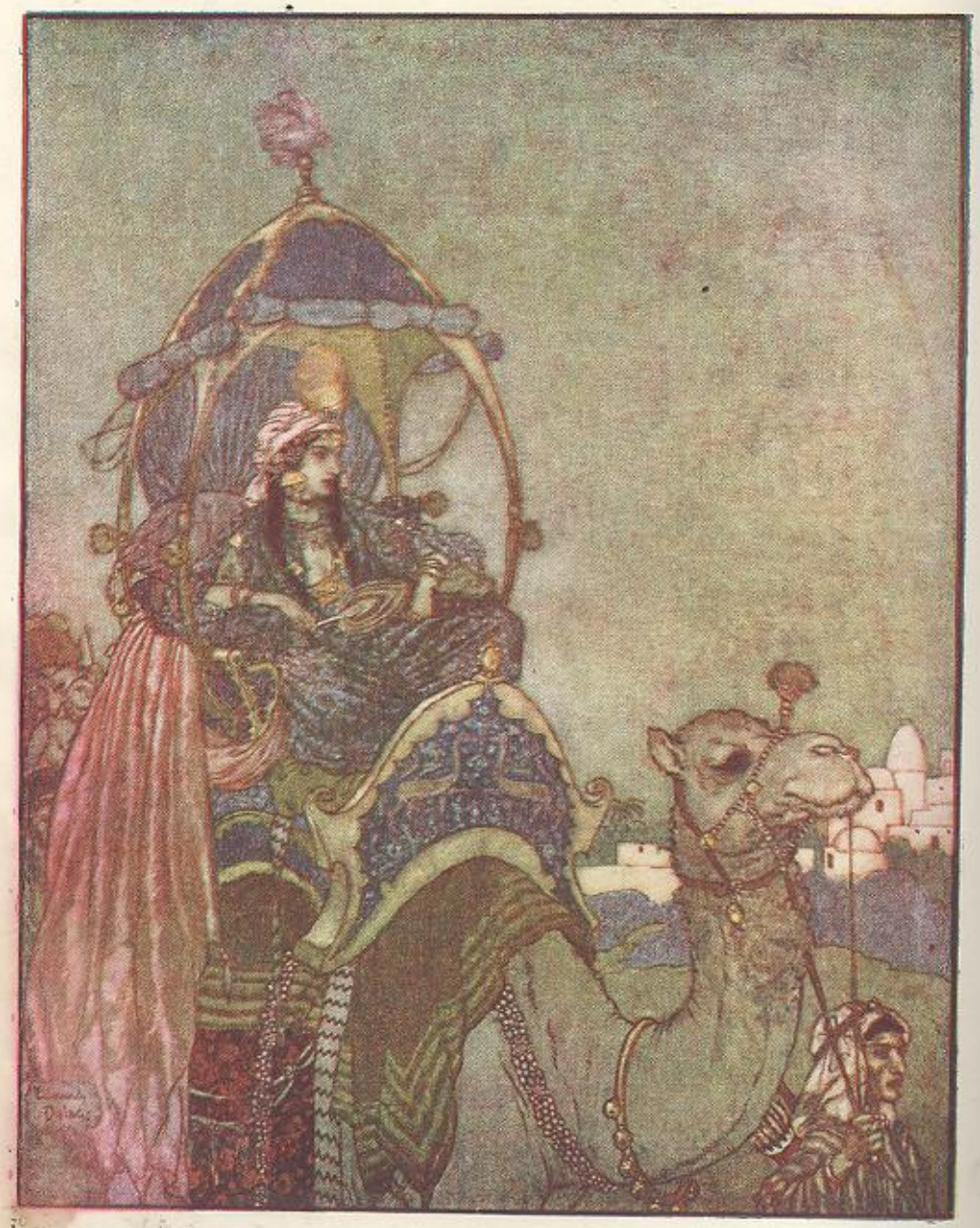

محمل سجا ہوا جو بعزمِ سفر ہے آج
اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج — (قائیو)

PICTORIAL ENGRAVING CO.

رحمت فرما ٭

غرض یہ کہ سارا قرآن کریم ہی اس نوعیت کی دعاؤں سے بھرپور ہے، ہاں یہ بات ضرور ہے کہ جہاں حضرت یونسؑ سے کچھ سہو یا لغزش ہو جاتی ہے تو وہ فرماتے ہیں "یا رب انّی ظلمت نفسی" اے مولا میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے، یہاں چونکہ ایک آفت کا ذکر ہے، اس لئے اس میں فقط اپنے وجود کا ذکر کیا گیا ہے، گویا جہاں اوروں کے نزدیک یہ ہے کہ تقسیم انعامات کے وقت صرف اپنے آپ کو پیش کیا جائے اور مشکلات میں سب سے مدولی جائے، وہاں قرآن کریم نے یہ ہدایت کی ہے کہ مومنین قانتین کی شان یہی ہے کہ بھلائی میں ساری قوم کو شامل کریں، اور اگر کوئی خطا سرزد ہو جائے، تو اس کو جماعت کی طرف نہیں بلکہ اپنی ذات کی طرف منسوب کریں ؎

اُلٹی ہی چال چلتے ہیں دیوانگانِ عشق
آنکھوں کو بند کرتے ہیں دیدار کے لئے

اس کسی قدر طویل مگر ضروری تمہید سے آپ پر عیاں ہو گیا ہو گا کہ مسلمانانِ عالم کے شایانِ شان یہی ہے، کہ وہ جس شہر میں بھی ہو، ان کو نماز عید جس کا ایک مقصد مسلمانانِ شہر کو ایک جگہ مجتمع کرنا بھی ہے، ضرور بالضرور باہم مل کر جامع مسجد میں ادا کرنی چاہئے، آہ مگر ہمارے فرقہ پرستانہ جذبات اور تفریق پسندی کا بُرا ہو، کہ ہم نماز عید بھی کسی ایک مسجد میں بیک وقت کسی ایک امام کی اقتدا میں پڑھ نہیں سکتے، آہ ہمکو ہماری جہالت نے یہ سبق پڑھا رکھا ہے، کہ اگر امام کی نیت خراب ہو تو سارے نمازیوں کی نماز برباد ہو جاتی ہے، حالانکہ بات یہ ہے کہ اسلام میں یہ ظلم نہیں ہے کہ جرم کرے زید اور پکڑا جائے بکر، بہت ممکن ہے کہ جو شخص سب سے پچھلی صف میں سب سے اخیر کھڑا ہے، اسکی نماز قبول ہو جائے، اور امام کی نماز اس کے لئے "کلید درِ دوزخ" بن جائے اور فرقے تو الگ رہے وہ برادرانِ ملت بھی جو علی الاعلان یہ کہتے ہیں، کہ ہم کو فلاں گروہ کے امام کے پیچھے نماز پڑھنے سے کوئی عذر شرعی مانع نہیں، وہ بھی ڈھائی اینٹ کی مسجد الگ بنا لینا ہی اپنا فرض ایمانی سمجھتے ہیں،

اس باب میں ہم برادرانِ لاہور سے یہ عرض کرتے ہیں، کہ جس طرح اُنہوں نے تمام فرقوں کی طرف سے متفقہ و متحدہ جلسے کر کے اغیار و اجانب کو بتا دیا ہے، کہ ہم ایک ہیں اسی طرح ان کو اسلامیانِ ہند کے سامنے یہ مثال بھی پیش کرنی چاہئے، کہ کُل کے کُل کلمہ گو افراد "شاہی مسجد" میں فریضۂ صلوٰۃ ادا کر رہے ہیں، اس خصوص میں کس قدر رنجیدہ بات ہے کہ ریاست بڑودہ میں یہ تنازع درپیش ہے کہ "سنیوں کی جامع مسجد" میں شیعہ برادران بطور استحقاق کے داخل ہو سکتے ہیں یا نہیں، خدارا بتاؤ کہ جب یہ فرقے عالمِ ظہور میں بھی نہ آئے تھے، تو اُس وقت کے واجب التقلید مسلمان کس فرقہ کے حق میں یہ دعائیں کرتے تھے کہ اے اللہ سب کو با اقبال اور خوشحال کر، کیا ہم دعاؤں کا مستحق فقط اپنے کسی فرقہ کو سمجھتے ہیں، یا مسلمانوں کی ہر جماعت کو، ہم کسی کی نیت پر حملہ کرنا سخت ترین عیب سمجھتے ہیں، مگر واقعات بتا رہے ہیں کہ بعض مُلّا حضرات جو چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں بھی نماز عید کا انتظام کر بیٹھتے ہیں، اُن کا مطلب روپیہ بٹورنا ہوتا ہے، دگر ہیچ، سراج الائمہ ابو حنیفہؒ نے بالخصوص اس امر پر زور دیا ہے کہ شہر کے سارے مسلمانوں کو عیدین کی نمازیں جامع مسجد میں پڑھنی چاہئیں، کیا ہندوستان کے حنفی بھائی اس باب میں بھی امام صاحب کی تقلید کرینگے یا نہیں +

قصاص

شاہی مسجد لاہور کے علاوہ ہندوستان کے دیگر بڑے

بڑے شہروں کی مسجدوں میں بھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ ایک جماعت ہو چکنے کے بعد بعض روپیہ بٹور مُلّاں جنہوں نے فقط دو تین سورتیں ہی رٹ لی ہوتی ہیں، بے کھٹکے امام بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور سلام پھیر کر جھٹ پٹ دعا مانگ کر بے سرو پا وعظ شروع کر دیتے ہیں، ان پیٹ کے بندوں کو کیا معلوم کہ واعظ کی ذمہ داریاں کیا ہیں +

تاریخ داں مسلمانوں کو ضرور معلوم ہو گا کہ سلف صالحین ایسے قصّہ گو اشخاص کو "قصاص" کہا کرتے تھے، سیدنا حضرت علیؓ کی نسبت، جو عام مشہور ہے کہ آپ واعظوں کے جلسوں کو منتشر کرتے تھے، اس سے مراد یہی "قصاص" ہیں، جن کا ٹڈی دل لشکر عقائد و اعمال کی کھیتیوں کو تباہ و برباد کر رہا ہے، یہی حضرت علیؓ، حضرت حسن بصریؒ کا وعظ رو کنے کے لئے موقع پر تشریف لے گئے، مگر بیانات وعظ کو صحیح اور مناسب حال پا کر فرمایا کہ" ایسے واعظ کا میں مخالف نہیں ہوں"، حیدر کرّار کی اس سنّت پر اس وقت ترکانِ احرار عمل کر رہے ہیں، اور ترکی میں ایسے داستان گو واعظ قید کر دئے جاتے ہیں جنہوں نے علم دین تو کچھ پڑھا نہیں۔ مگر وعظ گوئی بطور پیشہ بنا رکھا ہے +

ہم ہندوستانیوں کو یہ توفیق کہاں کہ وہ ترکوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ایسے واعظین کا ناطقہ بند کر دیں، ہم تو فقط یہی کہنا جانتے ہیں کہ "ترک کافر ہیں" کیونکہ اُنہوں نے پیسے بٹور واعظوں کا بائیکاٹ کرایا ہے، عیدین کے روز خاص طور پر یہ اہتمام ہونا چاہئے کہ فقط ایک جماعت ہو، اور اگر دوسری جماعت کی ضرورت محسوس ہو بھی تو ان خواہ مخواہ کے رُلانے والے، ہنسانے والے، اور کہانیاں اور لطیفے سنانے والے "واعظوں" کو یہ موقع نہیں دینا چاہئے، کہ جو روپیہ کسی مفید اسلامی مصرف پر صرف ہو سکتا ہے، وہ اُنکی جیبوں میں چلا جائے، عیدین کے علاوہ بھی احتیاط کرنی چاہئے کہ اس قماش کے لوگ علمائے کرام کے منصبِ جلیلہ پر ڈاکہ نہ ڈال سکیں، کیونکہ انہی بزرگوں کی خفیہ حرکات نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقوں کو علما کی واقعی قدر سے محروم کر رکھا ہے

ع ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ ہنر گئی

علمائے کرام اور خطیبانِ عظام کی خدمت میں بھی بصد ادب عرض کرتا ہوں، کہ ان کو اپنے وعظوں اور خطبوں میں مسلمانوں کو ضروریات زمانہ سے آگاہ کرنا چاہئے، اور اُن کو سمجھانا چاہئے کہ اُن کے فرائض کیا ہیں، اگر میری جسارت کو معاف فرمایا جائے تو میں عرض کروں کہ ان دنوں سب سے زیادہ دو باتوں کی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی تعلیم دی جائے، اور دوسرے اُنکو اقتصادی حالت کے درست کرنے کی طرف مائل و راغب کیا جائے،

اُمید ہے کہ ان چند امور پر مسلمان ضرور غور فرمائینگے +

متسلم بی اے

تصوّر روئے ماہ پیکر سے رات آنکھوں میں میری شب بھر
رہا ضیا پاش مہر انور نہ چاند دیکھا نہ عید آئی

انعامِ عظیم برنی ایم اے

عیدِ محروم

(از جناب ملک انور لطیف خاں صاحب بی اے)

جستجو شاید ہلالِ عید کی ہے آج شام
جا رہا ہے سوئے میداں شوق سے ہر خاص و عام
بامِ مسجد پر کھڑا ہے ہر مؤذن منتظر
تا ندا دے وقتِ مغرب رخصتِ ماہِ صیام
آسماں کو دیکھتے ہیں سب نگاہِ شوق سے
ماہِ نو دیکھیں اور آپس میں کریں جھک کر سلام
زاہدوں کو دے رہا ہے مژدہ ان کا انتظار
از سرِ نو ہے عروجِ ساقی و بادہ و جام
ہو رہا ہے شاد ہر انساں حدیثِ عید سے
ڈھونڈنے سے بھی نظر آتا نہیں ہے غم کا نام

بلبل و گل کے لئے عشرت کی ساعت آج ہے
اور کسی محروم کو حسرت کی ساعت آج ہے

بال کھولے سر جھکائے ایک حورِ نازنیں
ہاتھ سینہ پر دھرے آئی نظر بالائے بام
رشکِ صد خوبی مگر فرقت میں مرجھائی ہوئی
نیک دل، پاکیزہ خو، فرخندہ سیرت، خوش کلام
سر میں کچھ دفتر کھلے پہلو میں ہنگامے بپا
آنکھ محوِ جستجو چوں دیدۂ طائر بدام
ساری بستی میں وہی اک درد کی تصویر تھی
بزم آرائی تھی ہر جا شاد تھے سب خاص و عام
اُس کی قسمت میں نہ چھوڑا کچھ زمانہ نے مگر
ہر زماں حسرت کی تعمیر آرزو کا انہدام
یعنی اس اُمید کی دُنیا میں تھا اُس کا نصیب
چشمِ مہجورِ جمال و گوشِ محرومِ پیام
نام شادی کا دلِ محزوں کو تیرِ بے پناہ
زہرِ قاتل اُس کو گویا بادۂ عشرت کا جام
جی بھر آتا جب کبھی تو اُف رے پردہ داریاں
چپکے چپکے چھپکے رو لیتی تھی وہ فرخندہ فام
رو رہی تھی مدتوں سے وہ کسی کی یاد میں
خانہ ویراں کہہ چکی تھی عیشِ دُنیا کو سلام
کوئی مونس تھا نہ کوئی ہمدم و ہمراز تھا
اُس کی "پُراسرار چپ" تھی حسرتوں سے ہمکلام
شبنم افشاں اُس کی آنکھیں تھیں کبھی بے اختیار
اور کبھی حسرت سے کہتی "ہائے وقتِ تیز گام"
آسماں کے ماہِ نو کی اس کو کچھ پرواہ نہ تھی
ڈھونڈتی تھی چشمِ راز اُس کی کوئی ماہِ تمام
ذرہ ذرہ ارض کا سامانِ وحشت تھا اُسے
شہرِ پُر رونق اُسے دنیا کا ویراں تر مقام
گاہے گاہے توڑتی تھی یہ صدا اُس کا سکوت
ہائے شامِ زندگی ہوتی مری فرقت کی شام
یاد کر کے دَورِ ماضی کے کبھی کچھ واقعات
دیکھتی ہر سو جہانِ غم وہ مستانہ خرام

تھی ازل سے وہ امینِ گریۂ شام و سحر

اشکِ خوں روتی تھی پہلو اپنا خالی دیکھ کر

سر اُٹھا کر سوئے میداں اُس نے ڈالی اک نظر
کر رہے ہیں اُنگلیاں سوئے فلک کچھ شاد کام

دل کی بستی لُٹ گئی تسکیں پریشاں ہوگئی
چاند کا جس وقت کانوں میں پڑا عاجز کے نام

چاند سے ملتے نظر شرما گئی گھبرا گئی
مُنہ چھپا کر بام سے نیچے گئی وہ بے مرام

اُس کی خاطر چاند کو کچھ اور ہی مقصود تھا
شہر پر فاقہ حرام اور زندگی اُس پر حرام

پہلے خاموشی تھی یکسر اب سراسر اضطراب
جیسے نووارد تڑپتا ہے کوئی طائر بدام

چند لمحے تو رہی محوِ تپش سیماب وار
خاک پر "دھڑ" سے گری پھر غش میں آکر سوگوار

اُس کی خاموشی بالآخر اُس کی گویائی ہوئی
حالتِ غش میں ہوا اُس کا جنوں محوِ کلام

اے ہلالِ عید دنیا کو پیامِ عیش تو
مبتلائے ہجر کو تو دردو حسرت کا پیام

اک جہاں کو تو مسرّت کا علم بردار ہے
دردمندوں کو تری صورت ہے تیغ بے نیام

کس قدر ظالم ہے دردوغم سے بیگانہ ہے تو
ابتدا تیری سکونِ دل کا میرے اختتام

دیکھ کر رونق جہاں کی میری ویرانی بھی دیکھ
میرے غم خانہ سے بربادی کا بستی میں قیام

تیغِ ابرو تو نہ چمکاتا تو کیا نقصان تھا
میرا تڑپانا تری ہستی کا تھا مقصود تام

کیوں کمر باندھی ہے بسمل کو ستانے کے لئے
جو مٹا جاتا ہے خود اُس کو مٹانے کے لئے

آ کہ تجھ سے خشک و تر اپنے جہاں کا پُر بہار
نورافشانی سے تیری سو دنوں کی ایک شام

قافلہ تیری نظر کا جب ہو مشرق کو رواں
شہر سے دور اک نظر آئے گا پر رونق مقام

جنّت الفردوس کا آئینہ ہوگی وہ زمیں
محوِ عشرت ہونگے سب چھوٹے بڑے پختہ و خام

وسط آبادی میں ہوگا اک محل آراستہ
جب وہاں پہنچے ذرا لینا سواری اپنی تھام

تو وہاں دیکھیگا اک تازہ جواں مستِ شباب
جس کے کانوں نے نہیں غم کا سُنا بھولے سے نام

اس کی صورت دیکھ کر آنکھیں تری شرمائینگی
اس کے دم سے روز روشن ہوگی شام تیرہ فام

گرمِ عشرت ہوگا وہ بیگانۂ رسم و وفا
پاؤں پڑ جانا کہ ہو مائل برحمت شاد کام

زرد روئی تیری تصویرِ رُخِ مہجور ہے
کیا عجب ہے اس سے یاد آجائے آقا کو غلام

بیقراری میری بن کر ہو کے قدموں پر نثار
عرض کرنا پیار سے حسرت نصیبوں کا سلام

پھر مبارک عید کی دنیا یہ کہہ کر چیخ اُٹھی
تھرکا اس آواز سے گردوں کا فرس بے لگام

عرش پر فریاد پہنچی اس دلِ رنجور کی
پڑ گیا ماہ درخشاں پر نقابِ زلفِ شام

چاند کے چھپتے ہی خاموشی نے کاٹی اُسکی بات
توڑ دی قید بدن اور روح نے پائی نجات

(غیر مطبوعہ) انور لطیف بی اے

پردیسی کی عید

از حامد اللہ صاحب افسر بی اے

پردیس میں عید آئے تو کیا ہو کوئی دل شاد
رہ رہ کے ہر اک گام پہ آتا ہے وطن یاد

خوش ہونے کو خوش ہیں مگر ایسی بھی خوشی کیا
کچھ دل پہ اثر نام کو پیدا نہ ہو جس کا

ہنستے ہیں تو وہ بات ہنسی میں نہیں ہوتی
سچ ہے کہ خوشی بے وطنی میں نہیں ہوتی

احباب و اعزا کی ہے تصویر نظر میں
اتنا کبھی گھر یاد نہ آیا تھا سفر میں

کہتے ہیں وطن کس کو یہ معلوم ہوا آج
ہے کتنی وطن سے ہمیں اُلفت یہ کھلا آج

عید آئی ہے اور ہم ہیں غریب الوطن افسر
کیا خوش ہوں کہ ہر وقت ہے کچھ بوجھ سا دل پر

افسر میرٹھی

(غیر مطبوعہ)

نوادرِ ادبی

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کی ایک نایاب تحریر

شکسپیئر میکبتھ کا ایک رُوپ

اُردو میں

شمس العلما پروفیسر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے ڈاکٹر لائنٹز بانی پنجاب یونیورسٹی کی فرمایش پر شیکسپیئر کے ڈراما میکبتھ کو اپنے بعض انگریزی داں طلبہ کی امداد سے اُردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ والد ماجد کی زبانی اس ترجمہ کا حال سُن کر میں نے کئی مرتبہ اپنے عزیز و محترم دوست آغا طاہر نبیرۂ حضرت آزاد سے اُسے مولانا کے مسوّدات میں تلاش کرنے کی درخواست کی تھی، اب پچھلے دنوں اُنہیں مسودے کے چند متفرق ورق کاغذات میں سے مل گئے، تو اُنہوں نے ازراہِ لطف مجھی کو عنایت فرمائیے جس کے لئے میں اُن کا دل سے شکر گزار ہوں۔ جہاں اس باکمال اور اُردو کے مایۂ ناز انشا پرداز کے سحر نگار قلم کی لکھی ہوئی ایک سطر بھی مل جاتی ہے، تو اُن کے عقیدتمند اور ادبی محاسن کے قدردان حضرات آنکھوں سے لگاتے اور بمنزلہ تبرّک سمجھتے ہیں۔ چنانچہ اس کا صرف ایک سین ناظرین نیرنگ خیال کی ضیافتِ طبع کے لئے پیش کرنا نامناسب نہیں معلوم ہوتا۔ تاج

پہلے تماشے کا پہلا رُوپ

جنگل سنسان، بادل کی گرج، بجلی کی کڑک تین چڑیلیں بڑھییں آموجود ہوئیں، کہیں دُور گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔

(۱) چڑیل، کب ہوں گے دیدار، بادل دھوندھ کار میں، کہ بجلی کی جھنکار میں، کہ مینہ موسلادھار میں؟

(۲) چڑیل، جب جنگ اڑنگ بڑنگ ہو جائے، اُدھر ڈھنگ ہو جائے، اِدھر بے ڈھنگ ہو جائے۔

(۳) چڑیل ، توسورج ڈوبتے ہی ورے ہوجائے گا!
(۴) چڑیل ، ٹھکانہ کون ؟
(۲) چڑیل ، لق ودق +
(۳) چڑیل ، میکبتھ کی مٹھ بھیڑ کے لئے +
(۱) چڑیل ، بلے جھٹنے میں آئی +

سب مل کے بولیں ، مینڈک بھوت بُلاتا ہے ، جس گھن کو آئے وہ ہی ہم کو بھائے ، جو بھاوے سبھوں کو اس سے ہم کو گھن آئے ، ایک چکّر مارو اور غائب غلّا ہو جاؤ ۔ چلو دھواندھار اور سڑاہند کے بخار میں پھریں +

(غیر مطبوعہ)

---

(۲)

[ڈاکٹر بجنوری مرحوم جدید ہندوستان کے اُن مایہ ناز ابطال میں سے تھے جن کی ذات میں مغربی اور مشرقی علوم دونوں مجتمع تھے ، آپ کا وہ معرکۃ الآرا مضمون جو اُنہوں نے East + west میں بزبانِ انگریزی علامہ اقبال کے متعلق تحریر کیا تھا آجتک عدیم المثال ہے +

غالباً عام لوگ انہیں محض نقاد کی حیثیت سے جانتے ہیں ، مگر آپ ایک مجموعۂ نظم بھی چھوڑ گئے ہیں جو اُردو ادب میں بالکل عدیم النظیر ہے ، بجنوری مرحوم "جمالیات" کے نہایت دلدادہ تھے ، اور اُنکی نظموں میں بھی آرٹ اور شاعری بہمہ گر نظر آتے ہیں ، ان کے اشعار میں جذبات کی گرمی نہیں ہوتی ، مگر ارفع ترین تخیئل کی خنکی ایک مرمر تراش ماہر کی صنعت گری کی طرح محسوس ہوتی ہے +

نیرنگ خیال خوش قسمت ہے کہ وہ ایسے نوادرات کو شایع کرنے کا فخر حاصل کر رہا ہے] ایڈیٹر

ناھید

(از ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

حسن میں رشکِ ہر نگیں رنگ غذا رِ یاسمیں
شیشۂ ننگِ نازنیں مرمرِ بے مثال تھا

سنگِ خدا نے کی نظر فکر نے جوں شعاعِ ماہ
خانۂ دل میں پائی راہ جلوہ کناں خیال تھا
جیسے شکم میں طفل ہو سنگ میں سو رہی تھی وہ
سُن کے صدائے تیشہ کو خوابِ گراں محال تھا
روح تصوّر نہاں جسم تھا صورتِ عیاں
حُسن حیاتِ جاوداں ان کا بہم وصال تھا

(غیر مطبوعہ) فرائی برش ۱۹۱۳ء

یادِ گُل

(از جناب ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم)

وہ گالوں پہ زردی کہ جوں زعفراں
پڑی تھیں جہاں اور تہاں پتّیاں
اُڑی ایک اتنے میں سوئے نہال
دیا اپنی باہوں کو گردن میں ڈال
وہ پتّی نہ تھی بلکہ تھی تیتری
تصوّر میں تھی گُل کا مُنہ چومتی

(غیر مطبوعہ) (از جاپانی)

مُطائبات

پطرس کا تازہ خط

غیر مطبوعہ

امتیاز بھائی! غالباً میں نے تمہیں آخری خط لندن سے لکھا تھا، بجز اس ایک کاروباری خط کے جو کیمبرج سے اس کے بعد بھیجا، اس وقت دل کی کیفیت یہ تھی، کہ انگلستان میں نووارد تھا، ہر ایک چیز کو بظاہر متانت سے دیکھتا تھا، لیکن اندر ہی اندر گنواروں کی مانند متحیّر اور بدحواس سا ہوتا تھا، چھوٹی چھوٹی باتیں مرعوب کئے دیتی تھیں، اور لبا اوقات انگریزوں کی اور خصوصاً کیمبرج کی روزمرہ سمجھ میں نہ آتی تھی، سیکھنے کا بیحد مشتاق تھا، لیکن کوئی سکھانیوالا نہ ملتا تھا، سوائے ان چند ہندوستانیوں کے جو پرانے واقف تھے، اور جن کو انگلستان میں مقیم ہوئے کچھ عرصہ گذر چکا تھا، لیکن ان کے رویئے میں ایک تصنّع، ایک رعونت، ایک سطحی پن، ایک "کھوکھلاہٹ" پائی جاتی تھی جس سے میں کوسوں بھاگتا ہوں +

اب یہ حالت ہے، کہ کیمبرج کے علمی، ادبی، معاشرتی مشاغل میں منہمک ہوں، اور جس سہولت اور سلیقے سے میں نے یہاں کی زندگی اختیار کر لی ہے، اس پر میں خود حیران ہوں، ہندوستانیوں سے رفتہ رفتہ قطع تعلق ہو رہا ہے، یہانتک کہ آج کسی ہندوستانی سے بات کئے پندرھواں دن ہے انگریز دوستوں کا حلقہ روزبروز وسیع ہو رہا ہے، اور گزر اوقات کا ایک خاص ڈھنگ بنتا چلا جا رہا ہے، دل و دماغ نے اپنے لئے ایک معیار اختیار کر لیا ہے، اور ہر سرگرمی اس معیار پر پورا اُترنے کے لئے وقف ہے +

جب میں کیمبرج میں پہنچا، تو تمام کالج بند تھے، بازار بے رونق، اور ہر طرف خاموشی سی چھائی تھی، اس عرصہ میں میں نے چھوٹی چھوٹی ضروریات بہم پہنچالیں، اور کیمبرج کے گردونواح سے خوب اچھی طرح واقف ہو گیا، جب کالج کھلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دائیں بائیں، اِدھر اُدھر ہر طرف ہزاروں دروازے یک لخت کُھل گئے، جن میں سے ہجوم کے ہجوم کالے کالے گون پہنے تمام شہر پر چھا گئے، نووارد نئے نئے گون، سہما ہوا چہرہ، پرانے گھاگس گون کیا کالے چیتھڑے، چال میں بے پروائی، چہرے پر ایک تیقّن، اساتذہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دُھن میں چلے جا رہے ہیں، یونیورسٹی نے سانس لیا، ایک چھینک ماری، جس سے کیمبرج بھر میں ایک لرزہ سا آگیا، جیسے کسی گھڑی ساز کی دُکان میں سب گھڑیاں یک لخت چلنے لگ جائیں، اس بھونچال میں میں بھی ایک طرف کو دھیمے دھیمے چلا جا رہا تھا سینے میں ایک عجیب قسم کی دھڑکن تھی، اور دل پر ایک اُداسی چھائی ہوئی تھی، یا الٰہی اب کیا ہوگا، یہ تو دُنیا ہی نرالی ہے، اور میں بے یار و مددگار، نہ ہم سخن نہ ہم خیال، گھر سے کوسوں دُور بجز اپنے دل کی تقویت کے کوئی سہارا نہیں، ہفتے کے ہفتے

گھر سے خط آتا، تو اپنی تنہائی کو اور بھی زیادہ محسوس کرنے لگ جاتا، جب لکچر شروع ہوئے تو اس مایوسی نے کشمکش کی صورت اختیار کرلی، نہ یوں کہ بعض لکچروں میں تو قوا میں ایک حرکت اور خیالات میں پرواز محسوس ہونے لگی، اور بعض لکچروں میں یہ حالت تھی، کہ نوٹ بک کھولے بیٹھا ہوں، پنسل ہاتھ میں ہے، آنکھیں لکچرار کے چہرے پر جمی ہوئی ہیں، ماتھے پر تیوری ہے، ہمہ تن گوش ہوں، ایک ایک لفظ کو غور سے سُن رہا ہوں، اور ہر فقرے کو دل میں دُہراتا ہوں، لیکن وقت گذرتا جاتا ہے، اور دماغ کسی چیز پر قابو نہیں پاتا، کچھ لکھنے لگتا ہوں، لیکن نہیں لکھ سکتا، خیالات میں ایک گونج سی ہے، جس میں کچھ سننے نہیں ڈال سکتا، ایسے لکچر کے خاتمہ پر مجھ سا دل شکستہ، دلگیر انسان کیمبرج میں نہ ہوگا، اپنی کم مائگی پر بے انتہا نادم، زندگی کے جو سال ہندوستان میں ضایع کئے ان کا بیحد افسوس، دل میں غضبناک نئے نئے ارادے، نخوتِ علم کو شدید صدمہ، غصہ اور رنج، ولولہ اور اُمنگ، سر جھکا ہوا، ایک نیم مردہ، مایوس انسان آہستہ آہستہ قدم اُٹھائے لائبریری کی طرف جا رہا ہے یہ وہ انسان ہے جو ہندوستان جنت نشان میں انگریزی کا ماہر، ننھی عمر میں لامحدود قابلیتوں کا مالک سمجھا جاتا تھا، دھوکا امتیاز سب دھوکا، اے میرے بچپن کے رفیق، اے مایۂ ناز ہمعصر، سب مایا +

نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ایک تپسوی کی زندگی بسر کرنے کا ارادہ کرلیا، اپنے آپ کو یونیورسٹی لائبریری کے ایک کونہ میں گم کردیا، اس فقرے کے صحیح معنی جب تمہاری سمجھ آئیں گے جب تمہیں معلوم ہوگا، کہ لندن کے عجائب خانے کی لائبریری کی طرح یہاں کی لائبریری بھی ولایت میں جو کتاب چھپے اسکی ایک کاپی کی حقدار ہے، اس کتب خانے میں یوں ہاتھ پاؤں مارے جیسے مثلاً تم رود بار انگلستان کو تیر کر عبور کرنیکی کوشش کرو، غرضیکہ ایک بخار چڑھا ہوا تھا، ایک دیوانگی سی طاری تھی، چاہتا تھا کہ چاسر سے لے کر ٹامس ہارڈی تک شعر و سخن کی تمام دنیا پر ایک بجلی سی چمکے اور یہ روشن تصویر پوری کی پوری ایک لمحے کے اندر میرے دل پر نقش ہو جائے، لیکن یہ کیونکر ممکن تھا، چنانچہ دیوانگی نے ایک خطرناک صورت اختیار کرلی، کیمبرج کے طوفان نے میرے قدم کہیں بھی نہ جمنے دیئے، اور علوم و فنون کے اس سمندر میں غوطے کھانے لگا

اس کے بعد مجھے کیا پیش آیا، اس کے متعلق مجھے یہاں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھنا پڑیگا +

یہاں کے کالجوں کی تعداد چودہ پندرہ کے قریب ہے ہر کالج کا انگریزی لکچرار لٹریچر کے ایک خاص موضوع پر لکچر دیتا ہے، اکثر ہفتے میں ایک دفعہ اور بعض اوقات ہفتہ میں دو دفعہ +

بعض کالجوں میں انگریزی کے دو تین لکچرار ہیں، اور بعض لکچرار ایک سے زیادہ موضوع پر لکچر دیتے ہیں، اس طرح انگریزی لٹریچر پر یونیورسٹی بھر میں ایک ہفتے کے اندر تیس بتیس لکچر ہوتے ہیں، ہر کالج میں ایک لکچرار انگریزی کا انچارج ہوتا ہے جس کو ڈائرکٹر یا اوورسیر کے نام سے پکارا جاتا ہے +

ٹرم کے شروع میں باری باری ہر طالب علم اپنے کالج کے اوورسیر کے پاس جاتا ہے، ہماری باری بھی آئی، گون پہنے ہوئے شام کے ساڑھے چھ بجے اوورسیر کے کمرے کے پاس سہمے ہوئے پہنچے، ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دی، ایک نہایت نرم آواز نے "کم اِن" کہا، اندر داخل ہوئے تو اپنے آپ کو کتابوں کی الماریوں میں گھرا ہوا پایا، ایک صوفے پر مسٹر بینٹ (Bennet) دراز تھے،

مسٹر بینٹ شیکسپیئر اور چاسر کے ماہر ہیں، اور چاسر کے زمانہ پر ایک قابلِ قدر تصنیف (The Pastons) کے مالک ہیں، معمولی اخلاق کے بعد اُنہوں نے نہایت ہمدردانہ سوالات پوچھنے شروع کئے، گفتگو نہایت ہلکی تبسم آمیز قسم کی اور زیادہ تر ہندوستان، اُردو لٹریچر، افغانستان، سوراجیہ پارٹی، عمر خیام، الف لیلہ، پنجاب یونیورسٹی، اقبال، ٹیگور، برنارڈ شا، کپلنگ اور حیدرآباد کے متعلق تھی، اور چونکہ ہم بھی آخر بڑی بڑی مجلسوں میں سے نکالے گئے ہیں، اس لئے تمہیدی ہچکچاہٹ کے بعد ہم نے بھی دل کھولکر بکنا شروع کیا، گویا افتتاحِ داستان کو زینت دینے کے لئے حقیقت سے ذرا ذرا انحراف بھی کیا، (محض حبِ وطن کی خاطر) لیکن عام لہجہ ایک راست گو، حق پرست انسان کا تھا، جو اپنی اور اپنی قوم کی کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے، جو باوجود قومِ انگلیس کے گوناگوں اوصاف سے باخبر ہونے کے . . . . انہیں ایشیائی تہذیب کے لئے کچھ مضر ہی سمجھتا ہے، اور جو اب تحصیلِ علم کی خاطر یہاں کے مشاہیر کے قدموں میں بیٹھنے کو باعثِ صد فخر و ناز تصور کرتا ہے +

جناب کچھ مسکرائے، ایشیائی تہذیب اور تاریخِ اسلام سے بہت دلچسپی ظاہر کی، میرے انگریزی تلفظ کی بہت تعریف کی، اور مجھ سے یوں باتیں کرنے لگے گویا میں الف لیلہ کا ایک کیرکٹر ہوں، لیکن افسوس، کہ تھوڑی ہی دیر کے بعد گفتگو نے انگریزی لٹریچر کی طرف رجوع کیا، ہم نے اپنے عجز اور کم مائگی کا اعتراف کیا، اپنی نالائقی کو کوسا، اپنی جہالت کے متعلق ایک بلیغ تقریر کی، اور جو کچھ کہا اُس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارا علاج کیا ہے؟

جو کچھ اُنہوں نے جواب میں کہا، اُس کا مطلب یہ تھا، کہ تم بالکل چغد ہو، اگر تم یہ توقع کرتے ہو، کہ تمہیں ہر لکچر سمجھ میں آجائے، تو تم غلطی پر ہو، ڈاکٹر لیوس (Leavis) کے لکچر جن کے متعلق تم شاکی ہو، وہ کیمبرج میں کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آتے، اور کوئی بھی اسقدر گدھا نہیں ہوتا، کہ چاسر سے لیکر ہارڈی تک سب انگریزی لٹریچر کی ایک گولی بناکر نگل جانا چاہے، جو مصنف تمہیں پسند ہیں، جن جن کی تصنیفات تمہارے دل و دماغ میں ایک خوشگوار ہیجان پیدا کرتی ہیں، صرف وہی پڑھو، صرف اُنہی کے متعلق لکچروں میں جاؤ، باقی بالکل چھوڑ دو، چنانچہ یہ رہی لکچروں کی فہرست، فلاں فلاں لکچروں میں جاؤ، ان کے متعلق اس ہفتے صرف یہ دو کتابیں پڑھو، اگلے ہفتے اور اس کے بعد ہر ہفتے مجھ سے اسی وقت ملو، جو دقت تمہیں پیش آئے، بلا تامل دن اور رات میں کسی وقت مجھ سے آکر بیان کرو، یہ کتابیں مجھ سے مستعار لے جاؤ، پرسوں میرے ساتھ آکر چائے پیو، میری بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہوگی، رہتے کہاں ہو، میں کسی وقت تم سے آکر ملونگا، جب لندن میں جاکر پروفیسر جونسر سے ملو، تو بعد میں مجھے آکر ملاقات کا مفصل حال سنانا، کوئی کھیل کھیلتے ہو؟ نہیں؟ کوئی اور شغل، ڈراما؟ موسیقی؟ خوب کبھی ہمیں آکر گانا سُنانا، تمہارے ڈنر کا وقت قریب آرہا ہے، میں تم سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں، اور حیران ہوں کہ تم لوگ ہندوستان میں رہ کر اتنی انگریزی کیونکر سیکھ لیتے ہو، تمہارے دوست کہاں ہیں؟ رستہ تو نہیں بھول جاؤ گے؟ میں تمہارے ساتھ چلوں؟ نہیں؟ اچھا خدا حافظ، خوش رہا کرو، اور جب تمہیں کسی قسم کی تکلیف ہو، فوراً میرے پاس آجایا کرو +

میں نے اطمینان کا سانس لیا، اور واپسی میں تمام رستے مسکراتا آیا +

پھر تو ہمارے حوصلے بڑھنے لگے، اور جوں جوں دن

گذرتے گئے، زندگی خوشگوار تر ہوتی گئی، آج اُس نے بائے پر بُلایا، کل اُس نے کافی کی دعوت دی، واقفیت سے دوستی اور دوستی سے بے تکلفی کی نوبت آئی، ایک آدھ حضرت سے محبت دھول دھپے کی حدتک بڑھ گئی ہے۔ لیکن ——

لیکن وہ ہندوستان کی صحبتیں کہاں، وہ خوش گفتاری، وہ شعر بازی، وہ پھبتیاں، وہ روٹھنا، وہ منانا، وآت اپنے گھر کا غلام، موقع اور محل خانہ زاد، وہ ہوٹل کی مجلسیں، وہ دارالاشاعت کے مجمعے، ہائے اتیا ذاک ہُوک سی دل میں اُٹھتی ہے، پیارے جگل کی خوش فعلیاں، ننھے منشی کی چہلیں، میرے سالک کی مذہبی لن ترانیاں (اللہ دودھوں نہائے اور پوتوں پھلے) وہ حفیظ کی ٹھمریاں، (اللہ کی امان)

خیران باتوں کو دو سال کے لئے بھلانا پڑیگا، اب تو زندگی کا یہ ڈھنگ ہے کہ کالج کے ہاسٹل میں دو کمرے ملے ہوئے ہیں، ایک بیٹھنے کو ایک سونے کو، باقی جگہوں میں صرف رات کا کھانا اکٹھا کھایا جاتا ہے، ہمارے ہاسٹل میں یہ دستور ہے، کہ ہاسٹل کے رہنے والے جن کی تعداد تیس کے قریب ہے، ناشتہ اور لنچ کامن روم میں اکٹھے کھاتے ہیں، اور شام کا کھانا سب کالج کے طلبہ اور اساتذہ کے ساتھ کالج کے ہال میں ہوتا ہے، چائے کا اکثر یہ حال ہے کہ یا میں کہیں مدعو ہوں، یا کوئی میرے ہاں آیا ہوا ہے +

صبح کے وقت ڈریسنگ گون، پاجامہ، سلیپر اور تولئے غسل خانے سے آتے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں غسلخانے کے اندر سب ننگے ہوکر بغیر کسی شرم وحیا کے ایک دوسرے کے سامنے نہاتے ہیں، پھر کامن روم میں حاضری، نوبجے کے بعد سب گون پہنے ہوئے پیدل اور بائیسکلوں پر بھاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ہر بائیسکل کے ہینڈل کے ساتھ ایک ٹوکری لگی ہوتی ہے، جس میں کتابیں وغیرہ ڈال لیتے ہیں، نوبجے سے ایک بجے تک لکچروں کے اوقات ہوتے ہیں، اس دوران میں کیمبرج کا تمام نظارہ تین عناصر سے مرکب ہوتا ہے (۱) گون (۲) نوٹ بک اور (۳) جلدی، دس بجے ایک لکچر اس کالج میں ختم ہوا، اور دس ہی بجے دوسرا لکچر دوسرے کالج میں شروع ہونے والا ہے، چنانچہ بسااوقات بازاروں میں سے بے تحاشا بھاگتے ہوئے جانا پڑتا ہے،

لکچرار قسم قسم کے ہیں، ایک مسٹر بینٹ ہیں ادھیڑ عمر، جوانی میں بہت ہی خوبصورت ہونگے، شیکسپئیر اور زمانۂ وسطیٰ کی لٹریچر پر لیکچر دیتے ہیں، اس انہماک، اس جوش، اس فصاحت اس بلاغت کے ساتھ کہ اکثر کلاس دو دو منٹ تک داد دیتی رہتی ہے، (جس کا طریقہ یہ ہے، کہ فرش پر زور زور سے پاؤں مارتے ہیں) ایک مسٹر ٹل یارڈ Tillyard ہیں ملٹن فرماتے ہیں، اور اس کے علاوہ تاریخ تنقید پر بھی لکچر دیتے ہیں، لیکن جس موضوع پر بولتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے، عمر اسی میں صرف کردی، ایک مسٹر لوکس Lucas ہیں چھپے دار فقرے، اعلیٰ درجے کا تفنن، غضب کی تشبیہیں، لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ان پر ختم ہے، مگر مطلب کی بات بہت کم کہتے ہیں، اس لئے گو وہ ٹینیسن پر لکچر دیتے ہیں، لیکن میں نے اُن کے مضمون کا ذکر نہیں کیا، ایک ڈاکٹر لیوس (Leavis) ہیں نوجوان لیکن [illegible] کی ڈگری کے مالک، دورجدید اُن کا خاص مضمون ہے، تمام تنقید کی بنیاد دقیق نفسیات پر رکھتے ہیں، بڑے بڑے موجودہ مصنفوں کے بخیے اُدھیڑتے ہیں (ان میں بچاری دلکاکس بھی شامل ہے) لیکن اپنے موضوع میں اسقدر ڈوبے ہوتے ہیں، کہ ہنسی مذاق کی بات ان کے ہونٹوں پر آتی ہی نہیں، جو شخص ان کے لیکچر میں دو فقرے بھی اچھی طرح سمجھ لے یقینی امر ہے کہ وہ دو تین سال کے بعد انگلستان کے بہترین نقادوں میں شمار ہوگا، لیکن ہائے وہ

دو فقرے!

میں اُن کے پاس بھی ہفتے میں دو دفعہ اپنا جوہر مضمون دکھانے جاتا ہوں، بچارے میرے ساتھ بہت محبت کرتے ہیں لیکن جس بلندی پر وہ اُڑتے ہیں، اور جس زمین پر میں رینگتا ہوں، ان میں فاصلہ اسقدر ہے، کہ میرا ان کے برابر اُڑنا شاید کبھی ممکن ہو لیکن ان کا مجھ تک اُترنا قطعی ناممکن، لہذا گو ان سے بہت کچھ سیکھتا ہوں، بہت کچھ، لیکن ہر دفعہ اپنی بے بضاعتی کا ازحد تیز احساس اپنے ساتھ لاتا ہوں، جو بہت دیر تک برہم کئے رہتا ہے +

اور ان سب سے بڑھ کر پروفیسر سر آرتھر کوئلر کوچ (Arthur Quiller Couch) ان کے نام سے تو تم قطعی واقف ہوگے، اگر نہیں تو تمہاری جہالت کی نشانی ہے، کیمبرج میں ہر کہ و مہ ان کو کیو کے نام سے پکارتا ہے، نظر کی خرابی کی وجہ سے باہر کم نکلتے ہیں، اور باقاعدہ لیکچر بھی نہیں دیتے، صرف ہفتے میں ایک بار کلاس لیتے ہیں، بدھ کے دن شام کے ساڑھے آٹھ بجے ان کی کلاس ہوتی ہے، جس میں ہم پچاس ساٹھ آدمیوں کو ارسطو کی Poetics پڑھاتے ہیں، کلاس کا حال سُن لو، ایک اوسط درجے کا بڑا کمرہ ہے، فرش نہایت عمدہ، بیس پچیس کرسیاں انگیٹھی میں آگ خوب جل رہی ہے، بیچ میں ایک بڑی میز ہے جس پر پچاس ساٹھ پرچ پیالے پڑے ہیں، سوا آٹھ بجے سے لوگ جمع ہونا شروع ہوتے ہیں، جو پہلے آتے ہیں وہ کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں، باقی فرش پر آلتی پالتی مار کے، یا نیم دراز +

ساڑھے آٹھ بجے دروازہ کھلتا ہے، اور آپ داخل ہوتے ہیں، سر اور مختصر سی مونچھوں کے بال سفید، خمیدہ قامت، ہاتھ میں سگار لئے ہوئے، چہرہ پر مسکراہٹ، مسکراہٹ بھی شرابیوں کی سی، اور فی الواقع پیتے بھی بہت ہیں، سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں، (ان کے علاوہ باقی لیکچروں میں کھڑے ہونے کا دستور نہیں) کیو کے پیچھے پیچھے ایک ملازم طشت میں کافی لئے داخل ہوتا ہے، سب لوگ میز کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، ہر ایک کافی کا پیالہ اُٹھا کر اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے، اور سگرٹ یا پائپ سلگا لیتا ہے، پروفیسر صاحب کسی طالب علم کو پڑھنے کے لئے اشارہ کرتے ہیں وہ ایک آدھ پیراگراف پڑھتا ہے اور پھر صاحب اس پر بحث کرتے ہیں، جس میں دنیا جہان کی باتیں بیان کر جاتے ہیں، بعض دفعہ خوب زوروں کی بحث بھی ہوتی ہے، کلاس کیا ہے، مذاق اور متانت، علم اور دل لگی کی ایک ضیافت ہے جس سے دل کبھی سیر نہیں ہوتا، خود پروفیسر کیو کی شخصیت کا میں تمہیں اس سے بہتر اندازہ نہیں دے سکتا کہ اُن کی ترکیب طبیعت کا نسخہ ان الفاظ میں لکھوں، کہ شبلی غالب، حالی آزاد اور اودھ پنچ کو ملا کر اس مجموعے کو انگریزی بناؤ اور سَو سے ضرب دیدو۔ انگریزی پڑھانے والوں میں سے لٹریچر کے شعبے میں صرف یہی ایک بزرگ ہیں جو پروفیسر کے لقب سے ملقب ہیں، لہذا تم ان کے تبحر کا اندازہ خود ہی لگا لو +

دوپہر کے ایک بجے لیکچر ختم ہوتے ہیں، اس کے بعد دو بجے تک لنچ، اور دو بجے سے چار بجے تک تمام طلبا ایک نہ ایک کھیل کھیلنے جاتے ہیں، چار بجے شام ہو جاتی ہے اندھیرا چھا جاتا ہے، چراغ روشن کر دئے جاتے ہیں، آگ جلائی جاتی ہے، اور اس پر چائے کے لئے پانی رکھ دیا جاتا ہے، چائے کے بعد ہال تک (یہاں کی اصطلاح میں ہال شام کے کھانے کو کہتے ہیں) جا ہو تو ایک آدھ گھنٹہ مطالعہ کر لو، چاہو تو کسی کا وقت ضایع کراؤ، ہال کے بعد کافی کے لئے

آگ پر پانی رکھ دو اور جبتک دل چاہے، پڑھتے رہو، جو آئے اُسے بیشک کان سے پکڑ کے باہر نکال دو، اور اگر بہت ہی بدتمیز دوستوں سے واسطہ پڑا ہو، تو دروازہ کو اندر سے تالا لگا کر بیٹھو، (یہ فعل گوناگوں شبہات کا باعث بھی ہو سکتا ہے، لہذا اپنے دوستوں کو اس کے صحیح معنے سمجھنے کی عادت ڈالو)

یہ تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں یہ سب کالج راہب خانے تھے، چنانچہ یہاں کی زندگی میں مذہبی رنگ بہت نمایاں ہے، ہر کالج کے متعلق ایک گرجا ہے، اور اس کے علاوہ شہر میں اور بھی بہت سے گرجے ہیں، جن کے گھنٹے یہاں کی فضا کو ہر وقت مسیحیت میں لپسائے رکھتے ہیں، ہر ہفتے یونیورسٹی کے کسی نہ کسی گرجے میں ایک نہ ایک مشہور پادری یا مذہبی واعظ یا مبلغ کا لکچر ہوتا ہے، کیمبرج کا شہر بہت چھوٹا سا ہے، اور یہاں کی آبادی صاف طور پر دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے، ایک تو وہ لوگ جو یونیورسٹی سے متعلق ہیں، اور جو تعطیلات کے شروع ہوتے ہی یک لخت غائب ہو جاتے ہیں، ان کو Gown-man کہا جاتا ہے، ان کے علاوہ جسقدر شہر کے اصلی باشندے ہیں، وہ سب کے سب دُکاندار پیشہ یا مزدور پیشہ ہیں انکو Town-man اور طلبا کی اصطلاح میں ٹاؤنی کہا جاتا ہے، یہ لوگ سب نچلے طبقے کے ہوتے ہیں، کیمبرج میں کالجوں کی حدود کے باہر شرفا مفقود ہیں +

انڈر گریڈ Under grade لوگوں کا یہ حال ہے، کہ اگر جا جوں پانی برس رہا ہو تو خیر، ورنہ ٹوپی پہننا گناہ سمجھتے ہیں، ٹی کا کوٹ اور فلالین کی پتلون یہ ان کا لباس ہے پتلون پر یہ بڑے بڑے سیاہی کے داغ، گون کی بےعزتی کرنا فخر سمجھتے ہیں، چنانچہ جان بوجھ کر اس میں جابجا سوراخ کرتے ہیں، اس سے یہ بھی مقصود ہوتا ہے کہ نو وارد معلوم نہ ہوں ان کے مشاغل کی کثرت، کا کچھ نہ پوچھو، قسم قسم کے جنون ہیں، پڑھتے ہیں، کھیلتے ہیں، سفر و سیاحت کی ایک کلب بنا لیتے ہیں، جس میں جنوبی امریکہ تک ہو آتے ہیں، مچھلیاں پکڑتے گولف کھیلتے ہیں، کشتیاں چلاتے ہیں، طرح طرح کے ساز بجاتے ہیں، ناچتے ہیں، گرجاؤں میں جاتے ہیں، تبلیغ کا کام سیکھتے ہیں، تصویر کشی کرتے ہیں، بعض رؤسا بہت اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنتے ہیں، بعض کسی سیاسی کلب کے ممبر ہیں، جہاں ہمیشہ کسی نہ کسی سیاسی لیڈر کے لیکچر ہوتے رہتے ہیں، بعض ایک پیانو کرائے پر لے آئے ہیں، بعض نے دو موٹر کاریں رکھی ہوئی ہیں، اور کسی موٹر کار کلب کے ممبر ہیں، جس کے نمائندے دنیا کی ہر بڑی سڑک پر مل جاتے ہیں، بعض کی زندگی گھوڑدوڑ کے لئے وقف ہے، بعض صبح سے شام تک لیبارٹری میں بھاڑ جھونکتے ہیں، ڈرامیٹک کلبیں بیشمار ہیں، بعض صرف اوپیرا اور میوزیکل کامیڈی کرتے ہیں، بعض صرف یونانی کھیل، بعض سیدھی سادی کامیڈی + سینری ڈریس وغیرہ سب خود بناتے ہیں یا کم از کم وضع کرتے ہیں + غرضیکہ ایک تعلیمی میلہ ہے، جس میں جو کام ہوتا ہے آئین کے ساتھ + انہماک اور انضباط، یہ یہاں کے دو بڑے اصول ہیں، اور ان سب کی تہ میں وہ حیرت انگیز طاقت کام کرتی ہے جس کو Tradition کہتے ہیں + ہفتہ بھر پسینے بہا دینے والی مصروفیت میں گذرتا ہے، دن کو بھاگتی ہوئی ٹانگیں، رات کو بند کمرے روشن چراغ، اور کھلی ہوئی کتابیں + اتوار کے دن کیمبرج کی سب آبادی، سب مصروفیت، سب چہل پہل خدا جانے کہاں غایب ہو جاتی ہے، امتیاز یہاں کی اتوار ایک معجزہ ہے، دن کے گیارہ بجے میلوں گھوم جاؤ، ایک درجن سے زیادہ آدمی نہ پاؤگے، وہ بھی سیاہ پوش، سست رفتار، سوائے گرجاؤں

کے گھنٹوں کے اور زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے، بازاروں کو دیکھو، تو ہو کا عالم، آہیں بھرنے کو دل چاہنے لگتا ہے، شام کے وقت دن کی کسر پوری کردی جاتی ہے، اور مرد و زن کے جوڑے ہزاروں کی تعداد میں چہل قدمی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اکثر قبلِ ازدواج کے مراحل طے کرنے میں مصروف ہوتے ہیں، اور یہ وہ شغل ہے، جو انگلستان میں شادی سے پہلے بھی جائز ہے، اور شادی کے بعد بھی، شادی کا ارادہ نہ موجب بھی، حق تو یہ ہے کہ اسے شادی سے کچھ چنداں تعلق نہیں، اور چونکہ کیمبرج کے لوگ تمامتر نچلے طبقے کے ہیں اس لئے اس کے قبیح ترین پہلو دیکھنے میں آتے ہیں +

کیمبرج آکسفورڈ کی بہ نسبت بہت زیادہ قدامت پرست ہے، چنانچہ گو یہاں لڑکیوں کے دو کالج ہیں، لیکن وہاں کی "طلبانیاں" نہ تو یونیورسٹی کی ممبر شمار ہوتی ہیں، نہ کسی ڈگری کی حقدار، البتہ لکچروں میں آتی ہیں، اور امتحانوں میں بیٹھ سکتی ہیں، لیکن امتحان پاس کرنے کے بعد ان کو ڈگری نہیں ملتی، باوجود اس کے انگریزی کی کلاس میں پچاس ساٹھ کے قریب لڑکیاں پڑھتی ہیں، اگر اتفاق سے لیکچر میں کوئی ساتھ بیٹھ جائے، تو شامت آجاتی ہے، ہم لوگ ایک نوٹ بک کھولکر نوٹ لینا شروع کردیتے ہیں، اور زیادہ سے زیادہ میز کا ایک مربع فٹ استعمال کرتے ہیں، وہ پہلے تو گلے سے لومڑی کی دُم کھول کر میز پر رکھتی ہیں، پھر دستانے اُتار کر رکھتی ہیں پھر کوٹ اُتار کر بنچ کی پشت پر پھیلاتی ہیں، دستانوں کے پاس ٹوپی اُتار کر رکھ دیتی ہیں، پھر ہینڈ بیگ کھول کر اس میں سے پنسل اور رومال نکالتی ہیں، رومال سے ناک پونچھتی ہیں، ہینڈ بیگ کے چھوٹے سے آئینے میں اپنے چہرہ کا جائزہ لیتی ہیں، کنپٹی پر سے زلفوں کے گھونگھر سنوارتی ہیں، پھر پر جھک کر کنگھی کو پڑوسی کی ناک میں دیکر بہت خوبصورتی اور سلیقہ سے نوٹ لینا شروع کرتی ہیں، دو منٹ کے بعد اُن کے قلم میں سیاہی ختم ہوجاتی ہے، طوعاً و کرہاً آپ اپنا قلم یا پنسل پیش کیجئے، اور خود گھنٹہ بھر مکھیاں مارتے رہئے، ایک ایسے تلخ تجربے کے بعد اب میں جیب میں ایک فالتو پنسل ضرور رکھتا ہوں +

یہ حضرت کیمبرج یونیورسٹی ہے، یہاں کا ہر فرسودہ پتھر تاریخ انگلیس کی ایک خاموش فصل ہے، یہ وہ دار العلوم ہے جہاں ہم سے کہیں پہلے جان ہارورڈ (جس نے امریکہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی) آلیور کرامول Cromwell سٹرن، Sterne کولرج، سیموئیل ٹبلر، بیکن ٹینی سن، تھیکر میکالے، نیوٹن، بل ورلٹن، سیلے، لارڈ چسٹر فیلڈ، مارلو، ولیم پٹ گرے اور ملٹن کسب فیض کرچکے ہیں، اور جہاں اس وقت انگلستان کی آئندہ نسل کے کئی مشاہیر تعلیم حاصل کررہے ہیں، اس بہارستان میں ہندوستان کا ایک مرجھایا ہوا بے رنگ و بُو پھول کیا حقیقت رکھتا ہے، غریب ماں باپ کا بیٹا، ایک غلام قوم کا فرد، نسیم اور مرزا شوق کی مثنویوں کا پڑھنے والا فسانۂ آزاد کا دلدادہ، طبلے اور سارنگی کا شوقین، "زمیندار" اور "گرو گھنٹال" کا خریدار، ایشیا کے عشقیہ افسانوں میں رچا ہوا، مُغلیہ عیش و عشرت کا خواہشمند، اتحاد اسلامی کے خواب دیکھنے والا، میں بھلا کیا حقیقت رکھتا ہوں، خدا آبرو سے رکھے، اور آبرو سے وطن کو واپس لے جائے، آپ میرے لئے یہی دعا کیجئے،

دو سال کے بعد میرے مولا بُلا لے مدینے مجھے آقا کی،

اس دوران میں ایک دو دفعہ لندن بھی گیا، گلیڈس کوپر اور جیرلڈ دی موریر کو ایکٹ کرتے دیکھا، لیکن تھیئٹروں کے متعلق

لیجئے صاحب خدا خدا کر کے تصویر اُٹھانے کا وقت آیا، مگر ہونی شدنی، چچا اُسے اُٹھا کر ذرا وزن کا اندازہ کر رہے تھے، کہ ہاتھ سے چھوٹ گئی، گر کر شیشہ کرچی کرچی ہو گیا، یہی ہے، کہہ کر سب ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے، چچا نے کچھ خفیف ہو کر کرچوں کا معائنہ شروع کر دیا، وقت کی بات اُنگلی میں شیشہ چُبھ گیا، خون کی تُلّی بندھ گئی، تصویر کو بھول اپنا رومال تلاش کرنے لگے، "رومال کہاں سے ملے؟ رومال تھا شیروانی کی جیب میں، شیروانی اُتار کر نہ جانے کہاں رکھی تھی" اب جناب گھر بھر نے تصویر ٹانگنے کا سامان تو طاق پر رکھا اور شیروانی کی ڈھونڈیا پڑ گئی، چچا میاں کمرے میں ناچتے پھر رہے ہیں، کبھی اس سے ٹکّر کھاتے ہیں، کبھی اُس سے" سارے گھر میں سے کسی کو اتنی توفیق نہیں کہ میری شیروانی ڈھونڈھ نکالے، عمر بھر ایسے نکمّوں سے پالا نہ پڑا تھا، اور کیا جھوٹ کہتا ہوں کچھ؟ چھ چھ آدمی ہیں اور ایک شیروانی نہیں ڈھونڈ سکتے، جو ابھی پانچ منٹ بھی تو نہیں ہوئے، میں نے اُتار کر رکھی ہے، بھئی بڑے ———"

اتنے میں آپ کسی جگہ سے بیٹھے بیٹھے اُٹھتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ شیروانی پر ہی بیٹھے ہوئے تھے، اب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں" ارے بھئی رہنے دینا، رہنے دینا مل گئی شیروانی، ڈھونڈ لی ہم نے، تم کو تو آنکھوں کے سامنے بیل بھی کھڑا ہو، تو نظر نہیں آتا ہے"

آدھے گھنٹے تک اُنگلی بندھتی بندھاتی رہی، نیا شیشہ منگوا کر چوکھٹے میں جڑا، اور تمام قصّے طے کرنے پر کہیں دو گھنٹے بعد پھر تصویر ٹانگنے کا مرحلہ درپیش ہوا۔ اوزار آئے سیڑھی آئی، چوکی آئی، شمع لائی گئی، چچا جان سیڑھی پر چڑھ رہے ہیں، اور گھر بھر (جس میں ماما اور کہاری بھی شامل ہیں) نیم دائرے کی صورت میں امداد دینے کو کمیل کانٹے سے لیس کھڑا ہے، دو دو آدمیوں نے سیڑھی پکڑی، تو چچا جان نے اس پر قدم رکھا، اوپر پہنچے، ایک نے کرسی پر چڑھ کر میخیں بڑھائیں، ایک قبول کر لی، دوسرے نے ہتھوڑا اوپر پہنچایا سنبھالا ہی تھا، کہ میخ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی، سنّی ہوئی آواز میں بولے" اے لو، اب کمبخت میخ چھوٹ کر گر پڑی، دیکھنا کہاں گئی"؟

اب جناب سب کے سب گھٹنوں کے بل ٹٹول ٹٹول کر میخ تلاش کر رہے ہیں، اور چچا میاں سیڑھی پر کھڑے مسلسل بڑبڑا رہے ہیں۔ "ملی؟ ارے کم بختو ڈھونڈی؟ اب تک تو میں سو مرتبہ تلاش کر لیتا۔ میں اب رات بھر یوں ہی سیڑھی پر کھڑا کھڑا سوکھا کروں گا۔ نہیں ملتی تو دوسری ہی دیدو، اندھو!"

یہ سُن کر سب کی جان میں جان آتی ہے، تو پہلی میخ ہی مل جاتی ہے، اب میخ چچا جان کے ہاتھ میں پہنچاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے اس عرصے میں ہتھوڑا غائب ہو چکا ہے۔

"یہ ہتھوڑا کہاں چلا گیا؟ کہاں رکھا تھا میں نے؟ لاحول ولا قوۃ! اُلّو کی طرح آنکھیں پھاڑے میرا مُنہ کیا تک رہے ہو! سات آدمی اور کسی کو معلوم نہیں ہتھوڑا میں نے کہاں رکھ دیا" بڑی مصیبتوں سے ہتھوڑے کا سراغ نکالا، اور میخ گاڑنے کی نوبت آئی، اب آپ یہ بھول بیٹھے ہیں، کہ ناپنے کے بعد میخ گاڑنے کو دیوار پر نشان کس جگہ کیا تھا؟ سب باری باری کرسی پر چڑھ کر کوشش کر رہے ہیں، کہ شاید نشان نظر آجائے ہر ایک کو الگ الگ جگہ نشان دکھائی دیتا ہے، چچا سب کو باری باری اُلّو گدھا کہہ کہہ کر کرسی سے اُتر جانے کو کہہ رہے ہیں۔ آخر پھر جریبی لی اور کونے سے تصویر ٹانگنے کی جگہ کو دوبارہ ناپنا شروع کیا، مقابل کی تصویر کونے سے پینتیس ۳۵ انچ کے فاصلے پر لگی ہوئی تھی "بارہ اور بارہ اور بارہ اور تین انچ اور"؟ بچّوں کو زبانی حساب کا سوال ملا، آواز بلند حل کرنا شروع کیا، اور جواب

نکالا، توکسی کا کچھ تھا، اورکسی کا کچھ، ایک نے دوسرے کو غلط بتایا، اسی تو تو مَیں مَیں میں سب بھول بیٹھے، کہ اصل سوال کیا تھا۔ نئے سرے سے ماپ لینے کی ضرورت پڑ گئی +

اب کے چچا جفتی سے نہیں ماپتے، سُتلی سے ماپنے کا ارادہ رکھتے ہیں، سیڑھی پر پینتالیس ۴۵ درجے کا زاویہ بنا کر سُتلی کا سرا کونے تک پہنچانے کی کوشش میں ہیں، کہ سُتلی ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے، آپ لپک کر اُسے پکڑنا چاہتے ہیں، کہ اسی کوشش میں زمین پر آرہتے ہیں، کونے میں ستار رکھی ہے، جس کے تمام تار چچا جان کے بوجھ سے یکلخت جھنجھنا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں +

اب چچا کی زبان سے جو منجھے ہوئے الفاظ نکلتے ہیں سُننے کے قابل ہوتے ہیں، مگر چچی روک دیتی ہیں، اور کہتی ہیں "اپنی عمر کا نہیں تو کچھ ان بچوں ہی کا خیال کرو" +

بہت دشواری کے بعد چچا جان از سر نو میخ گاڑنے کی جگہ معیّن کرتے ہیں، بائیں ہاتھ سے اس جگہ میخ رکھتے ہیں اور دائیں ہاتھ میں ہتھوڑا سنبھالتے ہیں، پہلی ہی چوٹ جو پڑتی ہے تو سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے پر، آپ سی کر کے ہتھوڑا چھوڑ دیتے ہیں، وہ نیچے آکر گرتا ہے، کسی کے پاؤں پر 'ہائے ہائے' اور 'افوہ' اور 'مار ڈالا' شروع ہو جاتی ہے +

چچی جل بھُن کر کہتی ہیں "یوں میخ گاڑنی ہوا کرے، تو مجھے آٹھ روز پہلے خبر دیدیا کیجئے، میں بچوں کو لے کر میکے چلی جایا کروں، اور نہیں تو" +

چچا کچھ نادم ہو کر جواب دیتے ہیں" یہ عورت ذات بھی بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہے، یعنی ہوا کیا، جس پر یہ طعنے دئیے جا رہے ہیں؟ بھلا صاحب کان ہوئے، آیندہ ہم کسی کام میں دخل نہ دیا کرینگے" +

اب نئے سرے سے کوشش شروع ہوئی، میخ پر دوسری چوٹ جو پڑی، تو اُسی جگہ کا پلستر نرم تھا، پوری کی پوری میخ اور آدھا ہتھوڑا دیوار میں اور چچا اچانک میخ گڑ جانے سے اس زور سے دیوار سے ٹکرائے، کہ ناک غیرت والی ہوتی تو پچک ہی کر رہ جاتی +

اس کے بعد از سر نو جفتی اور ستّی تلاش کی گئی، اور میخ گاڑنے کی نئی جگہ مقرر ہوئی، اور کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ خدا خدا کر کے تصویر ٹنگی، وہ بھی کیسی، ٹیڑھی بینگی اور اتنی جھکی ہوئی کہ جیسے اب سر پر آئی، چاروں طرف گز گز بھر دیوار کی یہ حالت گویا چاندماری ہوتی رہی ہے، چچا کے سوا باقی سب تھکن سے چور چور، نیند میں جھوم رہے ہیں، اب آپ آخری سیڑھی پر سے دھم سے جو اُترتے ہیں، تو کہاری غریب کے پاؤں پر پاؤں، غریب تھی، تڑپ ہی تو اُٹھی، چچا اس کی چیخ سُنکر ذرا سراسیمہ تو ہوئے، مگر پل بھر میں ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر بولے "اتنی سی بات تھی، لگ بھی گئی، لوگ اس کام کے لئے مستری بلوایا کرتے ہیں" +

(ماخوذ از جیروم کے جیروم)

سیّد امتیاز علی تاج

اَرواحِ خبیثہ اَور شیخ سلامت

"بارات کے ساتھ"

اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون، مگر آپ کا قصور نہیں بلکہ نئی روشنی کا قصور ہے، صاحب بھوت تو کیا ہیں، اگر آپ خدا و رسول، حشر و نشر، جنّت و دوزخ کے وجود سے انکار کر دیں، تو کون کہنے والا ہے۔ اور کسے پڑی ہے، کہ خواہ مخواہ بیچ میں بول کر خدا واسطے کا بیر لے، بیٹھے بٹھائے گئو بنے، ناحق مطعون ہو، اور سچ بھی یہ ہے کہ زمانہ کے اقتضا کے مطابق اپنے خیالات بدلتے رہنا چاہئے، بھلا فلسفہ و سائنس، منطق و نفسیات انگریزی گٹ پٹ اور سب سے بڑھ کر تار، ریل، موٹر، ہوائی جہاز، بے تار کی تار برقی ٹیلیفون وغیرہ کی موجودگی میں مذہب جیسی فرسودہ چیز کی طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے، اور اگر بفرض محال ہو بھی تو فرصت کسے ہے، جب مذہب ہی کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہیں ہے، تو بھوت اور بھوتوں کے وجود کی اس ہجوم مشاغل میں بھلی چلائی، رات تھوڑی سوانگ بہتیرے!

ہائے ہم قدیم زمانہ کو روتے ہیں، کیسے بھولے بھالے لوگ کیسے سیدھے سادے انسان تھے، مذہب کے پابند، نیکیوں پر کاربند، اب تو دنیا نئے سنئے تماشے دکھاتی ہے، ان نئی روشنی والوں سے اللہ پناہ میں رکھے، ان کی خلقت ہی طرفہ معجون ہے، ہوائی جہاز پر اعتقاد اور تخت سلیمانی کے منکر! بندوق پر یقین اور معجزہ سے انکار! ٹیلیفون پر ایمان اور وحی کا بطلان! جلّ جلالہٗ! یہ اس قسم کی مضحکہ انگیز باتیں کرتے ہیں اور اسّی سالہ شیخ سلامت اپنے سقف شگاف قہقہوں کو یکے بعد دیگرے اپنی ریش سپید میں جذب کرتا جاتا ہے!!

اب ہم کس سے کہیں کہ یہاں ساری عمر ہی بھوتوں کے ساتھ داؤ پیچ میں گذری ہے، آپ کو یہ تک تو معلوم نہیں ہوگا کہ بھوتوں کی کتنی اقسام ہیں، ڈاکی جو بچوں کا کلیجہ کھایا کرتا ہے، خبیث جس کا سر کٹا ہوا ہوتا ہے، چڑیل جو ناک میں بولتی ہے، چھل پائیان جن کے پاؤں پھرے ہوتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر پیپل تلے کا مُجھنا جس کے لئے سید انشا نے کہا ہے کہ، پیپل تلے کے مُجھنے کی، شیطان کی قسم! وقس علیٰ ہٰذا، مگر کہنا اس سے جانئے جو مانے، جو سرے ہی سے منکر ہے اُس سے کہنا اپنا پھیپھڑا خراب کرنا ہے اندھے کے آگے رُوئے اور اپنی ہی آنکھیں کھوئے، معاف فرمائیگا!

خیر اب آپ اصرار فرماتے ہیں تو الامر فوق الادب کا خیال کرتے ہوئے سب تو کیا ایک آدھ بھوتوں کا تجربہ اپنے ساتھ بیان کئے دیتا ہوں، گو جانتا ہوں، کہ آپ بفرض محال مان بھی جائیں تو دیگر شرفاء مجلس جو خدا چشم زخم سے بچائے، سب انگریزی تعلیم یافتہ ہیں اپنے جنون عالی فہمی میں کیوں ماننے لگے، مگر خیر —— خیر!!

خدا نواب متن کو غریقِ رحمت کرے، اپنے بیٹوں کی شادی اس شان سے کی کہ بادوشاید، شادیوں میں اتنا زرِ کثیر و مالِ خطیر اس بیر زمین گیر نے خرچ ہوتے ہوئے بہت کم دیکھا ہے مجھ سے تو خیر انہیں خصوصیت تھی اور مجھے جنک ساتھ نہ لے دیتے "تفریح کے لئے گھر سے ایک قدم باہر نہیں نکالتے تھے ——— میرا تو کیا ذکر جبکہ اُنہوں نے ہر کس و ناکس کو جس سے ذرا بھی ایک سلیک تھی بارات کے ساتھ مدعو کیا تھا، چنانچہ گاڑی جب الہ آباد پہنچی تو اسٹیشن پر براتیوں کا اتنا ہجوم غفیر تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا، کئی خوانچہ والوں کے خوانچے اُلٹ گئے، اسٹیشن کے تمام ملازمین حواس باختہ تھے، اور ٹکٹ بابو کا ہاتھ ٹکٹ لیتے لیتے شل ہوگیا تھا۔ مگر اس بدگمانی کو دیکھئے کہ دروازہ روکے ڈٹا کھڑا ہے، اور بغیر ٹکٹ دیکھے نکلنے نہیں دیتا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میر چھبن کے لڑکے نے ٹکٹ بابو کے پیچھے آکر بتلی اُستاد سے ایک چلتی ایک حرکت کی اور اُس نے پیچھے مُڑکر دیکھا تو ایک ریلا کا ریلا دروازہ کے پار ہوگیا تھا، اب ان بابو سے کوئی پوچھے کہ بھلا اس تنگ طلبی سے کیا فائدہ ہوا، ٹیپ الگ پڑی اور دھکم پیل میں ہاتھ الگ کچلا گیا، مگر کرتا کیا، صرف دیدے غریر کے رہ گئے!!

ممکن ہے دوسرے براتیوں کو کسی قسم کی تکلیف ہوئی ہو، مگر ہم چونکہ خاص لوگوں میں تھے ——— صاحب! ذری لطف فرماکر یہ انگیٹھی ادھر سرکا دیجئے، رات کا وقت ہے سردی خوب چمک رہی ہے، اور جوانوں کی بہ نسبت ایک شیخ فانی کو آگ کی ضرورت زیادہ ہونی چاہئے، آپ نے اس بڑھیا کا قصہ ہے جس نے کڑکڑاتی ہوئی سردی میں آگ سے آرام پاکر خدا تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ "اے اللہ دنیا میں تو نے آگ دیکر سردی سے بچایا، اسی طرح عقبیٰ میں بھی آگ دیجیو" یہی حال، ہمارا ہے، دن کی تکلیف کا کچھ نہ پوچھئے

اوّل تو دھوپ میں تابش نہیں، اور اگر ہو بھی تو بوندسا دن، ادھر آفتاب نے مشرق سے سر نکالا، ذرا کی ذرا اپنا رُخِ زیبا چمکایا اور پھر پردۂ ظلمات میں غائب! کرپاس کہنہ ہو رہے ہیں، بدن میں سکت نہ جان، بس ایک ہڈیوں کا جال سمجھ لیجئے، ہائے بڑھاپا!!

مرحوم خواجہ عنایت علی نقش، مغفور مرزا ناظر، میر اولاد حسین خدا ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور دو اور صاحب تھے، جن نام اس وقت میرے پیٹ میں تو ہے مگر زبان پر نہیں آتا، یہ پانچ اور چھٹا میں، یہ ہماری جماعت علیحدہ تھی اور ہمیں بطور اختصاص ایک نہایت آراستہ و پیراستہ پُرفضا کمرۂ قیام کے لئے دیا گیا، کمرہ سے متصل ایک مختصر سا نزہت بار و دلکشا چمن تھا اور ہمارے کمرے کی کھڑکیاں اس باغیچہ ہی کی طرف کھلتی تھیں، دن تو خیر سیر و تفریح میں گزار دیا گیا،

رات کیا آئی قیامت آئی

میری یہ عمر ہونے کو آئی، اسّی سرد بال اور گرمیاں میرے سر پر سے گزر چکی ہیں، اچھا خاصا کڑیل جوان تھا، مگر یہ میری ہمیشہ سے عادت ہے کہ اپنے گھر کے سوائے کسی اور جگہ چین سے نیند نہیں آتی، گرمی کا موسم تھا، میرے ساتھی کھڑکیوں کے سامنے اپنے اپنے پلنگوں پر آرام کی نیند سو رہے تھے مگر میں ہجران زدہ عشاق کی طرح ——— کیوں صاحب انگریزی میں عاشق کو کیا کہتے ہیں؟ لوَر! کیا کیا زبان ہے واللہ! ——— کروٹیں بدل رہا تھا۔

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں
جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

اسی کشاکش میں یکایک میری نظر کھڑکیوں پر جو پڑی تو سُن ہوکر رہ گیا! لالٹین کی دھیمی روشنی میں کیا دیکھتا ہوں

کہ میرے سب ساتھیوں کے سر کٹے ہوئے کھڑکیوں میں رکھے ہیں! ایّہا الحاضرین! میں نے اس کو ببوست بمجول کر کے آنکھیں ملیں میرے خوف وحیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا، جب میں نے اپنے حصّہ کی کھڑکی پر اپنے سر کو بھی کٹا ہوا رکھا دیکھا! ابھی میں سنبھلنے نہ پایا تھا کہ ان سب سروں نے قلقاری مار کر ایک قہقہہ لگایا!

رات اندھیاری تھی، گردوپیش تمام سنّاٹا چھایا ہوا تھا، دور جنگلوں میں سے کبھی کبھی گیدڑوں کی سامعہ خراش آواز آ جاتی اور پھر وہی سنّاٹا، وہی سکوت چھا جاتا، بجائے لایزال! ایسے سنسان سماں میں، اس خشک، ہیبت آفرین، خوفناک قہقہہ کی آواز نے میرے بدن میں ایک کپکپاہٹ دوڑا دی، میرا جسم کانپنے لگا، میرا دل بانسوں اُچھلنے لگا اور پسینہ کی ایک بوند بناگوش کو چھوتی ہوئی گردن پر بہہ گئی!

مگر یہ خوف ایک لمحہ کا تھا اور یہ گھبراہٹ تھوڑی دیر کی، نڈر، دلیر، بیباک شیخ سلامت اور خوف! یہ سالخوردہ شیخ سلامت خفی جتنی تو خوف وہراس کے نام سے کبھی واقف ہی نہیں ہوا، یہ تھوڑی دیر کی گم شدگی بھی صرف اس لئے تھی کہ ناگہانی طور پر یہ منظر پیش ہو گیا تھا، میں دفعتہً اپنے پلنگ پر اُٹھ کر بیٹھ گیا، اور آیت الکرسی پڑھ پڑھ کر پھونکنا شروع کیا، لیکن جب پھر میں نے کھڑکیوں کی طرف دیکھا تو اس دفعہ نئے منظر سے میری آنکھیں دوچار ہوئیں، میں نے دیکھا کہ میرے دوستوں کے سر کھڑکیوں سے غایب ہیں اور اُن کی بجائے دوسری ڈراؤنی شکلیں اپنی لال لال اور آتشیں آنکھوں سے میری جانب نگراں ہیں، دفعتہً ان سروں کو جنبش ہوئی اور وہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھنے شروع ہوئے، یہانتک کہ ایک فٹ بلندی پر معلق ہو کر قایم رہ گئے، میں نے جو غور سے دیکھا تو سروں کے نیچے ایک چھوٹا سا دھڑ نمودار ہو گیا تھا، ننّھے ننّھے ہاتھ پاؤں اور ٹانگیں! بالکل اس طرح جیسے انسانی سر کے نیچے گڑیا کا دھڑ لگا دیا جائے، اور پھر——————

پھر وہی قہقہہ—— پہلے سے زیادہ بلند، وحشتناک مضحکہ آمیز!

میں سمجھ گیا کہ یہ پڑھے ہوئے بھوت ہیں، نوعِ انسانی کی طرح ان میں بھی جاہل اور تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، تعلیم یافتہ ارواحِ خبیثہ کا قاعدہ ہے کہ جب اُن کے دفعیہ کے لئے کچھ پڑھا جائے تو وہ بھی وہی پڑھ کر عمل کے اثر کو باطل کر دیتی ہیں، میں سوچنے لگا کہ ان سے عہدہ برآ ہونے کی کیا ترکیب نکالی جائے، میں انہیں چھیڑ چکا تھا، اور اب باقاعدہ سلسلۂ جنگ شروع ہو جانا لابدی تھا!

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یہ سب بھوت خوفناک شکلیں بناتے ہوئے ہوا پر میری جانب بڑھے، میں نے جھپٹ کر اپنی لکڑی اُٹھا اور مجنونانہ طور پر ہاتھ چلانے شروع کئے، میں بہتیرے پینترے بدل بدل کر وار کر رہا تھا، مگر وہ میرے چاروں طرف منڈلا رہے تھے، اور موقع پا کر کبھی میرے کان پکڑ کر بھینچتے، کبھی بال کھینچتے، کبھی تیز ناخن چبھوتے اور کبھی کاٹ کھاتے، ان کی صورتوں میں یہ نئی تبدیلی اور ہو گئی تھی کہ انکی لمبی لمبی ڈاڑھیاں نکل آتی تھیں، وہ قلقاریاں مار رہے تھے اور حملہ کر رہے تھے، میں جل جل جاتا تھا، اور بنّوٹ کے ہاتھ دکھا رہا تھا، مگر سب بےسود، میرے سب وار وہ کوئی دیکر بچا جاتے تھے، آخرکار میں تھک کر پست ہو گیا، میں نے لکڑی پھینکی اور چادر اوڑھ کر اور چاروں طرف سے خوب زور کے ساتھ لپیٹ کر لیٹ گیا، مگر وہ کب چھوڑنے والے تھے، میرے سینہ، پیٹ، منہ پر دھما چوکڑی مچاتے رہے، دفعتہً وہ سب میری چادر کو لپٹ گئے اور اُتار کر دُور پھینک دی،

میں پھر بھی آنکھیں بند کئے پڑا رہا، اُنہوں نے میرے پپوٹے کھینچ کھینچکر آنکھیں کھولنی شروع کیں، میں دق ہوکر اُٹھ بیٹھا، اور وہ ہنستے ہوئے دور دور بھاگ گئے یکایک ان میں سے چار آکر میرے پلنگ کے پایوں سے آکر لپٹ گئے اور اسے ہوا میں اُٹھالیا، باقی ماندہ دوغایب ہوگئے اور پل بھر میں بڑے بڑے بچھو ہاتھ میں لئے ہوئے لوٹے اور میرے اوپر سنجیدگی سے ہلانا شروع کیا، میں چپ بیٹھا ہوا یہ تماشا دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد وہ پلنگ لیکر آگے بڑھے، اور دروازہ کے پاس پلنگ لیجاکر اُتار دیا، میں خوشی سے اُٹھا اور پلنگ کھینچکر اپنی جگہ پر لے آیا، پھر میرے لیٹنے کے ساتھ ہی اُنہوں نے اسی اہتمام کے ساتھ پلنگ اُٹھایا اور وہیں لیجاکر رکھ دیا، میں پھر پلنگ کھینچ لایا، جب تیسری بار میں پلنگ کھینچنے لگا تو وہ سب پلنگ کے ایک طرف چمٹ گئے اور انتہائی کوشش کے باوجود میں پلنگ کو ایک انچ بھر نہ سرکا سکا، میں مجبور ہوکر وہیں لیٹ گیا، اور اُنہوں نے میرے بدن کو اپنا بازیچہ بنالیا، میرے سب دوست اطمینان سے سو رہے تھے اور میں اپنی غنودہ بختی پر ماتم کر رہا تھا، ساری رات وہ مجھے اسی طرح دق کرتے رہے، خدا خدا کرکے صبح ہوئی اور مُلّا صاحب کی اذان کے ساتھ ہی مجھے اس مصیبت سے نجات ملی*

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

رات کی واردات نے میرے تمام بدن میں وجع المفاصل کی سی کیفیت پیدا کردی تھی، میں نے دن بھر سونے میں گذارا اور شام کو اپنا سامان خود نواب صاحب کی قیام گاہ پر اُٹھوا منگوایا*

یہ ہے وہ سانحہ جو الہ آباد میں اس بوڑھے نیازمند کے ساتھ پیش آیا، اب کیا فرماتے ہیں حضرات منکرین بھوتوں کے عدم وجود کے مسئلہ میں؟ بیّنوا و توجروا!!

آپ ہنستے ہیں، ہنسئے، مگر ازراہِ کرم مکھی کی لات کا خیال رہے، کہیں بتّیسی کھونڈی نہ ہوجائے، صاحب من! آپ ہنس رہے ہیں لیکن اگر آپ کے اوپر یہ سانحہ گذرا ہوتا تو دانت نکالنے کا طریقہ یہ نہیں ہوتا ——— قسم کلام اللہ کی!

(اجمیر) رفیقی

ظرافت

دو باکمال

ایڈی ایک مشہور ایکٹر تھا، جو اپنی قابلیت کے جوہر نیو یارک کی اسٹیج پر دکھلا رہا تھا، جونز مضافات کا مشہور ایکٹر تھا، جب جونز نیو یارک میں آیا تو ایک بڑے تھیئٹر کے سامنے کھڑا ہوکر اشتہارات تمثیلی تصاویر اور اخبارات کی آراء کو جو ایک تختہ پر سلیقہ سے چسپاں کی گئی تھیں پڑھنے لگا۔ ان میں ایڈی کی بے حد تعریف کی گئی تھی*

جب جونسن مصروف مطالعہ تھا تو اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان کنکھیوں سے اُس کی حرکات کا مطالعہ کر رہا ہے،
آخر میں جونسن نے اُس سے مخاطب ہوکر پوچھا:۔

جونسن، کیا آپ نے یہ کھیل کبھی دیکھا ہے؟

نوجوان، یقیناً

جونسن، کیا ایڈی کچھ اچھا ایکٹر ہے؟

نوجوان، کچھ اچھا ایکٹر! وہ تو بہترین ایکٹر ہے، اُسے دیکھ کر تماشائی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں —— مجھے عمر بھر ایسا ایکٹر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا +

جونسن، کیا وہ جونسن سے بھی اچھا ہے؟

نوجوان، جونسن! چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک، جونسن غم والم کا مرقع، ایڈی پیکرِ تمسخر، مجھے افسوس ہے کہ تم نے دونوں میں موازنہ ہی کیوں کیا +

جونسن نے اب آخری حربہ استعمال کرنا چاہا +

"دوست میرا نام جونسن ہے"

مگر نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا:۔

"کچھ مضائقہ نہیں میں جانتا ہوں کہ تم جونسن ہو، اور میں ایڈی ہوں" + (ترجمہ)

نیویارک آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا شہر ہے، وہاں اسقدر اژدہام ہوتا ہے کہ چلنا پھرنا مشکل ہوجاتا ہے، ٹریم کاڑیوں اور موٹروں میں آدمی اوپر تلے بیٹھے ہوتے ہیں، اس بھیڑ کا اندازہ ذیل کے واقعہ سے ہوسکتا ہے:۔

ایک پستہ قد امریکن آدمیوں کی اس بھیڑ میں گھسا بیٹھا تھا، یکایک اُسے جیب کتروں کا خیال آیا، ساتھ ہی اُسے اپنے اُور کوٹ کی جیب میں روپے یاد آئے، اُس نے جلدی سے ہاتھ جیبوں میں ڈال لئے، لیکن اُس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، جب پاس بیٹھے ہوئے ایک "الفربہ متعبر" نے چلا کر کہا:۔

فربہ، اہا، اب تم پکڑے گئے +

پستہ قد، چھوڑو میرا ہاتھ +

فربہ، جیب کترا!

پستہ قد، پاجی، بدمعاش، کیا بکتے ہو +

اس وقت ایک تیسرے آدمی نے جو بہت قد آور تھا اپنے اخبار سے نگاہ اُٹھا کر کہا:۔

"اگر تم دونوں میری جیبوں سے ہاتھ نہیں نکال لوگے تو میں یہاں سے اُٹھ جاؤنگا +

(ترجمہ)

Art Supplement.

یہ کتاب چوہدری بشیر حسین ضیائی مرحوم (ایم۔ اے علیگ) کے اس ذخیرۂ کتب کی جو اس کتب خانے کو عطیہ کیا گیا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ مرحوم کیلئے دعائے مغفرت فرمائیں۔ شکریہ!

فراغت کا آئینہ خانہ

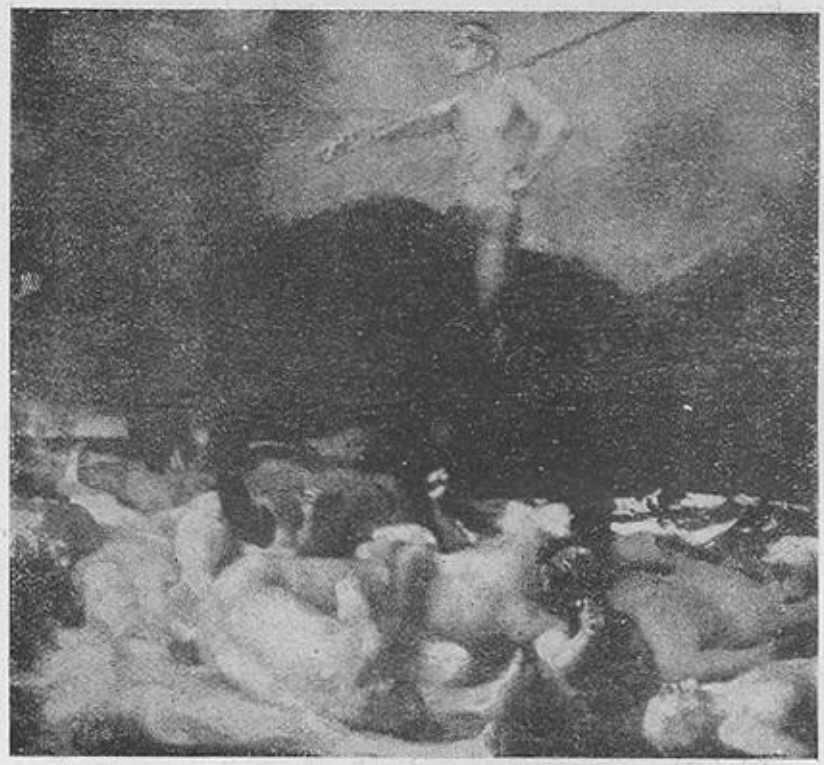

جنگ

قاصد بہار

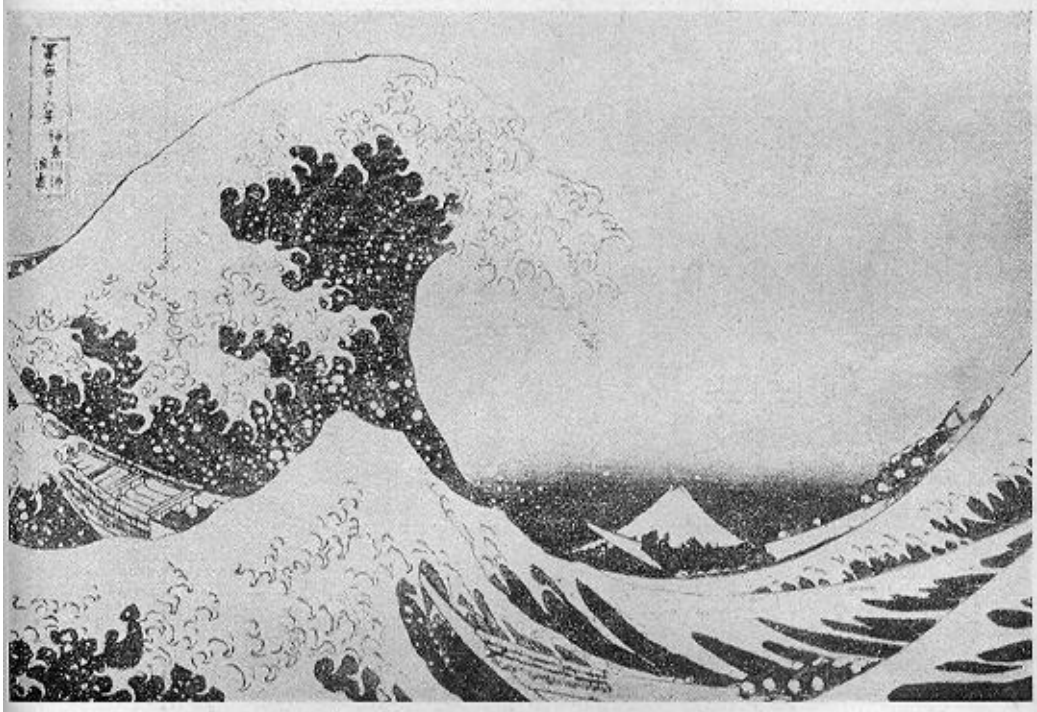

سمندر کی موج

ٹرین میں گفتگو کرنے اور گفتگو روکنے کا فن

از جناب محمد دین صاحب تاثیر ایم اے

(خاص برائے نیرنگ خیال)

ٹرین میں لوگوں سے گفتگو کرنے اور نہ کرنے کے دو شیوے ہیں، ایک گفتگو کرنے اور سننے کا اور ایک نہ کرنے اور نہ سننے کا یہ مضمون قدرتاً دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے جنہیں مجموعی طور پر الکلام والسکوت کما یشاء کہا جا سکتا ہے، یعنی اپنی مرضی کے مطابق کسی کو باتوں میں لگانا یا چپ کرا لینا +

مگر یہ محض عنوانات ہیں، فن پھر فن ہوتا ہے، اور فن ایک نہایت ہی پیچیدہ اور اُلجھی ہوئی شے ہے، اس فن کے لئے تو بالخصوص بڑی حکمت درکار ہے، بہرحال میں چند مجرّب اور سینہ بسینہ نسخہ جات پیش کئے دیتا ہوں، اس سے میرا مدعا محض خلقِ خدا کا فائدہ ہے اور بس +

ان مجرّب اعمال کی ابتدا آسان ترین جزو سے کرتا ہوں، اور وہ ٹرین میں گفتگو کرنے کے تمنائیوں کو چپ کرانا ہے، ناتجربہ کاروں کا طریقہ نہایت گرا ہوتا ہے، یعنی بہت مختصر جواب دینے ، تیوری چڑھانے، کتاب پڑھتے رہنا، کتاب کے حاشیہ پر غصّے سے لکھنا شروع کر دینا وغیرہ وغیرہ تم سب یہ کیا کرتے ہو، مگر یہ سب پرلے درجہ کی بدتمیزی ہے اس سے تمام گاڑی کی فضا خراب ہو جاتی ہے، اور مصیبت تو یہ ہے کہ اس میں عموماً ناکامیابی ہوتی ہے، اگر تین چار آدمی گفتگو کرنے پر تلے ہوئے ہوں، تو پھر یہ بے فائدہ ہے

پہلا اور بہترین طریقہ (مگر اس کے لئے ہمت درکار ہے) ہر بات کی مخالفت کرنا ہے۔ دشمن کہتا ہے "معلوم ہوتا ہے بارش ہوگی" تم جسقدر تندی سے کہہ سکتے ہو کہو "ہرگز نہیں" اس پر شریف سے شریف آدمی گرم ہو کر کہیگا "اچھا، تو نہیں ہوگی" تم جواب میں کہو "نہیں! میں کہتا ہوں ہرگز نہیں" اُمید ہے کہ اس کے بعد وہ گُم سُم ہو جائے گا، لیکن اگر وہ شروع رہے، مثلاً "میں نے اس طرح کے بادل ہمیشہ برستے ہی دیکھے ہیں" جواب دو "ہوں" دیکھے ہیں، تم نے، ہوں" اگر وہ ضدی اس پر بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑے اور اسی قسم کا جواب دے "ہاں! میں نے دیکھے ہیں" تو تمہارا راستہ صاف ہے، فوراً کہو "اچھا تو میں اس پر مزید بحث کرنے کے لئے تیار نہیں" اگر تم محسوس کرو کہ تم میں ایسا کہ وہ کام کرنے کی ہمت نہیں (مگر یاد رکھو کہ بڑی بڑی عزتیں بنی نوع انسان کی تکلیف کو نظرانداز کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں) تو پھر ایک طریقہ ہے جو میں تمہیں بتائے دیتا ہوں: اسے خود ستائی کہتے ہیں، یہ انکسار سے ارفع تر مقام ہے، انکسار اُلٹا گفتگو خیز ہوتا ہے، اس لئے یہ بالکل بے خطا حربہ نہیں، مثلاً کوئی شخص آپ کو کہتا ہے "آپ ماشاء اللہ بہت قابل شخص ہیں" یہ محض مثال ہے، اگر آپ جواب میں کہیں کہ "میں کس لائق ہوں" تو ضرور ہے کہ جو شخص اسقدر احمق ہے کہ وہ آپ کی تعریف کرتا ہے، وہ پھر پہلا فقرہ اضافہ کے ساتھ دُہرائیگا +

میں پھر وہی پہلی صورت لیتا ہوں، دشمن اقدام کرتا ہے "بارش ہوگی!" تم آہ بھر کر کہتے ہو "ہاں میری بدقسمتی!" دشمن "بدقسمتی کیوں!" (تم زہرخند ہو کر) اس لئے کہ جب بارش

ہوتی ہے میں بہک جاتا ہوں"۔

اس پر یہ دیکھتے ہوئے کہ شراب پینے والا مذہبی نقطۂ نگاہ سے بہت بُرا سمجھا جاتا ہے، وہ شخص کچھ پرے کھسک جائیگا اور یقیناً اُس کے دل میں بدترین شکوک پیدا ہونے لگیں گے اب آپ اطمینان کے ساتھ ٹائمز آف انڈیا، پیام جاناں، اہل حدیث یا نیرنگِ خیال پڑھئے یا جو کچھ آپ نے اپنی گرہ سے مال دے کر خریدا ہو، اس سے مطالعہ کے بعد باقی کا دن خاموشی سے گذار دیئے۔

فرض کیجئے کہ اتفاق سے ٹرین قادیان شریف کی طرف جارہی ہے، اور آپ کا ساتھی اس پر بھی چُپ نہیں ہوتا، اور تبلیغاً کہتا ہے "کیوں صاحب آپ اس بُری عادت کو ترک نہیں کرسکتے" تو کہئے "یہ ناممکن ہے، یہ آبائی عادت ہے، اور ایک مرض کی طرح میرے ورثہ میں آئی ہے" کہئے کہ آپ خود محسوس کرتے ہیں کہ آپ تباہ و برباد ہورہے ہیں، مگر صدیوں کی عادت برسوں میں کیسے جاسکتی ہے" اگر وہ کج بحثی سے باز نہ آئے اور ذاتی تجربات کی بنا پر آپ کو قائل کرنا چاہے تو نہایت مظلومانہ صورت بنا لیجئے اور کہئے کہ "آپ بالکل ناامید ہوچکے ہیں" اگر وہ اب بھی اڑا رہے تو پھر رحمت بن جاؤ، سٹیج پر آجاؤ، دونوں ہاتھوں کو مٹھی بنا کر سینے پر دے مارو، چیخو، چلاؤ، غرض اُس کے لئے زندگی ناقابل برداشت بنادو، مجھے آجتک کوئی آریہ سماجی بھی ایسا نہیں ملا جس کے لئے اس انتہا تک جانا پڑے، پہلے پہل عموماً ایسی ایک ہی اخلاقی کمزوری کا بیان کافی ہوتا ہے، گو قصے کو جلد ہی ختم کرنے کے لئے آپ دو تین چار پانچ اس قسم کی روئدادیں سنا سکتے ہیں تو شمن یقیناً پسپا ہوجائیگا، بلکہ الٹی ملاقات کوشش کرنے لگیگا۔

ایک اور طریقہ جو زیادہ خطرناک مگر نہایت ہی مفید ہے یہ ہے کہ پاگل بن جاؤ، خان صاحب مرحوم کی طرح سے یہ ضروری نہیں کہ جونہی ٹرین میں کوئی شخص اُن سے مخاطب ہوا، اُنہوں نے جھٹ پٹ جیب سے ایک سرحدی چھرا نکالا، اور اُسے جوتے کے تلے پر ایک نظر چھرے پر اور ایک نظر دشمن پر ڈالتے ہوئے نہایت تندی سے تیز کرنا شروع کردیا، میرے خیال میں ایک بے ربط جواب ہی کافی ہے۔

دشمن کہے "بارش ہوگی" تم عیارانہ انداز سے تلا کے کہو "بجا بجا، ٹھیک" پھر چٹخارے لینے لگو، اور آنکھوں کو گھماؤ، حریف فوراً بھاگ نکلیگا، اگر یہ مداخانہ فعل ناکافی ہو اور وہ گھبرا کے پوچھتا ہے کہ آپ کو بارش ناپسند ہے، تو اُس پر جھک پڑو اور پرمعنی نگاہوں سے اور آنکھوں کو حرکت دے کر کہو "نہیں مجھے! مجھے تو نہایت مرغوب ہے، اور اس کی وجوہ ہیں"۔

اس وقت میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں باقی چار گفتگو توڑ طریقوں کو بیان کروں، کیونکہ اب مجھے متعلقہ فن پر بھی کچھ کہنا ہے، یعنی یہ فن کہ چپ رہنے پر مستعد لوگوں کو کس طرح سے باتیں کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

پہلا اور نہایت ہی کھرا طریقہ میرا اپنا آزمودہ نہیں، لیکن ایک بڑے اہل فن کا بتایا ہوا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بچارا چپ رہنے پر کسقدر تُلا ہوا ہوگا سے مجبوراً مُہرِ سکوت توڑنی پڑتی ہے، لیکن اس کام کے لئے ایک ساتھی کا ہونا ضروری ہے، کوئی ساتھی مہیا نہ ہوسکے تو خیر کوئی معمر سا ہمسفر لے لیجئے اور اُسے مخاطب کرکے کہئے:

"اچھا ہوا مہاتما گاندھی نے عبدالرشید کو اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا، اس خوفناک مسئلہ کا حل یہی تھا" مخاطب آپ کا رازداں ہے تو اُسے کہنا چاہئے کہ گو وہ نہیں جانتا کہ مہاتما گاندھی اور عبدالرشید کون لوگ ہیں، لیکن یہ حل اُسے بھی پسند آیا ہے،

(اگر مخاطب کوئی ناواقف ہے تو وہ اس کی تردید کرے گا اس پر آپ خوب شور اور واویلا کیجئے، بے نقط سنائیے قسمیں کھائیے، اور کہئے کہ آپ ابھی ابھی دہلی سے آرہے ہیں اور ان آنکھوں سے عبدالرشید کا جنازہ اُٹھتے دیکھا ہے ان آنکھوں کے سامنے مہاتما گاندھی کا جلوس آرہا تھا دونوں کی چاندنی چوک میں مُٹ بھیڑ ہوگئی، گھنٹوں خشت باری ہوتی رہی، پھر کچھ دیر تماشا دیکھ کر پولیس بھی آگئی اور تمام فسادی بھاگ گئے، اور چاندنی چوک میں عبدالرشید کا جنازہ اور پھولوں کے ہاروں میں جکڑے ہوئے مہاتما گاندھی اکیلے رہ گئے ..... غرض جو منہ میں آئے بکتے جاؤ (معاف رکھئے میں ذرا بے تکلف آدمی ہوں، اتنک آپ آپ کہتا رہا ہوں اور تنگ آگیا تھا، پھر میں نے سوچا کہ اب کافی دوستی ہوگئی ہے آپ خفا ہوتے ہیں تو اچھا میں ...) ایسا جلا سخت سے سخت خندق نشین کو بھی باہر نکال پھینکے گا، خاموش ترین شخص بھی اس صریح کذب بیانی اور ناممکن الوقوع حادثہ پر چلّا اُٹھیگا، جب مچھلی کانٹے سے چھیڑ شروع کردے، پھر اُس سے خوب کھیلئے، آہستہ آہستہ تدریجاً قائل ہوتے جائیے، اسے یونہی جھٹکا دے کر ساحل پر نہ لے آئیے، پہلے اچھی طرح سے تھکا لیجئے، غرض ٹکٹ کی قیمت پوری کر لیجئے +

ایک اور ترکیب ہے مگر وہ ایسی اچھی نہیں، یہ کہ دروازے کو مضبوطی سے پکڑ کر کھڑکی سے باہر جھانک کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگو، پھر یکایک چلّا اُٹھو "یا الٰہی خیر" مگر یہ جبھی کارگر ہوگی کہ تمہارا سادھ کھڑکی سے باہر نکلا ہو، تمہارا شکار یہ سمجھے گا کہ کوئی حادثہ ہونے والا ہے اور گھبرا کر پوچھے گا، اور شاید نہایت بے تکلفانہ انداز سے پوچھے، تم اب اطمینان کا سانس لے کر کہو، الحمدللہ مصیبت ٹل گئی، جو چاہے جھوٹ گھڑ لو، مقصد دوسرے شخص کو جھنجھوڑنا تھا، اب وہ خود بخود بولنے لگیگا، تم اسے ایک نہایت ہی دلچسپ داستان کسی ٹکر یا کسی جنگلی بھینسے کے انجن سے ٹکرانے وغیرہ کا مفصل حال سنا دو، اور جھوٹ موٹ کہدو کہ تم خود اُس میں شریک تھے، اگر اُسے اخبار پڑھنے کا مرض ہے تو بہتر ورنہ وہ خود اپنے چچا کے بیان کردہ حالات سنائے لگیگا، یہ بھی جھوٹ ہی ہوگا، مگر اب میدان کارزار گرم ہوچکا ہوگا، خوب دل کے ارمان نکالو +

ایک اور طریقہ بھی ہے، مگر یہ اسقدر پیش پا اُفتادہ مضمون ہے کہ میں اُس کی سفارش کرنے سے گریز کرتا ہوں، یکایک بیمار بن جاؤ، ٹرین کے مسافر دیگر بنی نوع انسان کی طرح پتھر دل نہیں ہوتے، کوئی چیخنے چلّانے کی ضرورت نہیں، ایک یا دو دفعہ ہائے وائے کیجئے، اور بس، اور تحقیق کون جانتا ہے کہ کس گدڑی پوش کی آستین میں برانڈی کی بوتل چھپی ہوئی ہو کیونکہ آستینوں کے اور دل کے چھپے ہوئے حالات سے انسان بالکل بے خبر ہے، جب تمہاری حالت بہتر ہو جائے گی اور تم ایک دوسرے کے اسقدر دوست بن جاؤ گے، اور اس کے بعد وہ بقیہ بوتل ہے بس ..... فاصبحتم بنعمتہ اخواناً +

ایک اور ترکیب ہے اور پہلی سے ملتی جلتی ہے، مگر یہ بنا تہ ایک مستقل باب ہے، وہ یہ ہے کہ جب ٹرین ایک لمبے بے روک سفر پر چل پڑے، مثلاً ٹرین احمد آباد سے بمبئی کی طرف جارہی ہے، اور تم مزے سے سیٹ میں بیٹھ کر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہو "جگہ اچھی مل گئی اب آرام سے دہلی پہنچ جاؤنگا" دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں خواہ وہ بہرا ہی کیوں نہ ہو جو اس چال میں نہ آجائے، اور بلبلا نہ اُٹھے، اور اپنے تئیں غلطی پر سمجھنے نہ لگے، یہ سن کر کہ ٹرین دہلی نہیں جارہی بلکہ بمبئی کی طرف جارہی ہے، تم اُس

زنجیر کی طرف لے تا با نہ جھکو جس کا ہرجانہ پچاس روپے ہے اگر تم مناسب آہستگی سے کام لوگے تو حریف تمہیں فوراً پکڑ لیگا اب تم اس کا کہا مان لو اور اُس سے اُن خطرناک نتائج کا تذکرہ کرو جو وقت پر دہلی نہ پہنچنے کی صورت میں پیش آئینگے، غرض بمبئی تک رات خوب مزے سے کٹیگا، اگر تم اس گفتگو کو دولت کی طرف لے آؤ تو پھر نتائج اور بھی خاطر خواہ ہونگے، کیونکہ نوع انسانی کے تین ہی محرکات ہیں، بھوک، حرص اور خوف، بھوک ہر وقت نہیں ہوتی، خوف کا پیدا کرنا دشوار ہے، مگر حرص ہر وقت برانگیختہ کی جاسکتی ہے، دولت کا ذکر آیا اور حرص شعلہ زن ہوگئی +

دولت کا تذکرہ مجھے آخری یا آخری قابلِ بیان ترکیب پر لے آیا ہے، بارش ہو یا آندھی، دن ہو یا رات، منفعت کی اُمید ہر وقت گفتگو پیدا کرسکتی ہے، اگر حریف لاٹری کے ذکر پر بھی گل محمد بنا رہتا ہے تو اُسے سٹہ بازی کا لقمہ دو، اگر وہ اس پر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتا تو پھر اس انعام کا ذکر کرو جو ریلوے والے پٹڑی میں نقائص نکالنے پر یا ٹرین کے تختوں کے سوراخوں کے گننے پر دیتے ہیں، یا اُسے اپنے ہمسایہ لوہار کا قصہ سناؤ، جسے دو روپے کے ٹکٹ میں چالیس ہزار کی لاٹری ملی تھی، غرض مالی منفعت کی کوئی صورت نکالو، بس پھر انسان کی مقدس رُوح فوراً مستعد ہو جائے گی، کیونکہ اس راگ کا الاپ یہی ہے، دولت، دولت، دولت، دولت !!!

ایک اور سُن لو، حریف سے دیا سلائی مانگو، ایک سلائی جلا کر ڈبیہ واپس دیدو، اور اس کو بجھا دو، پھر ڈبیہ مانگو، ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ یونہی کرو، اعتراض ہوگا، معذرت ہوگی، اس سے تم رُوح کی حقیقت، ہندوستان کا مستقبل، ہندو مسلم اتحاد، تپ دق اور ایسے ہی دلچسپ مباحث پیدا کرسکو تو پھر تم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی بیوقوف نہ ہوگا +

اچھا اب ہمارا سفر ختم ہوا، سٹیشن آپہنچا، السلام علیکم، اچھا تو کیا آپ بھی یہیں اُتریںگے۔ کس محلے جائینگے، بارو دخانے خوب میں بھی وہیں جا رہا ہوں، یعنی پاس ہی داتا گنج بخش روڈ پر: آئیے نا !!

مگر یہ ٹرین سے اترنے کے بعد کی باتیں ہیں، یہ پھر سہی +

(ببلک)

تاثیر ایم اے

ظرافت

ننھے تمہاری عمر کیا ہے ؟

ننھا، جب میں گھر میں ہوتا ہوں تو میری اماں اور ابا کہا کرتے ہیں، پانچ سال +
جب میں مدرسہ میں ہوتا ہوں، تو چھ سال +
جب میں ریل پر سوار ہوتا ہوں، تو تین سال +

(ترجمہ)

شعر خوانی

از جناب عبدالبشیر صاحب آذری متعلم اسلامیہ کالج لاہور

(خاص برائے نیرنگ خیال)

جس طرح ایک شاعر کے لئے "خوشخواں" ہونا ضروری بات نہیں، اسی طرح ایک "خوشخواں" کا بھی "تُک بند" ہونا لازمی امر نہیں، یہ دونوں خصوصیات اگر ایک ہی ذات میں مجتمع ہوں تو واہ واہ کیا کہنے، ورنہ یہ دونوں حضرات ایک دوسرے کو نہایت تنگ زاویہ نظر سے دیکھتے ہیں، وہ ایک جو خدا کی عطا کردہ طاقت گویائی اپنی حرکات وسکنات سے لوگوں پر اپنا سکہ نہیں بٹھا سکتا، صرف شعر گوئی کو ہی اپنا معراج کمال سمجھ کر تخیل کی وسعتوں تک ہی محدود رہ کر لوگوں پر "ہنوز ترشنہ" والے معاملے کا اظہار کرتا ہے، اور وہ دوسرا جو اپنی ترنم ریزی سے لوگوں کو اپنے معمولی مشاغل سے (مثلاً مشاعرے میں باتیں کرنا، قہقے لگانا، دانت نکالنا) ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے، صرف لحن داؤدی، آواز کے زیر وبم، ہاتھوں و اعضا کی حرکت، آنکھیں نکالنے اور میز پر مکے مارنے میں ہی "تاثیر" کا پہلو ڈھونڈتا ہے، شاعر کے الفاظ اس کے خیال میں ہیچ محض ہیں، کہاں کا خیال اور کہاں کا تخیل +

اب دیکھنا یہ ہے، کہ "حسن شعر خوانی" سے کون کون سے شعرا مستفید ہو سکتے ہیں، یہ مسئلہ محقق کے دماغ میں بہت دن دریا کے مدو جزر کی طرح اُتار چڑھاؤ کرتا رہا ہے، اور آخر کار راقم خاکسار اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ شاعروں کی تین قسمیں ہیں اعلیٰ، متوسط اور نکھد، پس اعلیٰ درجہ کے شعراء کا کلام اگر سادہ پڑھا جائے، تو بھی اور اگر کوئی باکمال پڑھنے والا پڑھ دے تو بھی چار و ناچار (شاعر کی مشہور بزرگی کی وجہ سے) لوگوں سے داد کلام وصول کر لیتا ہے، رہے متوسط درجہ کے شعراء، اگر اُن کا کلام اچھی طرح پڑھا گیا تو اُس کی قدر ہو گئی، اور اگر کسی نے اناپ شناپ بک دیا، تو داد تو اُس کو بھی مل جاتی ہے، خواہ وہ اسلامیہ کالج کے سخن فہم وقدر شناس بزرگوں کی طرح "داد بے ہنگام" ہی کیوں نہ ہو، ادنیٰ طبقہ کے شعرا کے کلام کو حسن خوانی پر خاموشی کا صلہ ملتا ہے (اور درحقیقت اس قسم کا شاعر لوگوں کو چپ چاپ رکھنے کو ہی اپنا معراج کمال سمجھتا ہے) اور بد خوانی پر وہی داد . . . . جو متذکرہ بالا متوسط درجے کے شاعر کو حاصل ہوئی تھی +

بہر کیف "حسن شعر خوانی" سے درجہ متوسط بہت حد تک مستفید ہوتا ہے اور باقی اس سے کم، لیکن یہاں ایک اور دقیق مسئلہ در پیش ہوتا ہے، کہ جس طرح بخلاف مقتضائے قدرت ہر ایک شخص انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد "شاعر" کہلانے کا حقدار ہو جاتا ہے، کیا شعر گوئی کے لئے بھی کوئی ایسے مدارج ہیں، اور بحالت اثبات وہ کیا ہیں، دوستو آؤ، اور ہماری ریسرچ[1] سے فائدہ اُٹھاؤ، سمجھ لو کہ اگر کوئی شخص کسی مقامی بزم ادب یا کسی ایسی ہی دوسری بزم کے اجلاس عام میں توجہ سے سُن لیا گیا، (اور لاہور میں کسی نو آموز کا اسقدر کامیاب ہونا تقریباً ناممکن ہے) یا اُسے خلاف توقع داد (صحیح معنوں میں) بھی مل گئی، تو بس وہ اس امر کا مستحق ہے، کہ اپنے آپ کو شعر خواں کہہ سکے +

لوازمات شعر خوانی، جس طرح حکیم لقمان نے اپنے لڑکے

[1] تحقیق

سو نصیحتیں کی ہیں۔ اسی طرح ایک "مشہور شعرخواں" نے بھی اپنے دوستوں میں سے ایک کو اس فن شریف کے مبادیات کے متعلق ایک طویل خط لکھا ہے، جو خوش قسمتی سے ہم نے اس مبتدئی فن شعرخوانی سے عاریتاً لے لیا ہے، اس میں چند امور اس قدر ضروری ہیں، کہ ہم اُن کا اقتباس - بغیر تبدیل عبارت ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں +

"پس تو جان لے کہ اونچی آواز بہتر ہے بہ نسبت نیچی آواز کے، اور یہ افضل ہے کہ ہال مع حاضرین کے گلے کا نپنے اس سے کہ نہ سنی جائے آواز پڑھنے والے کی، اور چاہئے پڑھنے والے کو کہ حرکات وسکنات کا ادا کرنا مطابق مضمون شعر کے (کہ اگر ہو تخیل تو اُٹھیں ہاتھ اوپر کی جانب، اور اگر ہو عالم افسردگی کا تو ہو خلاف اس کے) دیگر "رفتار شعرخوانی" ہونی چاہئے مساوی، نہ یہ کہ پڑھا جائے مصرعہ اوّل ۲ منٹ میں اور ختم ہو جائے مصرعہ ثانی ایک سیکنڈ میں، اور نہ ہو "روئے سخن" شاعر کا کسی خاص طرف، کہ سمجھ لے اُس کو قبلہ اور کیا رہے نیت اُدھر کی (تنبیہ) کہ اندریں صورت پہنچ گئے نعرے "اِدھر بھی" کے آسمان تک، اور چاہئے تجھے کہ خوب رعب ڈالے تو حاضرین پر ساتھ ممکن طریقوں کے مثلاً آنکھیں پھاڑنا، اور لکھا ہے انیس نے اپنے کلیات کے بیچ کہ ڈال اُن میں سرمہ قبل شعر پڑھنے کے تاکہ خوب متوجہ ہوں حاضرین تیری طرف اور تاثیر ہو تیرے شعر میں" +

اس پُرمغز اور مخلصانہ ہدایت کے ہوتے ہونے ہمارے لئے لوازمات شعرخوانی پر بحث کرنا گویا ماہتاب پر تھوکنا ہے بس ہم اس پر ہی اکتفا کرتے ہیں +

ناظرین مضمون کا خشک حصہ ختم ہوا، یعنی شعرخوانی کے لوازمات ومبادیات ختم ہوئے، آیئے، تاکہ اب آپ کو مختلف "مجالس شعرخوانی" کی زیارت کرائی جائے، اور بقول کسے شنیدہ کے بود مانند دیدہ، آپ اس خط پر لطف سے محروم نہ رہیں +

۱- شاعر کا کسی دربار میں قصیدہ پڑھنا،

بادشاہ ذی جاہ کا دربار قایم ہے، اراکین سلطنت اپنی اپنی جگہ مؤدب کھڑے ہیں، ملک الشعرا کٹہرے کے پاس مستعدی سے قیام کرکے ان الفاظ سے عروض سخن کو بے نقاب کرتا ہے:-

جو تیری مدح میں مَیں جو جنج اپنی وا کردوں
تو رشکِ باغِ ارم اپنا گھو نسلا کردوں
اور میں کھانے والا ہوں نعمت کا اور میرے لئے
فلک کہے ہے مقرر میں باجرا کردوں

چنین وچناں

شہنشاہ ذی جاہ اپنی تعریف سُنتے ہیں اور جامے میں پھولے نہیں سماتے، کوئی شعر طبع مبارک کو اچھا معلوم ہوا، تو شاہی حکم جھٹ سے داخل، کہ تمام حاضرین دربار ملک الشعرا کے مُنہ کو بوسہ دیں، کہ اس سے ہماری شان میں ایسے اچھے اشعار نکلے ہیں، اس نادر شاہی حکم کی تعمیل بھی عجیب خصوصیت رکھتی ہے، حاضرین کی لمبی لمبی گھنی ڈاڑھیاں ملک الشعراء کے دہن مبارک کا طواف کرتی ہیں، اور اس مبارک حجر اسود پر اللہ کثرت سے بوسے دئے جا رہے ہیں، کہ اگر ملک الشعرا کو ضیق النفس ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں، بادی النظر میں یہ اعزاز کی جگہ رکھتا ہے، لیکن اس اعزاز کا مزا کچھ وہی خوب جانتے ہیں جنہوں نے خود شاہی درباروں میں قصیدے پڑھے ہوں، اور ایسی اعزاز کے مستحق ٹھیرے ہوں + (بحوالہ حاجی بابا اصفہانی)

شعرائے متقدمین کا مشاعرہ میں غزلیات کا پڑھنا

ایک عظیم الشان محل میں محفل مشاعرہ قایم ہوتی ہے، شاعران باتمیز صفوں پر بیٹھے ہیں، باری باری سے شمع سب کے سامنے آتی ہے۔ اور شعرا اپنی اپنی غزلیں پڑھتے یا پڑھواتے ہیں، اب اس پڑھنے کے طریق کو ملاحظہ فرمایئے:-

شاعر سب سے پہلے کچھ کلمات زیرِ لب زبان سے نکالتا ہے، پھر کہتا ہے :-

"عرض کیا ہے کہ اکثر شبِ تنہائی میں، کچھ دیر پہلے نیند سے" شاعر ابھی لفظ نیند پر ہی پہنچتا ہے، کہ واہ واہ کے شور مچ جاتے ہیں، کہ "واللہ حضرت کیا کمال کیا ہے" "کیا سماں باندھا ہے" "اور پھر لفظ نیند کو ملاحظہ فرمائیے، بس حضرت آپ ہی کا حصہ ہے"، قطع نظر اس کے "پھر ارشاد" اور ان پر اصرار، مزید اصرار، شاعر کے زعم میں جو ایک حالت پیدا کرتے ہیں وہ قابلِ بیان نہیں، آپ کی حالت دیکھئے کہ "آداب پر آداب عرض کیا جا رہا ہے، ذرا کسی نے داد دی اور آپ نے سرِ تسلیم خم کیا، پھر اگلا شعر ہے :- "ہدہد کا مذاق ہے نرالا سب سے" حاضرین میں غل مچ جاتا ہے، "واللہ شعر کے خدا ہو خدا" شاعر جوش میں آکر صف سے تین تین گز آگے نکل جاتا ہے، ادھر حاضرین قدر دانی کے دریا لنڈھا رہے ہیں اُدھر شاعر صاحب ستم ڈھا رہے ہیں، غرض اسی طرح صبح ہو جاتی ہے، لیکن بسا اوقات معاملہ دگرگوں بھی ہو جاتا ہے، کچھ داد نہیں ملتی، تو دل میں یہ شعر پڑھ کلیجہ مسوس کر رہ جاتا ہے ؎

صائب دو چیز مے شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ قدر شناس

اسی عالم میں اگر کسی باکمال کے منہ سے نکل گیا، کہ بھئی اس شعر کو ذرا پھر پڑھنا (حالانکہ اُس نے نہ سننے کی وجہ سے کہا ہے) تو بس پھر کیا ہے، اُٹھ اُٹھ کے سلام کئے جا رہے ہیں، اور فرماتے ہیں، کہ "اجی میں اپنے دیوان میں لکھوا دونگا کہ یہ شعر حضرت نے دوبارہ پڑھوایا تھا" خدا خدا کر کے آپ کی غزل ختم ہوئی اور آپ اپنی جگہ پر استراحت فرماتے ہیں (بحوالہ آبِ حیات آزاد)

حال کے شعرا کا مشاعروں میں غزلیات کا پڑھنا

کسی آراستہ و پیراستہ ہال میں کسی بزم کا جلسہ منعقد ہوتا ہے حاضرین نیچوں پر بیٹھے ہیں، صاحبِ صدر کا ارکانِ بزم کو اُن کی صدارت کے لئے منتخب کرنے کا شکریہ گویا مقالۂ افتتاحیہ ہے، بعد اس کے ایک نو آموز شاعر صاحب سٹیج پر اپنی قسمت آزمائی کرنے تشریف لاتے ہیں، آپ کے آغاز میں ہی صوادِ بے ہنگام" کی وجہ ہال میں شور و غل مچ جاتا ہے، صاحبِ صدر کی گونجدار آواز "آرڈر پلیز" بھی حاضرین پر کوئی نمایاں اثر پیدا نہیں کر سکتی، غرض شاعر صاحب کو یہ حوصلہ شکن داد اپنی جگہ پر دوسری دفعہ متمکن ہونے پر مجبور کرتی ہے، اب ایک اور صاحب جو ذرا علمِ موسیقی میں دخل رکھتے ہیں، حاضرین کو اپنے کلام سے مستفید کرنے تشریف لاتے ہیں، آپ کے سٹیج پر قدم رکھتے ہی "سُر سے" کے فلک شگاف نعرے بلند ہو جاتے ہیں، اگرچہ شاعر کا مقتضیٰ ہرگز "گلے بازی" کرنا نہیں، لیکن پبلک کا اصرار اُسے چار و نا چار اس پر مجبور کرتا ہے، اس شور و غل کے ہنگامہ میں شاعر یا شعر خواں درحقیقت بے سُرا ہو جاتا ہے، اور آپ کی پہلی ہی تان قہقہوں کی صدائے بازگشت میں مخلوط ہو کر آپ کو اپنی غلطی سے آگاہ کر دیتی ہے، ایک دو شعر پڑھنے کے بعد شعر خواں کے گلے میں سے متعدد آوازوں کا مجموعہ نکلتا ہے، اور شعر خواں نہایت خفیف ہو کر "تان سین گولیوں" کی ضرورت محسوس کرتا ہے، غرض اسی حالت میں آپ کی نظم ختم ہوتی ہے اور آپ الحمد للہ کی بجائے اِنا للہ پڑھتے ہوئے سٹیج سے اُتر آتے ہیں +

اب صاحبِ صدر ایک شاعرِ اجل کو تکلیف دیتے ہیں اُن کا خیر مقدم نہایت گرمجوشی سے ہوتا ہے، آپ کی نظم اور موسیقی لوگوں کو بیخود بنا دیتی ہے، رسیلی، سُریلی آواز اور فنِ شاعری کے کمال کا مجموعہ گویا حاضرین کو مجوِ حیرت کر دیتا ہے اثنائے نظم خوانی میں کوئی بذاق بھی اپنی واہیات داد سے دوسروں کے عیش کو منغص نہیں کرتا، البتہ اختتامِ نظم پر داد اور "ایک اور"

کی فرمایش شاعر کو کچھ اور پڑھنے پر مجبور کرتی ہے، ایسے وقت میں شاعر بیماری یا کسی اور بہانہ سے خلاصی پانے کی کوشش کرتا ہے، مگر بے سود، سُننے والے سُنکر ہی چھوڑتے ہیں۔

اب دیگر اساتذہ بھی میدان میں اُترتے ہیں، اور شعر خوانی سے لوگوں کے دلوں پر قابو جماتے ہیں، بعض کی آواز بعض کی حرکات وسکنات بذاتِ خود ایک مستقل لکچر کے ہیں، غرض شعر خوانی کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہے، اسی حالت میں محفلِ مشاعرہ ختم ہوتی ہے (مشاہدۂ راقم)

مرثیہ خوانی، کسی صاحب درد امیر کے گھر میں بڑے اہتمام سے مجلس قایم ہوتی ہے، شائقین دُور دُور سے آتے ہیں، غرض شاعر مجلس کے بھر چکنے پر اگر مسند پر جلوہ گر ہوتا ہے پہلے رباعی پڑھی جاتی ہے، اور اس کے بعد مرثیہ نظم اور اُس پر نثر کے حاشیے، شاعر کی بلندئ آواز و طرز ادا نہایت اعلیٰ ہوتی ہے، پھر مضمون کی روانی اور زبان کی سلاست اس پر چار چاند لگاتی ہے، مرثیہ خوانی سے ایک "شعر خواں" ادائے مطلب پر قادر ہونے کا سبق سیکھ سکتا ہے، ناگاہ حاضرین کو کہا جاتا ہے کہ "صاحبو اپنے اپنے رومال سنبھالو، کہ میں کچھ رقت آمیز بند پڑھنے کو ہوں"، اس کے بعد تو آہ و بکا و نالہ و فریاد کا دھواں آسمان تک پہنچ جاتا ہے، پھر مجلس برخاست ہوتی ہے۔ (مشاہدہ و روایتِ صادقہ، نذیر احمد)

عبدالبشیر آذری

مارک ٹوین کی ظرافت

مشہور ظریف مارک ٹوین اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں ایک اخبار کا ایڈیٹر تھا، ایک دفعہ کسی وہمی خریدار کو اخبار کے اوراق میں ایک مکڑی ملی جس کے متعلق اُس نے ایڈیٹر سے پوچھا کہ اخبار میں مکڑی کا ملنا فال نیک ہے یا فال بد۔

مارک ٹوین نے اس کے جواب میں اُسے لکھ بھیجا:-

"ہمارے پرانے خریدار صاحب! جناب نے اخبار میں جو مکڑی پائی ہے یہ نہ فال نیک ہے نہ فال بد، بلکہ یہ مکڑی ہمارے اخبار کے حصۂ اشتہارات کا یہ معلوم کرنے کے لئے مطالعہ کر رہی تھی کہ کون سا تاجر اشتہار نہیں دیتا تاکہ وہ اُس کے گودام کے دروازہ پر جالا تن کر بقیہ عمر اطمینان سے بسر کرے۔

ترجمہ

پنکھڑیاں

غیر مطبوعہ

ستارے

آسمان پر لاکھوں، نہیں نہیں کروڑوں کلیاں منتشر ہیں، اور یہ مرقع سطح آب پر کنول کے پھولوں کا تختہ معلوم ہوتا ہے +

یہ لاتعداد چراغ اور قندیلیں ہیں، جن سے پُر اسرار درخشاں روشنیاں منتشر ہوتی ہیں +

ستاروں کی حرکت ایک زخمہ ہے جو رُوح کے مضراب پر پڑتا اور قسم قسم کے راگ پیدا کرتا ہے +

ستاروں کو کسی پہلو چین نہیں، یہ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے انسانی بستی پر آسمانی آنسو بہاتے ہیں +

لرزتے اور چمکتے ہوئے ستارے ہمیں تبلاتے ہیں کہ لاکھوں دنیاؤں میں ہمارا چراغ ہستی چشم زدن میں گل ہو جائیگا +

مگر آہ ایک سورج کے طلوع ہونے پر یہ نور اور یہ جلال آسمان کی پنہائیوں میں نہاں ہو جاتا ہے + ایڈیٹر

دفّالچی

جب مانائیدسوشائی دیوتاؤں اور عصکال کو بنا چکا تو عصکال نے ایک دف ساخت کیا اور اُسے ہمیشہ کے لئے بجانے لگا، اور پھر کچھ دیوتاؤں کے بنانے کی تھکان سے اور کچھ عصکال کی دف بازی کے اثر سے مانائیدسوشائی اُونگھنے لگا اور پھر سُو گیا +

دیوتا مانا کو آرام کرتا ہوا دیکھ کر خاموش ہو گئے اور عصکال کی دف کی آواز کے سوا تمام بیگانہ پر ایک پُر کیف سکوت چھا گیا، اور تحقیق عصکال گھر پر بیٹھا ہوا ہے اور بیگانہ کے دیوتاؤں سے بالا تر، مانائیدسوشائی کے قدموں میں اپنا دف بجا رہا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ دُنیائیں اور سورج عصکال کی بازگشتہ صدائیں ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ جیسے کسی کی نیند گانے کی آواز سے پریشان ہو جاتی ہے، یہ مانائیدسوشائی کے سپنے ہیں، جو عصکال کی دف بازی کے

اثر سے اُس کے دماغ میں آتے ہیں، مگر کسی کو کچھ خبر نہیں، وہ کون ہے، جس نے مانائید سوشائی کی آواز سنی ہے، یا اُس کے دفالجی کو دیکھا ہے +

خواہ سردیوں کا موسم ہو اور خواہ گرمیوں کا، خواہ دنیا میں صبح ہو خواہ شام، عصکال سدا دف بجاتا رہتا ہے کیونکہ ابھی دیوتاؤں کا مقصود پورا نہیں ہوا، کبھی کبھی عصکال کی باہیں تھک جاتی ہیں، مگر وہ دف بجائے چلا جاتا ہے، تاکہ دیوتا اپنا کام بجا لاتے رہیں اور دنیائیں چلتی رہیں، کیونکہ اگر وہ پل بھر بھی رک جائے تو مانائید سوشائی جاگ اُٹھیگا اور پھر نہ دیوتا ہی ہوں گے اور نہ دُنیائیں +

لیکن جب انجام کار عصکال کی باہیں تھک کر رہ جائیں گی اور وہ دف بجانے سے رُک جائیگا، تو جیسے کسی غار میں گرج کی آواز گونج اُٹھتی ہے بیگانہ اس خاموشی سے چونک اُٹھیگا اور مانائید سوشائی سستانا چھوڑ دیگا، اور آواز آئے گی!

"اے عصکال تو اپنے دف کو اُٹھا کر اپنے کندھوں پہ ڈال لے اور دنیاؤں کے اُدھر خلا میں چلا جا کیونکہ یہ **انجام** ہے اور اب تیرا کام ہو چکا"

اور پھر شاید کسی اور دیوتا کا ظہور ہو اور عصکال اُس کی خدمت بجا لائے، یا شاید وہ نیست و نابود ہی ہو جائے، لیکن عصکال کو اس کی کچھ پرواہ نہ ہوگی، کیونکہ وہ اپنا (عصکال کا) کام انجام دے چکا ہوگا +

(لارڈ ڈنسنے)

تاثیر ایم اے

عورت کا لباس

عورت خوشنما اور قیمتی لباس اس لئے پہنتی ہے کہ

(۱) اپنا دل خوش کرے +

(۲) اپنے شوہر کا دل خوش کرے +

(۳) دوسری عورتوں کو ناخوش کرے +

بیتھی گزٹ

نگارخانۂ چین

(۱) سنترے کا پتّا

ایک جوان لڑکی اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ریشم کے کچھ پھول کاڑھ رہی ہے، یکایک اُس نے دور سے بانسری بجتی ہوئی سُنی........ اور لرز گئی، سمجھی جیسے کوئی نوجوان اُسے محبّت کا گیت سُنا رہا ہے +

چاند کی روشنی میں کھڑکی کی راہ سے، سنترے کے ایک پتّے کا سایہ اُس کی گود میں کانپا..... یکایک وہ سِمٹ گئی، آنکھیں بند کرلیں، سمجھی جیسے کوئی ہاتھ اُس کے پیرہن کو چاک کئے ڈالتا ہے +

(۲) دیوانہ

لڑکھڑاتا ہوا بل کھاتا ہوا، رات کی سیاہی میں غایب ہوگیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان کے ستاروں کو چُن لائے گا +

(۳) موسیقی

سازندے جاچکے، یاسمن کے وہ سفید سفید پھول، جنہیں وہ سبز بلّور کے گلدانوں میں رکھ گئے تھے، چنگ و رباب کی طرف جھکے ہوئے، ابھی تک نغموں کے سُننے میں محو معلوم ہوتے ہیں +

(۴) بادل

سورج اُفق میں ڈوبتا جا رہا ہے +
اُس کے سب رفیق، بنفشی اور زمرّدی پوشاکیں پہنے، اُسے اپنے جُھرمٹ میں لئے ہوئے ہیں +

(۵) ایک دُعا

دیوی کی مورتی کے قدموں پر گِر کر، جو مجھ کھلے ہونٹوں پر بہت مہربان ہے، میں نے اُس سے یہ نہ چاہا کہ دوبارہ پیدا کی جاؤں یا مجھے جنّت میں رکھا جائے، میں نے اتنی ہی خواہش کی کہ دیوی کے ہاتھ میں جو بید مجنوں کی شاخ ہے، جس کے سرے پر شبنم کی بوندیں لرز رہی ہیں، ان میں سے ایک بوند میرے سر پر ٹپکا دے تاکہ میں کنول کا ایک پھول بن جاؤں۔ جسے شاید کسی دن وہ آکر توڑلے +

غلام عبّاس

فرشتۂ غم

جب خالقِ ارض وسما نے کرۂ ارضی کو آباد کرنا چاہا تو فرشتوں پر مسرّت کی ایک لہر چھا گئی، وہ آستانۂ الٰہی پر حاضر ہوئے تاکہ اس "کارِ خیر" کے لئے حسبِ استطاعت اپنی خدمات پیش کریں +

مشیت کو یہ ادائے محبّت و عبودیت پسند آئی اور اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا گیا +

ایک دن ...... چاروں طرف مسرّت ہی مسرّت برس رہی تھی، کائنات کی خوبیاں اور دلکشیاں فضا کو پُرلطف بنا رہی بربط کی سُریلی آوازیں دور و نزدیک دریاؤں مرغزاروں اور گلستانوں کو موسیقی سے معمور کر رہی تھیں، تھیں، عیش و نشاط کے اس عدیم المثال منظر کا سبب انسان تھا جسے خالقِ اکبر کی احسن المخلوقات بننے کا فخر حاصل تھا، اور جسے خود خالقِ اکبر فرشتوں نے "احسن تقویم" میں بنایا تھا، وہ انسان آج غیر فانی رُوح کی بخشش سے فیضیاب ہوا تھا + اس طرب و انبساط کی کثرت میں ایک فرشتہ تھا، جس نے اس کارنامہ میں کوئی حصّہ نہیں لیا تھا، اس لئے اُسے اس جشنِ مسرّت میں حصّہ لیتے ہوئے شرم و ندامت محسوس ہو رہی تھی، اس عظیم الشان کام میں حصّہ نہ لینے کا سبب یہ تھا کہ وہ بارش کے قطروں کو سمندر میں ڈوبتا دیکھکر اُنہیں کے ماتم میں مصروفِ گریہ رہتا تھا، جس کے باعث تمام فرشتوں میں وہ فرشتۂ غم کے نام سے مشہور ہو گیا، آخری ایّام میں خالقِ اکبر نے اُسے جب گریہ و زاری میں مصروف دیکھا تو نہایت نرم لہجہ میں شام کی شفق میں مُسکراتے ہوئے فرمایا رنج و غم کو ترک کر دو، اگر اب بھی تم اس تخلیقی کام میں حصّہ لینے کے آرزومند ہو تو باوجود وقت گذر جانے کے تمہارے لئے کام نکالا جا سکتا ہے، انسان بن چکا ہے اور

اب کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، صرف اُس کی پختگی کا کام باقی ہے، پس یہاں کھڑے رہو، اور اُس کی حفاظت اور نگرانی کے فرائض انجام دو +

فرشتۂ غم کے لبوں پر اظہار تشکر کے لئے ایک ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی، کیونکہ وہ صانع مطلق کے کام کی تکمیل میں حصہ لینے پر مامور ہوا تھا۔ انسانی پُتلے پر دھوپ، ہوا، کہر، اور برف کے اثرات ہو رہے تھے۔ آفتاب کی کرنوں سے خاکی پُتلے میں زندگی کی حرارت پیدا ہوتی تھی، کچھ عرصہ غم کا فرشتہ اس پُتلے کی حفاظت کرتا رہا، لیکن بالآخر وہ تنہائی اور اُس کی نگرانی سے اُکتا گیا، اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ مجھے اس خدمت پر فخر نہیں کرنا چاہئے، جب کام مکمل ہو چکا تو میری نگرانی سے فائدہ ہی میں کارکنوں کے برابر فخر نہیں کر سکتا +

اس وسوسے کے پیدا ہونے پر اُس کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپکنے لگے، اور وہ اپنے فرائض کی بجاآوری سے غافل ہو گیا، وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ کو ڈھانپ کر روتا اور اُس کے نمکین آنسو انسانی پُتلے پر ٹپکتے رہتے تھے، گرد و غبار اور ارضی و سماوی آفات سے انسانی پُتلے کی ہیئت بگڑ گئی +

جب کچھ عرصہ بعد صانع کُل نے معہ فرشتوں کے نزول اجلال فرمایا تو فرشتۂ غم کی اس غفلت سے سب کو افسوس ہوا، فرشتۂ غم کا بھائی جو ہمدردی کا فرشتہ کہلاتا تھا، اپنے بھائی کی لاپرواہی سے اسقدر شرمندہ ہوا کہ اُسکا زرد رنگ سفید ہو گیا، اُس نے انسانی پُتلے کو صاف و شستہ کرنے اور اُس کی حالت درست کرنے میں پوری پوری کوشش کی، اور جب اُس کی ہمدردی اور محبت سے یہ کام تکمیل کو پہنچا تو خالقِ اکبر نے فرشتۂ ہمدردی کو اپنے حضور میں بُلا کر فرمایا، دنیائے تخلیق میں تیرا رتبہ اتنا بلند ہے کہ انسان بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا، تمہارے اس جذبۂ پاک کے لئے میری برکتیں تمہارے ہمراہ ہونگیں، مصیبت زدوں کے ساتھ آنسو بہاؤ اور اقبال مندوں کے ساتھ خوشی مناؤ" مگر افسوس تیرے بھائی کے لئے آسمانوں میں کوئی جگہ نہیں، اُس کی غفلت سے اس کارِ خیر میں بہت دیر ہو گئی +

فرشتۂ غم اُسی دن سے معتوب درگاہ ایزدی تھا، لیکن جس دن صانع مطلق نے بہترین مخلوق میں زندگی کی روح پھونکنے کا کام سرانجام دیا، اُس نے عیش و مسرت کی گھڑی میں معتوب فرشتوں کے گناہ بھی معاف کر دیئے، فرشتۂ غم کو حکم دیا گیا کہ اُسے زمین سے اُٹھا کر آسمان کے اُس حصہ میں جگہ دی جائے جہاں ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر جمع ہوتے ہیں، تاکہ وہ تنہا نہ رہے +

(ترجمہ) ایڈیٹر

دعوتِ عمل

(۱)

سُستی تمہارے دل پر چھائی ہے، اور نیند تا حال تمہاری آنکھوں میں ہے +

کیا تم نے نہیں سُنا، کہ پھول کس شان سے کانٹوں کے درمیان راج کر رہا ہے، جاگ اور اُٹھ، وقت کو فضول مت ضائع کر، پتھریلے راستہ کے اخیر پر . . . . وہاں معصوم تنہائی میں میرا دوست بالکل اکیلا بیٹھا ہے اس کو مت دھوکا دے، جاگ اور اُٹھ (اور سفر شروع کر) +

کیا پرواہ ہے، اگر فضا دوپہر کے سورج کی گرمی سے کانپ رہی ہے، اور اس کی سانس رُک رُک کر چل رہی ہے، اور اس کی بھی کیا پرواہ ہے، اگر تپتی ریت نے اپنی پیاس کی چادر بچھا دی ہے +

کیا تمہارے دل کی گہرائیوں میں کوئی ولولہ نہیں، کیا تمہارے ہر قدم پر راہ کے ستار سے درد کے شیریں نغمے نہ نکلنے لگیں گے +

(۲)

مجھ کو اپنی کشتی ڈال دینی چاہئے، یونہی فضول وقت ساحل پر گذر جا رہا ہے، وائے نصیب +

بہار نے اپنا پھول کھلانے کا کام کیا اور چلی بھی گئی، اور بس اب کُملائے ہوئے بے فائدہ پھولوں کو لئے یہاں انتظار کی تکلیف سہہ رہا ہوں +

تم کیسی بے پروائی سے دیکھ رہے ہو۔ کیا تمہیں فضا میں دوسرے ساحل کی راگنی سے پُر ہوا کی سرسراہٹ محسوس نہیں ہوتی +

(ٹیگور)

مالک رام، ایبو ویجہ

آنسو

یاد رکھئے یہ ننھی ننھی بوندیں رُوح کا جوہر ہیں +

اگر آہِ سرد ایک فرشتہ کی تلوار ہے تو آنسو اُس کی کاٹ ہیں +

خوبصورتی کے لئے آنسو مُسکراہٹ سے بھی زیادہ قیمتی معلوم ہوتے ہیں +

ایک عورت کے آنسو مثل خاموش مقرر کے ہیں، وہ الفاظ کا سا بوجھ رکھتے ہیں، مگر جہاں آنسو بھی اثر نہ کر سکیں وہاں اور کوئی چیز اثر نہیں کرتی +

جو آنسو ہمدردی سے پونچھ لیا جاتا ہے، اُس کے بعد ہنسی آتی ہے، کیونکہ آنسوؤں سے کوئی چیز جلد خشک نہیں ہوجاتی، ایک دوسرے مصوّرِ فطرت کا قول ہے کہ آنسو دل سے اُٹھتے اور آنکھوں میں جمع ہوتے ہیں، آپ آنکھوں سے آنسو پونچھ سکتے ہیں، مگر دل کو آنسوؤں سے پاک نہیں کرسکتے +

مگر بعض اوقات ان احمقانہ بوندوں میں بڑے بڑے بہادروں کی جرأتِ مردانہ بھی غرق ہوجاتی ہے +

ایڈیٹر

سب سے پہلا تیر

منصۂ شہود پر نمودار ہونے کے بعد سب سے پہلا تیر جو چرخِ ستمگر نے میرے دلِ معصوم کا نشانہ بنانے کے لئے چھوڑا، میرے والدِ ماجد کی وفاتِ حسرت آیات تھی، آہ! میں اُن دنوں محض ایک بچّہ تھا ——— صرف پانچ سال کا! مگر سچ تو یہ ہے کہ گھر بھر کی اندوہناک حالت کا منظر سخت حیرت آفریں تھا، میں یہ تو جانتا نہ تھا کہ کیوں آج مجھے کوئی اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں نہیں کرتا؟ ——— ! مجھے خوب یاد ہے کہ میں اُچھلتا کودتا اُس کمرے میں جا گھسا، جہاں وہ ابدی نیند سو رہے تھے، اور اَمّاں، صرف امّاں اُن کے سرہانے بیٹھ کر اُن کا ماتم کر رہی تھیں، میں اپنے لکڑی کے گھوڑے کو گھسیٹتا ہوا ذرا آگے بڑھا اُن کے بسترِ مرگ پر جھک کر مسکرایا اور بولا "اَبّا؟"

مجھے یہ خیال تو تھوڑا ہی تھا کہ اُن کی رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے، امّاں نے مجھے گلے لگا لیا، وہ اپنے غم واندوہ کو ابھی تک بصد صبر و تحمّل سینے میں ضبط کئے بیٹھی تھیں مگر اب ——— ہاں اب اُن سے ضبط نہ ہوسکا اُن کا کاسۂ صبر لبریز ہوچکا تھا اُنہوں نے مجھے دفعتہً بھینچ ڈالا اور ایک دلگداز چیخ کے ساتھ اُن کی آنکھوں سے گرم گرم

آنسوؤں کا ایک فوّارہ سا پھوٹ پڑا، وہ بولیں! "ننھے! اب ہزار ہا کوششوں کے باوجود تمہاری آواز تمہارے "ابا" کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی، آہ! اب وہ کبھی تمہیں اپنی آغوشِ شفقت میں لے کر تم سے میٹھی میٹھی باتیں نہیں کر سکتے چند لمحوں کے بعد وہ زیرِ زمین دفن کر دئے جائیں گے، اور دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی ہمیں اُن سے ہرگز نہیں ملا سکیگی!"

میری امّاں سیرت اور صورت دونوں کے لحاظ سے صنفِ نازک کا ایک اکمل ترین نمونہ تھیں، باوجود جنونِ الم کے اُن کے افسردہ چہرے پر نسوانی وقار ویسے کا ویسا دَمک رہا تھا، میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا، یکایک میرے دل کو ایک زبردست دھکا سا لگا، میں تڑپ کر گر پڑا، اور——میرا ننّھا سا دل خون ہو کر رہ گیا—— نجانے کیوں؟ جب مجھے اتنا احساس ہی نہیں تھا کہ "حزن و ملال" کی حقیقت کو سمجھ سکوں، میں نہیں جانتا کہ میرا دل کس شکنجے میں جکڑا جا رہا تھا——اور—— اور—— اُسی دن سے افسردگی کے دوش بدوش میرے کاشانۂ دل میں رحم بھی بستا ہے"!

(ترجمہ از چرڈ سٹیل) نذر محمد

حقیقی مسرّت

یقین رکھئے کہ ہماری مصیبتیں حقیقت ہوتی ہیں، اور مُسرّتیں محض خیالات +

مسرّت ایک گناہ ہے، اور گناہ ایک مسرّت +

سچّی مسرّت وہ ہے جو دُکھ اور تکلیف کے بعد خریدی جاتی ہے، یعنی وہ جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو، اور جھوٹی مسرّت کی قیمت اُس کا لُطف اُٹھانے کے بعد ادا کرنی پڑتی ہے، یقین کیجئے کہ انسان کو ہر ایک خوشی کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے +

اگر تم سچّی مسرّت حاصل کرنا چاہتے ہو، تو یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ مُسرّتیں کیسے ترک کی جا سکتی ہیں +

ایڈیٹر

مصوّری اور فوٹوگرافی

گننگ کنک بہی ایوُل نمبر ۹ میں لکھتے ہیں:۔

فنِ مصوّری میں حقیقت سے مراد اصولِ جمالیات کی حقیقی پیروی ہے، نہ قدرت کا تتبع! کیونکہ آرٹسٹ ہمیشہ ایسے پیش پا افتادہ اور بازاری خیال سے گریز کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تصویر کی تمام دلکشی اس ذہنیت میں ہے جو اس میں پنہاں ہوتی ہے، اور آرٹ ہونا بھی ایک پیغام ہے جو ایک ذہن دوسرے کو دیتا ہے، اس لئے محض نیچر کی عکاسی یا پیروی ہوتی ہے جو انسان کو فوراً اُکتا دیتی ہے، دلاویزی پیش کردہ شے میں نہیں ہوتی بلکہ اُس خیال میں ہوتی ہے جو اُس شے کی وجہ سے مصوّر کے دماغ میں پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔

فوٹوگرافی کی بدولت یہ نقصانِ عظیم ہوا ہے کہ اس نے عوام کے مذاق کو (اگر پبلک کا واقعی کوئی مذاق ہے) آرٹ کی حقیقتوں سے پرے لیجاکر محض اظہارِ واقعات کی بدرَو میں پھینک دیا ہے، اور اب کئی لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں، کہ فوٹوگرافی خالص حقیقت کی ترجمان ہے اور کیمرہ کبھی غلط بیانی نہیں کرتا، مگر حقیقت یہ ہے کہ جمالیاتی نقطۂ نظر سے کیمرہ سراسر دروغ بافی کرتا ہے، اور اگر فوٹوگرافر کوئی جمالیاتی حس یا معقولیت کا اظہار کر سکتا تو وہ محض موضوع کی تلاش اور ترتیب میں! —— اور یہ جو مصوّرانہ فوٹو کہلاتی ہیں، نہ فوٹو ہوتی ہیں اور نہ تصویریں!۔۔۔۔

وہ حقایق یا واقعات جن کا اظہار فوٹو کرتی ہیں، ان کو مصوّر اصولاً بالکل نظر انداز کر دیتا ہے، لیکن عوام بالعموم واقعات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، واقعات کے متعلق جو آرا ہوتی ہیں، اُن کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ بلکہ ان کو ہر قسم کے خیالات سے نفرت ہوتی ہے، اسی لئے ان کو فوٹوگرافی کے انداز بہت پسند آتے ہیں، اور بڑے بڑے مصوّر اپنی حیات میں بہت کم سمجھے جاتے ہیں +

نظامی قدوسی ایم اے

نیند

سانس کے بعد انسانی زندگی کے لئے نیند سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے +

نیند زندگی کی ناپاکیوں کو دھو ڈالتی ہے +

نیند روح کے بخار کو دفع کرنے کے لئے قدرت کا بہترین عطیہ ہے +

نیند حسن و صحت میں جلا پیدا کرتی ہے، اس لئے حسین آدمیوں کو زیادہ سونا چاہئے +

یاد رکھئے رات کے وقت روح کا دن چڑھتا ہے +

سوتے وقت فکر و الم کو دل سے نکال دو، زندگی کی کتاب کو بالکل بند کر دو +

ایڈیٹر

"سکھیاں"

ایک دن جبکہ بہت سی لب بستہ کلیاں یکجا تھیں اور آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اُن میں عہد ہوا اُنہوں نے ایک دوسرے کو پیمان دیا کہ "وہ ساتھ ہی کھیلیں گی" اُنہوں نے کہا "ہم ساتھ ہی کھیلیں گے اور ساتھ ہی فنا ہوجائیں گے"!

وہ سکھیاں تھیں اور ایک دوسرے کو کبھی نہ جدا ہونے کا پیغام دے چکی تھیں، وہ ایک دوسرے کی ساتھی تھیں، وہ ایک دوسرے کی رسیا تھیں، وہ ایک دوسرے کی ماں جائی بہنیں تھیں!

وہ ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتیں، وہ ایک وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر کھیلتیں، وہ جھک جھک کر ایک دوسرے کا منہ چومتیں، وہ وفورِ محبت میں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالدیتیں!

جب ہوا اُنہیں گدگداتی تو وہ ہنسکر ایک دوسرے کو چمٹ جاتیں! جب سورج اُنہیں گرم کردیتا تو وہ ایک دوسرے کے سینہ پر سینہ رکھ دیتیں!

جب شبنم اُنہیں بھگودیتی تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر شرما جاتیں!

جب چاند اُن پر اپنا عکس ڈالتا تو وہ ایک دوسرے کی بغل میں چھپنے لگتیں!

جب بلبل اُنہیں کوئی دلکش نغمہ سُناتی تو وہ جھوم جھوم کر ایک دوسرے پر گری پڑتی تھیں ٭

جب تیتریاں اُن کے سامنے رقص کرتیں تو وہ ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا اُٹھتیں!

جب بادل اُن سے چھیڑ خانی کرتے تو وہ ایک دوسرے کا سہارا تلاش کرتیں!

جب تارے اُن سے تاک جھانک میں مصروف ہوتے تو وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپ جاتیں!

جب ڈالیاں اُنہیں جھولا جھلاتیں تو وہ نغمہ نواز ہوکر باہم آواز ملانے میں شریک پائی جاتیں!

غرض اُن سکھیوں میں بڑی اُلفت تھی وہ ایک دوسرے کے پریم میں زندہ تھیں!

مگر جب کھلنے کا وقت آیا اور پہلی کلی پھٹی تو سب نے خوفزدہ ہوکر اپنے لب بند کرلئے، لیکن جب بسنت کی ایک شام کو ہوا نے اُس کلی کو جو پھول ہوچکا تھا اپنی شوخیوں سے زمین پر گرادیا تو سب کلیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں!

اور اس کے بعد تمام کلیوں کے سینے شق ہوگئے، اور وہ بھی غم آلود ہنسی ہنستی ہوئیں پارہ پارہ ہوکر ہوا میں منتشر ہوگئیں ٭

(غیر مطبوعہ)　"اخلاق فاطمہ"

ایک ایک روپے کے تین ڈرامے

پہلا ڈرامہ

دُکاندار

افرادِ ڈرامہ

ڈاکٹر
مریض
وکیل
بیٹا
لڑکی
بیوی
پوتا

منظر

ایک شخص بستر مرگ پر پڑا ہے، اُس کے قریب ایک وکیل کرسی پر بیٹھا چند کاغذات کی دیکھ بھال کر رہا ہے، ڈاکٹر کمرہ میں اِدھر اُدھر گھوم رہا ہے، اور کبھی کبھی مریض کی نبض پر ہاتھ رکھتا ہے +

ڈاکٹر، (مریض سے) بھلے آدمی، اپنے گھر کا انتظام کر لو، اب تم اس جہان میں زیادہ دیر نہیں ٹھیر سکتے، مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تمہارا آخری وقت قریب آن پہنچا +

[مریض آہِ سرد بھرتا ہے]

وکیل (مریض سے) لالہ کروڑی مل جی، اس سے پیشتر کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے، آپ وصیت کر لیجئے +

لالہ کروڑی مل، (مریض) مجھے موت کا ڈر نہیں، مجھے صرف ایک بات کا فکر ہے، اور وہ یہ ہے کہ میرے مر جانے کے بعد دوکان کو کون سنبھالیگا؟

وکیل (ڈاکٹر سے) مریض دم توڑ رہا ہے، میری رائے میں گھر کے تمام آدمیوں کو بُلا لینا بہتر ہوگا +

[لالہ کروڑی مل کی لڑکی کمرہ میں داخل ہوتی ہے]

لڑکی (غمگین لہجہ میں) کچھ اُمید ہے؟!

ڈاکٹر، افسوس! رشتۂ حیات منقطع ہونے والا ہے، کوئی اُمید نہیں +

لڑکی، (بے چینی سے ہاتھ ملتی ہے)

وکیل، بہتر ہو کہ گھر کے تمام آدمی آجائیں، اور مریض کی آخری وصیت سُن لیں +

[لڑکی گھر کے تمام آدمیوں کو معہ ملازمین بستر مرگ پر دم توڑنے والے مریض کے گرد لے آتی ہے تاکہ وہ مریض کے آخری کلمات سُن لیں]

وکیل (قانونی لہجہ میں) کیا گھر کے تمام آدمی

کوئی غیر حاضر تو نہیں ؟!!

(مریض گھبرا کر اُٹھ بیٹھتا ہے، اور اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے)

یہ کیا شور ہے ؟ یہ تم کیا کہہ رہے تھے ؟

کیا سب کے سب آدمی یہاں کمرے میں آگئے ہیں ؟

وکیل، ہاں ہر ایک آدمی، تمام کے تمام آپ کے سامنے حاضر ہیں، وصیت کیجئے۔

مریض (کپڑوں کو نوچتے اور ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے) افسوس ! بے وقوف ! سب بے وقوف !! سب یہاں جمع ہو گئے، دُکان اکیلی چھوڑ دی، میں خود دکان پر جاتا ہوں +

(مریض اُٹھکر دکان کی طرف بھاگتا ہے، دیوار سے ٹکرا کر گرتا اور دم توڑ دیتا ہے)

پردہ

(ارل کرول)

ایڈیٹر

مُعاشرتِ مغرب

دُوسرا ڈرامہ

ایجنٹ

افراد ڈرامہ

ایک عورت

ایک مرد

منظر

سیرگاہ کا تنہا گوشہ، گرمیوں کی صبح، ایک بنچ

[ایک عورت اٹھلاتی ہوئی آتی ہے، دزدیدہ نگاہوں سے اپنے پیچھے آنے والے مرد کو دیکھتی ہے اور بنچ پر بیٹھ جاتی ہے +

ایک خوش وضع خوش لباس مرد آتا ہے جب مرد قریب پہنچ جاتا ہے تو عورت اپنے پاؤں سے گرگابی اُتارتی ہے، اور پاؤں میں درد کا بہانہ کرتی ہے، مرد سلنے آکر ٹھیر جاتا اور اُس کے پاؤں کی طرف دیکھتا ہے]

مرد، آہا آپ کا چھوٹا سا پاؤں بہت خوبصورت ہے!

عورت، ہوگا، آپ کے لئے خوبصورت ہوگا، لیکن میرے لئے خوبصورت نہیں +

مرد، کیا ہوا ؟

عورت، معلوم نہیں، میں ساحل کے پاس سیر کر رہی تھی کہ یکایک مجھے اپنی ایڑی میں تیز درد محسوس ہوا +

مرد، شاید کسی کیکڑے نے کاٹ کھایا ہوگا +

عورت، نہیں مذاق کی سوجھی ہے اور میرے پاؤں میں

درد ہو رہا ہے +

مرد، اوہو! درد! مجھے افسوس ہے +

عورت، میرے خیال میں کانٹا لگ گیا ہوگا +

مرد، لائیے میں دیکھوں +

(عورت اپنی گرگابی مرد کے ہاتھ میں دیدیتی ہے)

عورت (شرمگیں ادا سے) ایک سلیپر جانے سے میں سنڈریلا کی طرح محسوس کرتی ہوں +

مرد (خوش ہوکر) اور میں اُس افسانے کا ہیرو فیرئی پرنس ہوں، لیکن تم اتنے تنگ سلیپر کیوں پہنتی ہو +

عورت (خشمگیں انداز میں ایک پاؤں پر کھڑے ہوکر اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر)

کیا تمہارا خیال ہے کہ میرے سلیپر تنگ ہیں؟

مرد، اجی آپ خود ہی کہہ رہی تھیں کہ وہ تکلیف دیتے ہیں،

عورت، لیکن اگر وہ بڑے ہوتے تو مجھے اُن کے باندھنے کی ضرورت ہوتی +

مرد، لیکن کبھی عورتوں نے خود نمائی پر آرام کو ترجیح بھی دی ہے؟

عورت دوسرے الفاظ میں تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ میں جھوٹی ہوں +

مرد، (معذرانہ انداز میں) میری پیاری، میرا یہ مطلب نہیں،

عورت، لاؤ میرا سلیپر ادھر دو، میں یہاں ایک منٹ کے لئے بھی ٹھیرنا پسند نہیں کرتی +

مرد، اوہو، تم یونہی کھسیانی ہو رہی ہو +

عورت (چلنے کے لئے اُٹھتی ہے) تم ایک وحشی بدتہذیب انسان ہو +

مرد، ایک منٹ کے لئے ٹھیریئے، معاف کیجئے، میرا مقصد آپ کو کسی قسم کا رنج پہنچانا نہ تھا +

عورت، آپ میں کوئی بھی شریفانہ انداز نہیں +

مرد، میں صدق دل سے معافی چاہتا ہوں +

عورت (بیٹھ جاتی ہے) آپ سے کسی قسم کی توقع نہیں کیجا سکتی؟

مرد، کیا میں ایسا ہی بُرا ہوں +

عورت، بہت بُرے، تمہیں تو ایک حسین دوشیزہ سے گفتگو کرنے کی بھی تمیز نہیں، تم کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ لباس کیسا پہننا چاہئے، ذرا دیکھو اپنی طرف!

مرد (اپنے کپڑوں کو ٹٹولتے ہوئے) میرے لباس کو کیا ہوا، اچھا بھلا ہے +

عورت، کیا تم اپنے آپ کو ایک خوش پوش آدمی سمجھتے ہو، ذرا اپنی ٹائی کی طرف دیکھو، گلے کا لباس دیکھنے کے لئے ہوتا ہے، نہ کہ سونگھنے کے لئے +

مرد، یہ ٹائی میں نے پانچ ڈالر میں خریدی تھی +

عورت، ہوگی، مگر تمہارے یہ ٹین کے کاج بہت اچھے ہیں، ان کا سرخ مرخ رنگ تم پر ایک قبرستان کے منتظم ہونے کا شبہ دلاتا ہے +

مرد، (متعجب ہوکر) کوئی چیز بھی پسند نہیں، سب غلط +

عورت، اور سب سے زیادہ بُری چیز تمہارے ناشائستہ اطوار ہیں +

مرد، آج تک کسی شخص نے میرے اطوار پر حرف نہیں رکھا +

عورت، کیونکہ آج تک تمہیں کوئی ایسی ہستی نہیں ملی تھی، جو اسقدر آزاد اور حقگو ہوتی کہ تمہارے عیوب تمہارے مُنہ پر کہہ سنائی، اس میں شک نہیں کہ تم ایک ایسے انسان ہو جسے مقدر سوسائٹی میں نقل و حرکت کا موقعہ ملتا رہا ہے، لیکن باوجود اس کے تم بہت ناقص ہو +

مرد، کن باتوں میں ناقص ہوں؟

عورت، مثلاً جب میں یہاں آئی تھی تو میرے پاؤں میں تکلیف

تھی، میرے اُس میں شدّت کا درد ہو رہا تھا، مگر تم نے اپنی ٹوپی پر سے گرد جھاڑنے کے برابر بھی پرواہ نہ کی +

مرد، کیا میں نے پوچھا نہیں تھا!

عورت، اسی بات کا تو رونا ہے کہ تم نے پوچھا تک نہیں، یہ باتیں آدابِ معاشرت میں شامل ہیں، جس کا عورتیں برابر خیال رکھتی ہیں +

مرد، مجھے افسوس ہے، میں سخت نادم ہوں +

عورت، جب آپ نے میرے ساتھ گفتگو شروع کی تھی تو بجائے اس کے کہ آپ مجھ پر ایک شریف اور مہربان انسان ہونے کا اثر ڈالتے اور ایک تکلیف میں مبتلا خاتون کی امداد کرتے، تم نے اُلٹا مجھ پر تنگ سلیپر پہننے کا الزام لگا دیا، گویا میرے پاؤں بڑے بڑے ہیں +

مرد (سرکشی سے) لیکن اکثر عورتیں تنگ سلیپر پہنتی ہیں؟

عورت، جب تم اس قسم کی باتیں کرو گے تو کبھی عورتوں کے ساتھ کامیاب نہیں ہو سکتے +

مرد، میں نے کوئی بُری بات نہیں کہی +

عورت، مجھے تو ایسے آدمی کی خواہش ہے جو برمحل گفتگو کرنا جانتا ہو +

مرد، معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں "آدابِ معاشرت" کا "خولیا" ہے +

عورت، یہ اس لئے ضروری ہے کہ آدابِ معاشرت ہماری سوشل ترقی کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں +

مرد، خیر میں یہ جانتا ہوں کہ آپس میں کس طرح سے ملنا جلنا چاہئے +

عورت، مجھے یقین نہیں +

مرد، کیوں نہیں +

عورت، میں ثابت کر دکھاؤں گی کہ تم نہیں کر جانتے +

مرد، اچھا +

عورت (ڈرامہ کے انداز میں)

آؤ ہم فرض کریں کہ ہم ایک ایسی سوسائٹی میں شریک ہیں جو تمہاری سوشل اور مالی حالت پر اثر انداز ہو سکتی ہے میزبان تمہارے سامنے اپنی بڑی بچی کو تعارف کے لئے پیش کر رہا ہے، عین اُس وقت تمہیں چھینک آ جائے تو بتلاؤ کہ تم کیا کرو گے؟

مرد، کیا کرونگا! میں چھینک لونگا +

عورت (فتحمندانہ انداز میں) دیکھا، میں نے کیا نہیں کہا تھا کہ تم کچھ نہیں جانتے +

مرد، اچھا تم کیا کرو گی؟

عورت، میں کیا کروں گی، تو سُنو، میں اس تعارف کی رسم کو خاموشی کے ساتھ جُھک کر قبول کرونگی، اور پھر ایک طرف مُنہ کر کے اپنا رومال نکال کر چھینک لونگی، یہ ہے وہ ترکیب جس پر مہذب انسان عمل پیرا ہوتے ہیں +

مرد، مگر چھینک تو آناً فاناً بلائے ناگہانی کی طرح آتی ہے +

عورت، واہ! اچھا تو کیا تم جانتے ہو کہ مہمانوں کا کس طرح سے استقبال کرنا چاہئے؟ اُن کے آرام و آسائش کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے؟ جب آپ کے دوست آپ کے مکان پر تشریف لاتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں؟

مرد، میں انہیں سگار دیا کرتا ہوں، پھر انہیں پوچھا کرتا ہوں کہ وہ کیا پئیں گے!

عورت، صرف اسقدر کافی نہیں، اچھا اگر تمہارا کسی خاتون کے گون پر پاؤں پڑ جائے تو تم کیا کرو گے؟

مرد، میں خوش ہونگا، زہے قسمت +

عورت، اچھا میں تمہارا ایک اور امتحان لیتی ہوں، فرض کرو کہ تم ایک نوجوان حسینہ کے ساتھ مصروفِ گلگشت ہو،

اب مجھ سے ملو، میں تمہاری دوست ہوں، لیکن وہ دوسری حسینہ مجھے ناپسند کرتی ہے اُس وقت تم کیا کروگے، مجھ سے ملوگے یا نہیں؟

مرد، یہ صرف اس بات پر موقوف ہے کہ تم زیادہ خوبصورت ہو یا وہ +

عورت، بالکل نہیں، اس معاملہ میں خوبصورتی و بصورتی کا تعلق نہیں، یہ تو آداب معاشرت کا ایک سیدھا سادہ سوال ہے، یاد رکھو کہ آداب معاشرت ایک زرہ بکتر کی طرح ہے +

مرد، مجھے یاد ہے کہ تم نے ابھی کہا تھا کہ آداب معاشرت ریڑھ کی ہڈی ہے +

عورت، ہاں، ہاں، ریڑھ کی ہڈی بھی، زرہ بکتر بھی +

یہ انسان کو تمام مشکلات سے بچاتے ہیں، اور مذبذب اور بے اعتمادی کو دور کر دیتے ہیں +

مرد، تم کس قسم کی عورت ہو!

عورت، تم معلوم کر سکتے ہو!

مرد، میں کیسے معلوم کر سکتا ہوں +

عورت، سلیقہ اور تہذیب کے ساتھ +

مرد، افسوس ہے کہ میں زیادہ باتونی نہیں +

عورت، جبتک تم یہ بات حاصل نہ کروگے تم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے +

مرد، اچھا مجھے سکھاؤ +

عورت، ایک منٹ میں، افسوس ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے، تم آئس کریم چمچہ سے کھاتے ہو یا کانٹے سے، روٹی پر مکھن لگاتے ہو یا مکھن پر روٹی، تربوز کھاتے ہو تو اُسکے بیجوں کو کیا کرتے ہو، کیا تم نے کبھی سرِ عام کھانے میں شرم محسوس کی ہے؟

مرد، میں آئندہ شرم محسوس کیا کرونگا +

عورت، شاید تم ایسی باتوں سے بے نیاز ہو، اچھا ایک منٹ کے لئے دوسری طرف منہ کرو، اور میں تمہیں ان سوالات کا جواب بتلاؤں گی جو انسان کو معاشرتی دنیا میں پیش آتے رہتے ہیں، اس طرف مت دیکھو، اُدھر منہ رکھو، اُدھر +

[مرد دوسری طرف منہ پھیر لیتا ہے، اور عورت اپنے چھوٹے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک کتاب نکالتی ہے]

عورت، "یہ ہے آداب معاشرت سکھانے والی کتاب" ۵۴۵ صفحات، ۳۰ رنگین تصاویر، انڈیا پیپر، مکمل فہرست مضامین، ایک فرہنگ، مراکو چمڑے کی جلد، صرف ۲۴ ڈالر میں آپکے گھر پہنچا دی جائیگی +

مرد، میرے خدا، کتابوں کی ایجنٹ!

عورت، کوئی مرد، عورت، یا بچہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا آپ کو کیا معلوم کہ کھانے کے کمرہ میں کیسے جانا چاہئے، ناچ میں کونسی پوزیشن اختیار کی جائے، میرے دوست تمہیں اس کی سخت ضرورت ہے، سخت!

مرد، میرا بھی خیال ہے کہ مجھے اس کی ضرورت ہے +

عورت (نوٹ بک نکالکر) تمہاری یہی بات مجھے پسند آئی ہے لیجئے یہاں اپنا پورا پتہ لکھئے، اور یہاں دستخط ——

مرد، تمہیں فروخت کرتے ہوئے دیکھنا ہی اس کی قیمت کے برابر ہے، تم تو اُجاڑ بیابان میں چھپریاں تک فروخت کر سکتی ہو

عورت، بہت بہت شکریہ، آئندہ ہفتے کتاب آپکو ملجائیگی ہمیں آرڈروں کی تعمیل میں ذرا دیر ہو جایا کرتی ہے +

مرد، کیا اس کتاب سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اگر ایک لڑکی.... میرا مطلب یہ ہے کہ ایک لڑکی.....

عورت، نہیں کتاب میں اس قسم کی باتیں درج نہیں +

پیشتر ثابت کر چکی ہوں، چشم دید گواہ بھی موجود ہیں: اور ملزم نے اقبال نامہ پر اپنے دستخط بھی ثبت کر دیئے ہیں +

یہ ہے مقدمہ کی روئداد اور اب اس کے متعلق جیوری کے محترم خواتین کے فرائض کی ادائیگی باقی ہے +

جیوری، (یک زبان) ملزم مجرم ہے، مجرم ہے +

جج، ٹھیریئے، ابھی نہیں، ہم نے اس بدمعاش کے ساتھ انصاف کرنا ہے، اس لئے ہمیں اگر ملزم کے مشیر قانونی کے پاس کوئی مدافعت ہے تو اسے بھی سُن لینا چاہیئے +

ملزم کا وکیل، محترم جج اور جیوری کی خواتین!

میں ملزم کی مدافعت میں کچھ نہیں کہنا چاہتی، کیونکہ سرکاری وکیل نے مجھے یقین دلایا ہے کہ میرا موکل مجرم ہے، اب میں اُسے آپ کے انصاف پر چھوڑتی ہوں +

جج، (ملزم سے) کھڑے ہو جاؤ +

(ملزم کھڑا ہو جاتا ہے)

اے شیطان مجسم، دوزخ کے چیونٹے! تمہارا مقدمہ ان بارہ نیک خواتین کے سامنے پیش کیا گیا ہے، جو تمہیں مجرم قرار دیتی ہیں، کیا تم اپنی بریت میں کچھ کہنا چاہتے ہو +

ملزم، مجھے کچھ نہیں کہنا، میں سرکاری وکیل کے بیان کردہ جرائم کا مرتکب ہوا ہوں، اور ان جرائم کے ارتکاب کے لئے میرے پاس کوئی وزنی دلیل نہیں، سوائے اس کے کہ مجھے مقتولوں سے نفرت تھی، میں نے غریب خانہ کی صندوقچی بھی توڑی اور یتیم خانہ کی عمارت بھی جلادی، جو کچھ میرے خلاف کہا گیا وہ صحیح ہے، لیکن اب صرف ایک بات رہ گئی ہے جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں +

جج، وہ کیا +

قیدی (بلند آواز سے) میری محترم جج صاحبہ اور محترم خواتین جیوری میری بیوی . . . . میں چند دنوں میں ایک بچہ کا باپ بننے والا ہوں!

جیوری میں اضطراب پھیل جاتا ہے، جج صاحبہ ارزار رونے لگتی ہیں،

جیوری، (یک زبان ہو کر) بے گناہ، بے گناہ، بے گناہ ہے،

جیوری اور جج کرسیوں سے اُتر آتے ہیں، دوڑ کر ملزم سے ہاتھ ملاتے ہیں، اور اُسے اپنے کندھوں پر اُٹھا کر لیجاتے ہیں +

ٹیبلو

(رچرڈ کانیل)

ایڈیٹر

اشعارِ عید

مصوّرِ جذبات محمد جمال الدین صاحب کوثر لکھنوی

یہ ہلالِ عید تھا گردوں پہ یا تیغِ رقیب
یا کفِ قاتل میں خنجر تھا بہ اندازِ عجیب

دیکھتے ہی جس کو یاد آیا کوئی عشرت نصیب
خون ہو کر بہہ گیا آنکھوں سے ارمانِ غریب

دل کے ٹکڑے میہمانِ عید کے کام آ گئے
بادۂ خوں ہو کے خوانِ عید کے کام آ گئے

نیرنگِ محبّت

[از جناب ریاض حسین صاحب بی اے]
(خاص برائے نیرنگ خیال)

انگریزی میں ایک مثل ہے کہ اصل واقعات فسانہ سے کہیں زیادہ دلچسپ ہوا کرتے ہیں، یہ داستانِ محبت جو رنگینیٔ واقعات کے سبب بالکل فسانہ معلوم ہوتی ہے، ایک تاریخی حیثیت رکھتی ہے، اور اسی لیئے اس کی دلاویزی دوبالا ہو جاتی ہے +

اس داستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ دو ہستیاں جو پیدائش تربیت، تعلیم، تہذیب اور معاشرت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بعد المشرقین رکھتی تھیں، عجیب حالات میں ملیں عشق و محبت کے جذبات ان کے دلوں میں پیدا ہوئے اور آخر کار دونوں کو یقین ہو گیا، کہ دراصل قسمت نے ہم کو ایک دوسرے ہی کے واسطے مقدر کیا تھا +

اس تاریخی داستان کی موضوعہ (ہیروئن) انگلستان کے نواب لیسٹر کی پوتی تھی، جب اس نے زندگی کے سترھویں سال میں قدم رکھا تو اس کی شادی لارڈ ایلن برا کے ساتھ ہوئی جو بعد میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے تھے +

مگر خدا معلوم یہ شادی کس منحوس ساعت میں قرار پائی تھی، کہ نامبارک ثابت ہوئی، لیڈی ایلن براکو قدرت نے نہایت متلون مزاج دے رکھا تھا، اس کے پہلو میں ایک خودسر دل تھا، جو پاسبانِ عقل کی ایک نہ سنتا تھا، وہ طبعاً رومان کی طالب تھی، اور اس کی آرزو تھی، کہ ایک فسانہ کی سی رنگین زندگی گذارے، مگر لارڈ ایلن برا تو اسے محض تکلفات کی نمائش اور حقائق روز مرہ کی خشک زندگی ہی پیش کر سکتا تھا،

مزاجوں کا اختلاف آخر رنگ لایا، اور لیڈی ایلن برا نے ۱۸۳۰ء میں اس "زندانِ علائق" سے رہائی پائی، یعنے اس کی شادی منسوخ قرار دی گئی +

چونکہ اس زمانہ میں انگلستان میں طلاق کو نہایت مذموم خیال کیا جاتا تھا، اور لوگوں میں اس کے متعلق وہ رواداری جو آجکل پائی جاتی ہے مفقود تھی، اس لئے اس نے غیروں کی بیدردانہ طعن و تشنیع اور حقارت آمیز سلوک سے بچنے کیلئے سرزمین وطن کو خیرباد کہا، اور یورپ کے براعظم میں زندگی کے باقی دن گذارنے کو چل نکلی +

سب سے پہلے جس مقام نے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا، میونخ تھا، اس کی وجہ یہ تھی، کہ بویریا کا بادشاہ بھی لیڈی ایلن برا کی طرح نہایت رنگین مزاج اور فنونِ لطیفہ کا قدردان تھا، اس کا دربار لنڈن کی سوسائٹی سے زیادہ بُردبار اور آزاد خیال تھا، چنانچہ وہ دربار میں باریاب ہوئی اور ایک حسین و جمیل ممتاز خاتون کی حیثیت میں وہاں رہنے لگی +

اس کے حسنِ صورت اور پاکیزگیٔ مذاق نے لڈوگ شاہِ بویریا کے دل میں گھر کر لیا، اور وہ علانیہ اس کی بارگاہِ حسن میں عقیدت و محبت کے نذرانے چڑھانے لگا، چنانچہ بویریا کے شہرۂ آفاق نگارخانہ میں جسے حسن پرست بادشاہ نے، اپنے عہد کی حسین ترین عورتوں کی تصویروں سے آراستہ کر رکھا تھا، لیڈی ایلن برا کی دلکش اور ملائک فریب تصویر بھی آویزاں کی گئی، جو آج بھی وہاں ایک امتیازی شان کیساتھ جلوہ گر ہے +

لیکن لیڈی ایلن برا سے یہ توقع محال تھی، کہ وہ بادشاہ کی منظورِ نظر رہ کر دربار میں زندگی بسر کرے، پھر وہاں کی طلب پہلو میں گدگدائی، دشت نوردی کی آرزو نے تلوا کھجلایا، اور قسمت نے چپکے سے کان میں کہہ دیا، کہ "تیرے لئے راحت و مسرت آغوش کھولے کہیں اور انتظار کر رہی ہیں، اُٹھ، تیرے دل سے ملنے کیلئے ایک ہمنوا دل مضطرب و بیقرار ہے"۔ یہی وہ شے تھی جس کی تلاش و جستجو میں وہ ابتک سرگرداں رہی تھی، آخر نوشتۂ تقدیر کو پورا کرنے کیلئے وہ پھر چل نکلی اور سرزمین ایشیا کی جانب رخ کیا، بیروت سے ہوتے ہوئے دمشق پہنچی، اور دمشق سے صحرا کو طے کرکے بغداد کا عزم کیا، اس وقت دمشق اور بغداد کا درمیانی صحرا سیاحوں کے نقشِ قدم سے قطعاً نا آشنا تھا؛ اور اس میں سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، چنانچہ لیڈی ایلن برا کو سمجھا دیا گیا، کہ اس کٹھن سفر میں اپنی حفاظت کے لئے وہ بدوؤں کا ایک دستہ ضرور ہمرکاب رکھے

جو دستہ اس غرض کے لئے مامور ہوا، اُس کی قیادت عنزلی قبیلہ کے سردار شیخ محمدؔ کے نوجوان بھائی کے ہاتھ میں تھی، یہ قبیلہ اپنی قدیم روایات اور تموّل کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، علاوہ ازیں نوجوان شیخ کو قدرت نے ایک نہایت دلکش اور حسین صورت عطا فرمائی تھی، اور وہ شجاعت اور حوصلہ مندی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا، مگر لیڈی ایلن برا کے حُسن میں بھی بلا کا جادو تھا، جسے دیکھتے ہی یہ حسین نوجوان نقدِ دل ہاتھ سے کھو بیٹھا، اور محبت کی آگ نے اس کے خرمنِ ہوش و حواس کو جلا دیا +

بہت روکا، مگر آخر نہ رہ سکا، اور جب رات کی خاموشی صحرا کی فضائے بسیط پر چھا رہی تھی، اور ستارے اس طرح جگمگا رہے تھے، گویا محبت کے مندر کی قندیلیں ہیں، اس نے اپنی محبت کا راز افشا کر دیا، اور کچھ ایسے دلکش پیرایہ اور موثر انداز بیان میں صحرائی زندگی کی آزادی اور دلآویزی کا ذکر کیا، کہ اس کی تقریر لیڈی ایلن برا کے دل پر اثر کئے بغیر نہ رہی، اور اس کے دل میں کسی شاعر کی یہ آرزو چٹکیاں لینے لگی "اے کاش، صحرا کی آزاد فضا اور کھلی آب و ہوا میں میرا کاشانہ ہو، اور ایک حسین ہستی میری مونس و ہمدم ہو"+

اس خیال کا آنا تھا، کہ زندگی کے تکلفات سے تنگ آیا ہوا دل فوراً قہرمانِ محبت کے پنجہ میں پھنس گیا، پاسبانِ عقل نے ہشیار باش کہہ کر ڈانٹا، مصلحت اندیشیوں نے بہتیرا روکا، مگر نوجوان شیخ کی محبت کا جادو ایسا زبردست تھا، کہ کسی کی ایک بھی نہ چلی، نہ وطن یاد رہا، نہ رشتہ دار، نہ ننگ و ناموس کی پرواہ رہی، نہ طعنِ اغیار کی، اور محبت کے طوفان نے تمام رکاوٹوں کو خس و خاشاک کی طرح رستہ سے ہٹا دیا، نوجوان شیخ نے بھی اپنی محبوبہ کی خاطر پہلی بیویوں کو طلاق دیکر اس کے ساتھ اسلامی شرع کے مطابق شادی کرنے کا اقرار کیا، نیز اس کے ساتھ وعدہ کیا، کہ میں سال میں سے چھ ماہ دمشق کے محل میں تمہارے ساتھ زندگی بسر کیا کرونگا، بشرطیکہ دوسرے چھ ماہ تم میرے ہمراہ صحرا میں گذارنا منظور کرو"+

ممکن ہے، یہ رعنائیں جو نوجوان شیخ کے نکتۂ نگاہ سے اپنی عزیز ترین متاع کی قربانی سے کم نہ تھیں، لیڈی ایلن برا کی نظروں میں کچھ زیادہ اہم اور وقیع نہ معلوم ہوئی ہوں، کیونکہ وہ اس وقت اس امر سے محض نا آشنا تھی، کہ بدوؤں کو جس قدر غرور اپنی نسبی شرافت اور خاندانی نجابت پر ہوتا ہے، وہ انگلستان کے بڑے سے بڑے نامی امیر کو بھی نصیب نہیں، عرب کے بدو، صحرا کے فرزند، اپنی خوشی سے سورج کی چلچلاتی دھوپ میں گرم ریت پر رہنے والے حضرت اسمٰعیلؑ کو اپنا جدِ امجد خیال کرتے ہیں، اور اپنا سلسلۂ نسب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت ہاجرہ سے ملاتے ہیں +

الغرض جب لیڈی ایلن برا نے نوجوان شیخ کی رسیلی آواز میں صحرا کی دل کشیوں کا حال سُنا، تو وہ صحرائی زندگی کی دلاویزیوں کے تصوّر میں محو ہوگئی، تصوّر کے جادو نے کبھی تو اُسے صحرا کی شہزادی، اور کبھی بدوی قبائل کی ماکے لباس میں پیش کیا، کبھی صحرا کی وسعت میں خیموں کی آزاد زندگی کا خیال آیا، اور کبھی دمشق کے اندر شاندار محل کا نظارہ دکھائی دیا، جب یہ رنگین مناظر یکے بعد دیگرے چشمِ تصوّر کے سامنے آئے، تو دل میں ان کے حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی، چنانچہ اسی وقت اس نے محبّت کا جواب محبّت سے دیا، اور شادی کا اقرار کیا +

جب یہ خبر انگلستان پہنچی، تو قدرتاً وہاں کے طبقۂ امراء میں ایک سنسنی پھیل گئی، حکومت نے مداخلت کے لئے ہاتھ پاؤں مارے، تہدیدی پیغام بھیجے گئے، برطانی سفیر نے دفتری دباؤ کے ذریعہ سے محبّت کا گلا گھونٹنا چاہا، اور دمشق میں جو انگریز مقیم تھے، اُنہوں نے لیڈی ایلن برا کو اس کام سے باز رکھنے کے لئے ہر ممکن کوشش کی، اور اُسے یہ کہہ کر دھمکایا، کہ یہ شادی تمہاری تباہی کا موجب ہوگی، سوسائٹی اور عزیز و اقارب نہ صرف تمہیں لعن طعن کریں گے، بلکہ مستقل طور پر تمہیں برادری سے خارج کر دیں گے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود لیڈی ایلن برا کے پائے ثبات میں تزلزل نہ آیا، اور حکومت و امارت کے نشہ میں سرشار معترضین کو زبانِ حال سے یہ کہہ کر خاموش کر دیا، کہ ؎

کوئے عشق است و بناموس سلام است اینجا
صد چو محمود بہر گوشہ غلام است ایں جا

وہ جانتی تھی، سوسائٹی تو مجھے پہلے ہی خارج کر چکی ہے اب میری زندگی کی مسرتیں کسی اور سے وابستہ ہیں، چنانچہ اس کا سکون ناآشنا دل مطمئن ہوگیا، مزاج سے تلوّن جاتا رہا اور اُس کی دلی آرزو بر آئی، یعنے نوجوان شیخ کے ساتھ اسلامی طریق پر اس کی شادی ہوگئی +

شادی کے بعد منزل ہستی کے ان کامگار محبّت مسافروں نے زندگی کے پندرہ سال اکٹھے بسر کئے، اور اس دوران میں ان کی باہمی محبّت میں ذرّہ بھر کمی نہ ہوئی، زمانہ کا زبردست ہاتھ اس حسن و جمال پر جو ایک بدو سردار کو اپنا حلقہ بگوش بنا چکا تھا، اثر ڈالنے سے قاصر رہا، اور لیڈی ایلن برا کی موہنی رومان پسندی اور فہم و ذکا نے مرتے دم تک خاوند کو نہ صرف اپنا عاشق بلکہ پرستار بنائے رکھا +

دمشق کی فصیل سے کچھ فاصلہ پر ایک سرخ رنگ کا محل نوجوان شیخ کی دلربا بیوی کا تھا، یہاں وہ سال کے چھ ماہ اسی پراسرار اور عجیب طریقہ پر بسر کرتی، جیسے الف لیلہ کی پریاں کبھی وہ موقلم لے کر فطرت کے دلفریب مناظر کا چربہ اُتارتی کبھی موسیقی کے دلگداز نغموں سے فضائے بسیط میں مترنم ہوتی اور کبھی پتھر کے بے دل ٹکڑوں کو تراش کر حسین و جمیل صورتیں بناتی، الغرض ایسے ہی فنونِ لطیفہ میں مصروف رہ کر اپنا دل بہلایا کرتی، اس محل غیر فانی محبّت کا گہوارہ گویا فردوسِ بریں کا ادنیٰ نمونہ تھا جہاں ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ تھے، اور فوارے خوبصورت پھولوں سے لدے پودوں پر ہیرے کی کنیاں نچھاور کرتے، جہاں عطر بیز ہوا مستانہ وار چلتی، اور پھولوں کے تختے حیرت نگاہ اور پرندوں کی راگنیاں فردوس گوش ہوتیں +

لیکن چھ ماہ گذرنے کے بعد اس نمونۂ فردوس محل کے دروازے بند ہو جاتے، اور اس کی حسین و جمیل مالکہ بالکل نئے بھیس میں اس کو خیرباد کہتی، جواہرات، ریشمی گاؤن کا لباس جو اُسے نہایت مرغوب تھا یکقلم ترک کر دئے جاتے، اور جب

وہ محل سے نکلتی، اور صحرا کی جانب رُخ کرتی، تو وہ چال ڈھال وضع قطع کے لحاظ سے بالکل صحرا کی عورت، اپنے قبیلہ کی ماں اور ملکہ بن کر نکلتی، اور محبت کی یہ دیوانی اس پارٹ کو کمال خوش اسلوبی سے سرانجام دیتی +

وہ بیحد دلیر اور جفاکش تھی، صحرا میں خیموں کے اندر زندگی بسر کرتے ہوئے کوئی تکلیف نہ محسوس کرتی، اور ہر کام میں اپنے خاوند کی شریک رہتی، صحرا ہو یا دمشق کا محل وہ ہر جگہ خاوند کے دل و دماغ کی رہبری کرتی، اور وہ بھی دل و جان سے اُس کا فدائی رہتا +

اس پندرہ سال کے طویل عرصہ میں صرف ایک مرتبہ لیڈی ایلن براکو ایسا موقعہ پیش آیا، کہ زمانۂ ماضی جسے وہ یکسر فراموش کر چکی تھی، پھر آنکھوں کے سامنے پھر گیا، اس کی ایک رشتہ دار عورت، جو اوائل شباب میں اس سے بہت محبت رکھتی تھی، اتفاق سے دمشق میں آئی اور اُسے معلوم ہوا کہ شیخ کی بیوی تھوڑے عرصہ سے صحرا میں چلی گئی ہے، جرأت کر کے اس نے بدوؤں کے ڈیرہ کا پتہ لگایا، اور لیڈی ایلن براکو ملنے کے واسطے پیغام بھیجا، اسے بہت کم اُمید تھی، کہ اس کو کوئی جواب ملیگا، مگر وہ حیران رہ گئی جب لیڈی کی طرف سے جواب ملا، کہ میں آپ سے ملنے کو تیار ہوں، لیکن ہماری مُلاقات اسی گردونواح میں ہونی چاہیئے جہاں مجھے راحت و مسرت نصیب ہوئی ہیں +

چنانچہ ایک لق و دق صحرا کے درمیان ایک ہی خاندان اور نسل کی دو عورتیں پھر ملیں، اور نووارد خاتون نے حیرت کے ساتھ تپتی ہوئی ریت کے وسیع میدان پر نظر ڈالی، اور اسکے ساتھ ہی انگلستان کے سرسبز اور نظر فریب مرغزاروں کا خیال آگیا، اور وہ سوچنے لگی کہ اس بے برگ و گیاہ صحرا میں رہتے ہوئے لیڈی ایلن برا کے دل میں کبھی اپنے وطن کی یاد گدگداتی ہے یا نہیں، علاوہ ازیں اس کے دل میں ایک اندیشہ پیدا ہوا، کہ شاید وہ حسن و خوبی جو لیڈی ایلن برا کا طرۂ امتیاز تھے، صحرائی زندگی کی مشقتوں اور کلفتوں سے بہت کچھ پامال ہو چکے ہونگے، مگر جب وہ اس سے دوچار ہوئی تو اس کا اندیشہ بالکل جاتا رہا +

لیڈی ایلن برا نے اپنی رشتہ دار خاتون سے ملنے کے لئے اپنے خاوند کا قومی لباس ہی زیب بدن کرنا موزوں سمجھا، چنانچہ جب وہ اس کے سامنے آئی، تو وہ سمجھی، کہ کوئی بدوی عورت کھڑی ہے، لیکن جب اس نے اپنا بالائی لبادہ اُتار دیا، اور ایک سادہ لباس میں نمودار ہوئی، تو اس کی سہیلی نے دیکھا، کہ اب بھی حسن و جمال اُس کی بلائیں لے رہے ہیں وہی دو نیلگوں آنکھیں، وہی دلکش صورت، وہی بھاری بھاری بال شانوں پر بکھرے ہوئے، قدرت کی بیٹی قدرت کی اپنی سرزمین میں!

اس کی سہیلی تصویر حیرت بن کر اسے دیکھتی رہی، اور ساتھ ہی اسے وہ وقت یاد آگیا، جب وہ لارڈ ایلن برا کی دلہن بنکر عروسی لباس پہنے ہوئے تھی، مگر موجودہ حالت کے مقابلہ میں وہ تصور ہیچ تھا، اب سے زیادہ حسین جمیل وہ کبھی نہ دکھائی دی تھی +

آخر یہ دونوں سہیلیاں ملیں، اُنہوں نے بہت دیر باتیں کیں، مگر لیڈی ایلن برا نے اپنے فعل پر خفیف سے خفیف ندامت یا تاسف کا بھی اظہار نہ کیا، وہ بار بار یہی کہتی رہی، کہ محبت ہی سب کچھ ہے، یہی مقصود حیات ہے، اور اُسی میں یہ حیرت انگیز طاقت ہے، کہ تمام نسلی اور خونی رشتوں کو قطع کر دیتی ہے، اور یادِ ماضی کو دماغ سے بدر کر دیتی ہے، اور میں محبت کے لئے ہی زندہ ہوں +

مگر ان دو سہیلیوں کی یہ مُلاقات، ہمیشہ کی جدائی کا بیش خیمہ تھی

کیونکہ جب وہ جدا ہونے لگیں، تو شیخ کی بیوی نے کہا، کہ ہماری یہ مفارقت دائمی مفارقت ہونی چاہیئے، کیونکہ تمہاری اور میری دنیا ایک دوسرے سے دور ہی رہیں تو بہتر ہے"۔

آخری دم تک شیخ کی بیوی خوبصورت، بہادر اور خوش مزاج رہی، وہ دوستی کے حقیقی مفہوم سے آگاہ تھی وہ تکلف، نمائش اور ریاکاری کی زندگی سے متنفر تھی، اسکا دل انسانی کمزوریوں اور خطاؤں کو سمجھ سکتا، اور ان پر ملامت کرنے کی بجائے ان کو رحم اور عفو کی نظر سے دیکھتا تھا +

یہ دو ہستیاں عشق و محبت کا ایک نادر نمونہ تھیں، اور ان کی دائمی اور غیر فانی محبت کا اثر اب بھی اس صحرا میں باقی ہے، اور وہاں سے گذرنے والوں کو کوئی پُراسرار مگر دلکش آواز یہ کہتی سنائی دیتی ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ریاض حسین بی اے

زمزمۂ تغزّل

از جناب رکن الدولہ شمشیر جنگ نواب محمد سجاد علی خاں بسمل نواب آف کرنال

محفل تری متقل کی تصویر نظر آئی
چلتی ہوئی ابرو کی شمشیر نظر آئی

یہ ضبطِ محبت کی تاثیر نظر آئی
ہر اشک میں اک دل کی تصویر نظر آئی

کیا اُن کی جفاؤں کا میں اُن سے گِلہ کرتا
آنکھوں کی خطا دل کی تقصیر نظر آئی

قربان ترے قاتل یہ چینِ جبیں تیری
ہم کو تو مقدّر کی تحریر نظر آئی

ہو جذب اگر صادق ممکن نہیں ناکامی
جب دل سے کیا نالہ تاثیر نظر آئی

بربادیٔ دل کا وہ نقشہ وہیں یاد آیا
ویران جہاں کوئی تعمیر نظر آئی

اس شان سے مقتل میں وہ تیغ بکف آئے
تدبیر کے پردے میں تقدیر نظر آئی

ہر ذرّۂ صحرا تھا اک عالمِ آئینہ
حسنِ رخِ لیلےٰ کی تنویر نظر آئی

پھر چشمِ تمنّا سے چھپنا ہے عبث تیرا
جب پردۂ گُل میں بھی تشہیر نظر آئی

جو تیر ہے سینہ میں وہ حاصلِ اُلفت ہے
ہر زخم میں قاتل کی تصویر نظر آئی

گیسو کے تصوّر سے جب آنکھ کھلی بسمل
پاؤں میں مجھے اپنے زنجیر نظر آئی

نعرۂ عاشقانہ

(از مولانا عبدالمجید خاں سالک رئیس التحریر زمیندار)

چوں بخمار می رسی راہِ شراب خانہ زن
بادہ بکش۔غزل سرا۔نعرۂ عاشقانہ زن
والۂ زاہداں مشو۔ درپئے صوفیاں مرو
بامنِ بوریانشیں جامِ مئے مغانہ زن
بادہ خوش و نگار خوش خندۂ کامگار خوش
لیک ہوس چو سرکشد خیز و مجاہدانہ زن
بلبلِ بے نوا بیا۔گدیہ زبرق تا کجا
ز آتشِ دل شرارۂ گیر و در آشیانہ زن
جانِ امل فسردہ شد۔روحِ حیات مُردہ شد
بازِ بیا و ناوکِ غمزۂ جادوانہ زن

(ناتمام) سالک

مقالات

الحمد لمن قدر خیراً وخیالا   والشکر لمن صوّر حسن و جمالا

اُصولِ تمدّن

از جناب عبدالباسط صاحب ایم۔ اے۔ ایڈیٹر علی گڑھ میگزین

(خاص برائے نیرنگِ خیال)

انسان اس عالمِ فانی میں اوّل مرتبہ قدم رکھتا ہے اور آنکھ کھولتا ہے تو وہ اس تماشاگاہِ عالم اور اس کے بازیگروں کے حال و قال کا دلدادہ اور اس کے کرشموں اور شعبدوں کا تماشائی ہوتا ہے، گویا کہ وہ زبانِ حال سے سائل ہوتا ہے کہ میں کہاں سے آیا؟ کیوں آیا؟ اور میری یہ انفرادی ہستی اس عظیم الشان دنیا میں کون سے کام کی انجام دہی کے لئے تخلیق کی گئی، کچھ عرصہ تک تو یہ مسئلہ بہت پیچیدہ اور لاینحل معلوم ہوتا ہے، لیکن تھوڑے ہی زمانہ میں صحیفۂ فطرت اس کی عقدہ کشائی کر دیتا ہے اور بہت جلد انسان پر ضروری امور کا انکشاف ہو جاتا ہے، صحیفۂ فطرت ہی کا مطالعہ ہم کو اس مقولہ کے معنی سمجھاتا ہے کہ زبانِ حال زبانِ قال سے کہیں زیادہ فصیح ہے۔ صحیفۂ فطرت ہی کی عینک سے ہر ذرہ میں آفتاب اور ہر قطرے میں سمندر نظر آتا ہے، اور یہ صرف صحیفۂ فطرت ہی کی وسعت ہے کہ اس قدر علوم تجربیہ اور حکمیہ پیدا ہو گئے ہیں کہ شمار سے باہر ہیں۔ صحیفۂ فطرت ہی کا مطالعہ کرنے والا اور غور سے مشاہدہ کرنے والا درخت کی ایک "سبز پتّی" کو "دفترِ معرفت کردگار" کا ایک ورق تصوّر کرتا ہے اور اس کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہو جاتا ہے

هر گیاہے کہ از زمین روید   وحدہٗ لاشریک لہٗ گوید

ہم سنتے آئے ہیں کہ افکارِ انسانی کی یہ ساری گل تراشیاں اور انسانی تجلّیات کی بلند پروازیاں اور اس دُنیا کی تمام بزم آرائیاں صرف اصولِ تمدّن پر ہی کاربند رہنے کا نتیجہ ہیں۔ یہ خوش حال اور فارغ البال شہروں کی آبادیاں اور تہذیب جدید کی گلکاریاں بھی اسی تمدّنی زندگی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہیں، یہ بحر و بر میں بے خطر سیاحت اور یہ کوہ و جبل کی بے خطر سیاحت صرف تمدّن کی بدولت آسان ہے، اسی تمدّن سے اقوام نے ترقی کی اور مدارجِ اعلیٰ پر پہنچیں، فتح و نصرت ہمرکاب ہوئی اور اقبال سے بہرہ مند ہوئیں، اور جب کبھی اس سے منہ موڑا اقبال نے ساتھ چھوڑا، تنزّل نے منہ دکھایا، ادبار میں گرفتار ہوئیں اور بالآخر قعرِ ذلّت میں جا گریں، یہی تمدّن ہے جس نے معمولی اقوام کو قعرِ ذلّت سے نکال کر اعلیٰ ترین مدارج پر پہنچایا، اور بہ بانگِ دُہل سارے کائنات کو ثابت کر دکھایا کہ میرا پیرو اس دنیا میں ہمیشہ سُرخ رُو رہے گا اور مجھ سے برگشتہ دائمی ذلّت میں مبتلا کر دیا جائیگا۔

جب اس تمدّن کے اُسقدر اثرات ہیں تو فطرتاً ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ ان زرّیں اصولِ تمدّن کو معلوم کرے، اور حقیقتِ تمدّن سے کما حقہٗ واقفیت پیدا کرے لہذا ہم تمدّن کے مال، وما علیہ سے بحث کرتے ہیں +

تمدّن عربی لغت ہے جو لفظ مدن سے مشتق ہے۔ مدن کے لغوی معنی شہر کے ہیں، اصطلاح میں تمدّن چند اشخاص کے یکجا ہوکر ایک شہر میں رہنے کو کہتے ہیں، اور یہ اصطلاح تمام ان قوموں کی اظہار حالت کے لئے مستعمل ہوتی ہے جو بمقابلہ وحشی اور جنگلی لوگوں کے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں، مثلاً اقوام یورپ بلحاظ چینیوں اور تاتاریوں کے زیادہ متمدّن سمجھی جاتی ہیں، امریکہ کے اصل باشندے اور اہلِ آسٹریلیا سب سے کم متمدّن خیال کئے جاتے ہیں، لیکن آخر الذکر بھی یکجا طور پر شہروں میں ہی آباد ہیں، تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سی چیز ہے جو اوّل الذکر اور آخر الذکر اقوام میں ما بہ الامتیاز ہے؟

اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ "تمدّن" کی اصطلاح دو معنوں کے لئے مستعمل ہے، اوّل مفہوم اس کا یہ ہے کہ اس سے بالعموم انسانی ترقی مراد لی جاتی ہے، مثلاً جب ہم کسی قوم یا کسی شہر و ملک کو زیادہ ترقی یافتہ یا انسانیت میں زیادہ مکمل اور سربرآوردہ دیکھتے ہیں، یا ہم اُن کو زیادہ خوش وخرّم، لطیف و نظیف، زیرک و دانا اور زیادہ متحد پاتے ہیں تو ہم ان کو متمدّن کہتے ہیں اور یہ تمدّن کا عام مفہوم ہے +

اس کے علاوہ ہم تمدّن کو ایک خاص مفہوم میں استعمال کرتے ہیں اور اس حالت میں اس سے ایک خاص قطع کی ترقی مراد لی جاتی ہے، جیسے کہ جنگلی اور وحشی جرگوں کے مقابلہ میں دولتمند اور ترقی یافتہ اقوام متمدّن سمجھی جاتی ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ آیا تمدّن بحیثیت مجموعی کوئی اچھی چیز ہے یا بُری، یا یہ کہ اس کے محاسن اس کے معائب پر غالب ہیں، اس کا جواب انسانی تجربوں اور تواریخ کے مشاہدوں کی بنا پر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ تمدّن بذات خود نہ صرف ایک بڑی خوبی ہے بلکہ بہت سی خوبیوں کا سبب بھی ہے، اور دراصل کوئی خوبی ایسی نہیں جس سے وہ ربط نہ رکھتی ہو، وحشیانہ زندگی کی خواہ کچھ ہی خصوصیات کیوں نہ ہوں لیکن وہ محاسن تمدّن کو کبھی نہیں پہنچ سکتیں، وہ صفات جن کو سوسائٹی اپنے جامۂ وحشت کو اُتار کر اصول قدیمہ کو اصولِ جدیدہ سے مبدّل کرکے اختیار کرتی ہے انہیں سے تمدّن ترکیب پاتا ہے، ایک وحشی گروہ میں چند انفرادی ہستیاں یا چند اشخاص پراگندہ صورت میں آباد ہوتے ہیں اور غیر متمدّن کہلائے جاتے ہیں، لیکن ان کے مقابل میں ایک گنجان آبادی ہے جو مقررہ مسکنوں میں بودوباش رکھتی ہے اور کثیر تعداد جماعت کے ساتھ قصبات اور شہروں میں آباد ہے وہ متمدّن کہلائی جاتی ہے، وحشیانہ زندگی میں تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت یا تو سرے سے ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر برائے نام کہیں پائے بھی جاتے ہیں تو وہ اس قدر بے اصول ہوتے ہیں کہ ان کا عدم و وجود برابر ہوتا ہے، لیکن اس کے مقابل ایک متمدّن ملک زراعت، تجارت، اور صنعت وحرفت سے مالا مال ہوتا ہے، وہاں کا ہر ایک مشغلہ کسی نہ کسی اصول کے ماتحت ہوتا ہے، اور وہاں کا ہر ایک کام ترقی کی شاہراہ پر انجام پاتا ہے، وحشی لوگوں میں ہر شخص انفرادی صورت سے صرف اپنی ذات کا فائدہ مدِّ نظر اور ملحوظ خاطر رکھ کر محنت مشقّت کرتا ہے اور غیر متمدّن کہلائے جانے کا مستحق ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم دوسری طرف بنی آدم کی ایک جماعت کثیرہ کو کسی ایک غرض مشترک کے واسطے مصروف بکار یا باہمی معاشرت میں ایک دوسرے سے متحد، خوش وخرم، شاداں و

فرحاں دیکھتے ہیں تو اس کو متمدن کہتے ہیں، وحشیانہ زندگی میں کسی قانون نظم و نسق اور دادرسی کا یا تو وجود ہی نہیں ہوتا یا اگر کہیں پایا جاتا ہے تو صرف برائے نام اور وہ بھی صرف اس ضرورت سے کہ منفرد اشخاص ایک دوسرے کی ایذا دہی اور آزار رسانی سے محفوظ رہیں، نہ تو سوسائٹی کی منضبطہ و متفقہ قوت باقاعدہ طور پر صرف میں آتی ہے اور اتحاد اور جماعت کے فوائد سے کوئی واقف ہوتا ہے، بلکہ ہر شخص واحد اپنی قوت بازو یا ذاتی چالاکی پر بھروسہ رکھتا ہے، برخلاف اس کے جماعت میں سوسائٹی کا نظم و نسق اتنا کامل ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کی متفقہ قوت سے ہر ایک فرد کی جان و مال محفوظ رہے اور امن و امان قایم رہے تو اس سوسائٹی کو ہم متمدن کہتے ہیں۔

اس موازنہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ہم ترقی یافتہ انسان کو متمدن کہتے ہیں، ترقیاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک ترقی وہ ہے جسے انسان اپنی ذاتی جد و جہد سے طے کرتا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے کہ جس کا طے کرنا ہر انسان کے پیش نظر اور مرکوز خاطر رہتا ہے خواہ وہ اس کی عمر میں کسی وقت طے ہو، اب تمام انتظامات اور انکشافات جو زندگی کے ہر شعبہ میں کئے جاتے ہیں ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو وحشیانہ حالت سے بالا اور بالا سے بالاتر اور پھر بالاترین مرتبوں پر پہنچا دیں، اور یہ اوّل قسم کی ترقی ہے، لیکن دوسری قسم یا ترقی کی منزل انتہائی یہ ہے کہ انسان صفات ملکوتی حاصل کرے، اور اپنے خیالات کو اسقدر اعلیٰ و ارفع کرے کہ ان میں جو حیوانی خواہشات اور بہائمی صفات موجود ہوں وہ سب حالت اعتدال پر آجائیں۔ اور انسان اسقدر تزکیہ نفس کرے کہ اس کی روح صفات ملکوتی سے متصف ہو جائے یہی وہ ترقی ہے جو اصل ترقی ہے اور یہی ترقی یافتہ انسان در اصل متمدن کہلائے جانیکا فطرتاً مستحق ہے۔ لیکن تمدن جدیدہ مغربی کی غایت صرف اس عالم اجسام کون و فساد میں انسانی قوتوں کا اس قدر ترقی کرنا ہے کہ عالم اور مافی العالم اس کا مسخر ہو جائے، ترقیات روحانی جو اصل ترقی ہیں ان کو پس پشت ڈال دیا ہے۔

انسان کا نصب العین، مدارج ترقی کو طے کرنا اور اصل ترقی کے اعلیٰ پر پہنچنا ہے، انسان کو فطرت سے بہت کچھ عطا فرمایا گیا ہے، لیکن ان صفات فطرت میں تصرفات کرنا اور غور و خوض کر کے اپنے لئے سامان ترقی فراہم کرنا متمدن انسان کا کام ہے، لہذا انسان کی ذہانت و ذکاوت سبب ہے اور تمدن اس کا نتیجہ، انسان کی سعی بلیغ اور کوشش نامتناہی علت ہے اور تمدن اس کا معلول۔

تمدن کا سب سے بڑا ثمرہ یہ ہے کہ قوت و اقتدار افراد اشخاص منفرد اور چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے ہاتھوں سے نکل کر جمہور عوام کے ہاتھوں میں پہنچ جائے اور روز بروز جماعات کا زور بڑھتا اور اشخاص کا زور گھٹتا رہے۔ دوسرے وہ متفرق افراد کا ایک مجموعہ تیار کرے اور اس مجموعہ کو متحد کر کے اسے بااثر بنائے۔ اگر ایک وحشی شخص کے حالات زندگی پر نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کو جسمانی قوت بھی حاصل ہوتی ہے، اس میں دلیری اور جوانمردی بھی پائی جاتی ہے ہمت و عصمت بھی موجود ہوتی ہے، لیکن باوجود ان تمام خوبیوں کے اس میں کوئی ایسی نمایاں کمی اور خامی پائی جاتی ہے جس کے سبب سے کل وحشی جرگے غریب اور کمزور ہوتے ہیں، وہ کمی اور خامی کیا ہے؟ وہ وہی کمی اور خامی ہے جس کے سبب سے شیر اور بھیڑیا باوجود قوت و قدرت دلیری و ہمت انسان ضعیف البنیان کمزور و ناتوان پر غالب نہیں آسکتا یعنی اس میں متحد ہو جانے کی قابلیت کا نہ ہونا ہے

ایک کمی ہے، یہ وحشی جرگوں کو افلاس میں رکھتی ہے اور ان کی آئندہ ترقیات میں سدراہ ہوتی ہے، یہ صرف متمدن افراد کا کام ہے کہ وہ متحد ہو سکتے ہیں، ایک وحشی غیر متمدن یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتا کہ کسی غرض مشترک کے واسطے وہ اپنے نفس پر سختی برداشت کرے اور حظِ نفس کو چھوڑ دے نہ اس کے معاشرتی جذبات کبھی عارضی طور سے بھی اس کی نفسانی خواہشات پر بھی غالب آ سکتے ہیں، نہ اس کے طبعی رجحانات اس کی انجام بینی کی وجہ سے کم و بیش ہو سکتے ہیں، عاقبت اندیشی وہ نہیں جانتا، ذاتی بہبودی کے فوائد سے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ لہٰذا ہر وہ بات جو دوسرے کی رضاجوئی کے لئے ضروری ہوتی ہے اس کے دل سے دور رہتی ہے، بجنسہٖ یہی حالت جو افراد کی ہوتی ہے اس جماعت کی بھی ہوتی ہے جس سے وہ تعلق رکھتے ہیں، اس لئے جس قدر کوئی گروہ وحشت سے قریب تر ہوتا ہے اسیقدر اشتراکِ عمل سے بعید تر ہوتا ہے +

واقعات گذشتہ و حال پر ایک سرسری نظر یہ ثابت کر دیتی ہے کہ غیر متمدن اقوام کبھی متمدن اقوام سے باوجود قوت و قدرت جنگ و جدل میں کامیاب نہیں ہوتیں۔ انہوں نے ہمیشہ متمدن اقوام کے مقابلہ میں شکستیں کھائیں، ہزیمتیں اٹھائیں اور بالآخر متمدن اقوام نے فتح و نصرت کا جھنڈا بلند کیا اور بڑی بڑی سلطنتوں پر مدبرانہ حکومت کی، اقوام عالم کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب دو ملکوں یا دو قوموں میں باہم مقابلہ یا مجادلہ ہوتا ہے تو فتح و کامیابی کا سہرا اسی کے سر رہتا ہے جو بلحاظ تمدن فائق ہوتا ہے۔ مسائل بین الاقوام تعداد افراد سے طے نہیں ہوا کرتے، بلکہ اُن افراد کی **ذاتی قابلیت** ان کے متحد ہو جانے اور غرض مشترکہ پر ذاتی خواہشات کو فدا کر دینے کی قابلیت اور صلاحیت سے تصفیہ پاتے ہیں، یہ ایک ایسا اصول ہے جس کا ہر شخص قائل ہے + ممالک غیر کو چھوڑ کر تو ہندوستان ہی کے صفحات تاریخ اصول مذکورہ پر شاہد ہیں۔ یہاں کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والا تھوڑے سے غور کے بعد ان اُصول کو بہمہ جہت اس پر منطبق ہوتا ہوا پا سکتا ہے، اور وہ مشاہدہ کر لیتا ہے کہ ہندوستان کی عنانِ سلطنت جو ہمیشہ سے اقوام غیر کے ہاتھوں میں رہی ہے اس کا راز بھی اسی میں مضمر ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ دیسی ریاستیں جو اپنی مردانگی، شجاعت اور دلیری و جوانمردی میں زبان زد روزگار رہی ہیں، جہاں کا ایک ایک سورما بڑے بڑے قدآور پہلوانوں کو زیر کر دیتا تھا اور ایک شخص دس دس کے لئے کافی ہوتا تھا، جہاں غیرت و حمیت اس درجہ تھی کہ مفتوح ہونے سے جل کر فنا ہو جانا بہتر خیال کیا جاتا تھا، وہاں جب اس سے زیادہ متمدن اور متحد ہو جانے والی قوم سے مقابلہ ہوا تو بالآخر یہ تمام خوبیاں رکھی رہ گئیں اور آخر کار اس نے سب کو یکے بعد دیگرے سرنگوں کر دیا اور سب کی ہستی اس طرح فنا ہو گئی کہ اسلاف اخلاف کے لئے محض افسانہ ہو کر رہ گئے +

یہاں تک تمدن کے حُسن و قبح سے بحث کر کے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ تاریخ تمدن کی بابت علماء زمانہ کیا رائے رکھتے ہیں، نوع انسان کی تاریخ لکھنے والے محققین میں جہاں اس کی ابتدائے آفرینش کے مسئلہ پر بیحد قیل و قال ہے وہاں یہ مسئلہ بھی مختلف فیہ ہے کہ پیدائش انسان کس صورت اور ترکیب سے ہوئی، یعنی کون سے قوائے عقلی و دماغی سے انسان مرکب و مرتب ہو کر دنیا میں آیا؟ انسانی جماعتیں جو اب متمدن نظر آتی ہیں اُن کے تمدن کی تاریخ کب سے شروع ہوتی ہے، اور یہ وحشی اقوام جو آج غیر مہذب اور غیر متمدن کہلائی جاتی ہیں کیا ہمیشہ سے ایسی ہی ہیں یا کبھی اس سے

زیادہ بہتر حالت میں بھی تھیں، اور اب گردشِ زمانہ سے ایسی غیر متمدّن ہو گئی ہیں؟ یا یہ ہنوز اپنی فطرت پر ہیں؟ با لفاظ دیگر آیا زمانہ تمدّن و تہذیب مقدّم ہے یا زمانہ وحشت و جہالت؟ اس مسئلہ پر دو فریق جداگانہ رائے رکھتے ہیں +

انسان کی ابتدائے آفرینش کے بارے میں قدما کی رائے کو نظر انداز کر کے اُنیسویں صدی میں یورپ میں **ڈاروِن** نے جو نظریہ قائم کیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان ایک ترقی کردہ جانور ہے۔ اس نظریہ کو نظریہ ارتقا یا (**ڈاروِن**) کہتے ہیں، ڈاروِن اور **ھکسلے** اس نظریہ کے قائل ہیں، اگرچہ ہنوز اس کے دلائل تکمیل کو نہیں پہنچے ہیں اور سلسلہ استدلال کی بہت سی کڑیاں علم انسانی کی موجودہ حالت کے لحاظ سے ثبوت مزید کی محتاج ہیں، لیکن مدعیان کو یہ دعویٰ ہے کہ جس قدر سائنس میں ترقی ہو گی اور علم انسانی ترقی کریگا اُسی قدر وہ کڑیاں بھی ثبوت مزید کے دستیاب ہو جانے سے مضبوط و مستحکم ہوتی جائینگی، سردست جس قدر دلائل پیش کئے گئے ہیں اُن کی آب و تاب نے اہلِ نظر کی آنکھیں خیرہ کر دی ہیں اور عام طور پر یہی رائے مقبول ہو رہی ہے، اور نہ صرف بدایت انسان بلکہ تمدّن کے نشوونما کے بارے میں بھی ترقی اور روز افزوں ترقی کا ہر شخص قائل ہے +

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان کے تمدّن کی ابتدا کب سے ہوئی، اس بارے میں بھی دو مذہب ہیں اور دونوں متضاد ہیں، ایک گروہ اس کا حامی ہے کہ انسان کی ابتدائی حالت وحشت اور جہالت کی تھی، وہ براہین اور دلائل سے ثابت کرتا ہے کہ مرورِ ایام سے انسان نے بتدریج تمدّن طے کئے ہیں، اور اسلاف سے، خلاف زیادہ متمدّن ہوتے چلے آئے ہیں، لیکن ایک دوسرا گروہ محققین یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان اپنی بالکل ابتدائی حالت میں ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے، اگرچہ اس کو علوم حکمیہ اور فنون نفیسہ کا علم نہ ہو لیکن اس میں قوائے ذہنی اور عقلی کسی طرح بھی کمتر درجہ کے نہ تھے، اس فریق کے ایک بڑے حامی **ڈیوک آف ارگائل** کی رائے ہے کہ "انسان اپنے اعلیٰ درجہ تمدّن اور شائستگی کی حالت میں بھی نہایت پستی اور تنزّل میں پہنچنے کی استعداد رکھتا ہے۔ اسکا علم زائل ہو سکتا ہے اور اس کا مذہب چھوٹ سکتا ہے" +

بہرحال محققین آخر الذکر اس بات کے حامی ہیں کہ وحشی جرگوں میں از خود ترقی کی جانب مائل ہونے کی کوئی خاص قوّت نہیں ہوتی اور نہ اس امر کا کوئی خاص بیّن ثبوت ملتا ہے کہ اُنہوں نے کبھی از خود ترقی کی ہو، بلکہ بعض اقوام کی یکساں حالت پر غور کرتے ہوئے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ترقی کا مادہ سرے سے ہے ہی نہیں؛ جہاں وحشی اقوام آباد ہیں وہاں آثار قدیمہ کے محققین نے بیحد کد و کاوش کے باوجود بھی کوئی ثبوت گذشتہ تمدّن کا نہیں پایا، یعنی طبقات زمین سے کوئی علامت تمدّن قدیم کی نمایاں نہیں ہوئی، گویا اس گروہ کے نزدیک زمانہ ترقی کی جانب مائل نہیں ہے +

یہ مسئلہ اکثر معرضِ بحث میں رہا ہے اور ہر دو فریق اپنے اپنے دلائل سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر انسانی حالت کو بنظر غور و امعان مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا انکشاف ہو جاتا ہے کہ ایک کمزور مخلوق، برہنہ جسم، نازک بدن، اور ضعیف الاعضا جس کی حفاظت جسمانی کے لئے نہ کوئی ہتھیار ہے نہ کوئی یار و مددگار، اس زندگی کے جدال و قتال میں مبتلا کیا گیا ہے، وہ رفیع الشان کوہستان کو نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے اور اُن کی عظمت اُس کے دل میں دہشت پیدا کر دیتی ہے، وہ سُنسان بیابانوں، عمیق غاروں، اور وسیع بحر و بر کا مشاہدہ کرتا ہے، شیروں اور ہیبتناک درندوں کی

آوازیں سُنتا ہے اور اس پر سخت ہیبت طاری ہو جاتی ہے، فلک نیلگوں، روشن ستارے، آفتاب و ماہتاب اُس کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کر دیتے ہیں، اور یہ سب چیزیں اس کو محوِ حیرت بنا دینے کے لئے کافی ہیں، علاوہ اس کے بھوک، پیاس، گرمی، سردی، اس کے دشمن ازلی روز پیدائش سے اس کے ساتھ ہیں۔ یہ حالت اس وقت تھی جب نوع انسان نے کتم عدم سے اس عالم رنگ و بو میں اپنا پہلا قدم رکھا، لیکن اس کمزور مخلوق نے تمام حوادث طبیعی کا مقابلہ کیا اور ان کو مغلوب و مقہور کر کے اپنا اسقدر مسخر کر لیا کہ وہ پہاڑوں میں بآسانی سُرنگ لگا لیتا ہے، برسوں کا راستہ بحر و بر میں دنوں میں طے کر لیتا ہے، آفتاب ماہتاب سب اس کے ادنیٰ خادم ہیں غرض بقول شخصے ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند، کیا اس علمی تدبر اور تفکر کے بعد کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ انسان صرف ایک مادّی جسم کا نام ہے اور ہمیشہ سے یکساں حالت میں ہے؟ ہرگز نہیں، اس مادی انسانی جسم کے خلاف میں ایک ایسا جوہر مخفی ہے جس کی وجہ سے انسان کو دیگر حیوانات سے امتیاز اور خصوصیت ہے، اور وہ مابہ الافتراق شے نہ تو نطق ہے جیسا کہ **ارسطو** کا قول ہے اور نہ محض دینداری جیسا کہ **میسیو کاٹکرونگ** ایک فرانسیسی فلسفی کا خیال ہے، بلکہ دراصل وہ عقلی اور اخلاقی ترقی کرنے کی بیش بہا استعداد اور قابلیت ہے جس کی کوئی حد و غایت نہیں قرار دی جاسکتی ہے، حیوان ایک خاص اور مقرّرہ حد تک ترقی کر سکتا ہے، لیکن انسان کے لئے کوئی حد نہیں ہے، اس دعوے کی دلیل میں دو مشہور مغربی فلاسفروں کی رائیں قابلِ لحاظ ہیں، علامہ **لاروس** (　　) ایک فرنچ فلاسفر نے اپنی کتاب **دائرۃ المعارف** میں انسانی ترقی کی نسبت لکھا ہے "کہ انسانی ترقی کے لئے کوئی خاص حد قرار دینا ایک ایسی حرکت ہے جو معیوب خیال کی جاسکتی ہے"۔

میسیو رنیان (　　) نے اپنی مشہور کتاب تاریخ الادیان میں لکھا ہے کہ "میں نے انسان کی حالت کو بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے، بعض اوقات انسان اپنی تمام قوتوں کو مجتمع کر کے اس امر کی سخت کوشش کرتا ہے کہ اُس کو وہ سبب دریافت ہو جائے جس کی وجہ سے اُس کو غیر محدود و نامتناہی اختیار و اقتدار حاصل ہے، نیز تاکہ وہ اس تمام مادی عالم پر مسلّط ہو جائے"، اس سے یہ امر بالکل واضح ہے کہ انسان اپنے جوہر کی برتری اور گرانمائیگی کے لحاظ سے ان تمام مادّی چیزوں میں ممتاز ہے جس کو قدرت نے محدود پیدا کیا ہے، اس سے یہ ظاہر ہے کہ انسان کبھی یکساں حالت میں نہیں رہ سکتا بلکہ یوماً فیوماً ترقی کے میدان ترقی کے میدان طے کرتا چلا جاتا ہے، لیکن جس طرح نوع انسان میں فضائل و کمالات کی طرف غیر متناہی درجات تک ترقی کرنے کی قابلیت ودیعت کی گئی ہے، اسی طرح رذائل کے نامحدود درجات کی طرف تنزّل کرنے کی استعداد بھی اس میں رکھی گئی ہے، انسان نہ تو کوئی آسمانی فرشتہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور رغبتوں اور نیز ان کے منغص کرنے والی تلخیوں سے کوئی تعلّق نہ رکھے، نہ وہ حیوان لایعقل ہے کہ زندگی کی تاثیرات اور اُس کے آلام و اسقام کا احساس اُس کے دل میں کمزور ہو، بلکہ وہ ان دونوں درجوں کے درمیان میں ہے، اگر وہ اپنے نفس کا کما حقہٗ احترام کرے تو فرشتوں سے بھی اعلیٰ ہو سکتا ہے، اور اگر نفسانی فرائض کی بجاآوری میں کوتاہی کرنے لگے اور بشریت کے تسلّط کا مطیع ہو جائے تو تنزّل و انحطاط کے عمیق ترین گڑھے میں گر جائے گا ؎

آدمی زادہ طرفہ معجونیست

ہذہ من التطور الشاسعۃ وضع حد لترقی الانسان"

کز نوشتہ سرشتہ وز حیواں
گر کند میل ایں بود بہ ازیں
در کند میل آں شود بہ ازاں

تاریخ تمدن پر نظر ڈالتے ہوئے تمدن انسانی کی تقسیم چار بڑے بڑے عہدوں پر ہوسکتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انسان نے کس طرح مدارج ترقی طے کئے +

پہلا وہ دور جس میں انسان حیوانات دیگر کے ساتھ خلط ملط رکھتا تھا اور انہیں سے گھلا ملا رہتا تھا، اس کے گردوپیش نہایت عظیم الجثہ جانور رہتے تھے جن کا اب صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ بعض مقامات پر اسفل ترین طبقات ارض میں اُن کے ڈھانچے برآمد ہوتے ہیں، اُس وقت انسان کی حالت محض چارپایوں اور درندوں کی سی تھی اور غالباً اس کی زندگی اور ایک جانور کی زندگی میں کوئی فرق نہ تھا، اس کے کھانے کے واسطے جنگلی میوے اور کمزور جانور موجود تھے، اور اس کی بود وباش کے لئے پہاڑوں کے غار اور درختوں کی سایہ دار شاخیں کافی تھیں +

دور ثانی وہ ہوا جس میں اس نے پتھروں کے سڈول ہتھیار اور اوزار بنانا اور اُن سے کام نکالنا شروع کیا، یہ عہد حجر یا (Stone age) کہلاتا ہے، اس وقت اس کے کل کام یا تو خود اس کے قوت بازو سے نکلتے تھے یا پتھروں کے ذریعہ سے، پتھر ہی اس کے آلات حرب و ضرب تھے، پتھر ہی اس کے ظروف اکل وشرب تھے، اور پتھروں ہی میں وہ رہتا تھا۔ یہ عہد تمام اکناف عالم میں مشترک ہے +

دور ثالث وہ ہوا جس میں برنجی اور مسی آلات اور اوزار بنائے گئے، اسے عہد مس وبرنج یا (copper age) کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس عہد کا پتہ زیادہ تر ایشیا اور یورپ کی قدیم قوموں میں ملتا ہے اور انہیں کے یہاں یہ عہد صدیوں تک قایم رہا، لیکن بالیشیا، جنوبی افریقہ اور وسطی امریکہ میں عہد حجر کے بعد یہ عہد نہیں ہوا بلکہ دور چہارم جسے آہنی عہد یا (Iron age) کہتے ہیں شروع ہوگیا، اس عہد میں آہنی آلات تمام سابقہ آلات وظروف پر سبقت لے گئے، لیکن اس عہد میں بھی آلات حجر موجود رہے مگر فوقیت لوہے کو رہی، اسی طرح دور چہارم اس سے زیادہ ترقی یافتہ انسانوں میں پایا گیا اور سلسلہ ترقی پکڑ گیا +

لیکن ان چاروں عہدوں کے علاوہ ایک اس صورت سے بھی ترقی کے مدارج بیان کئے جاتے ہیں کہ پہلا وہ دور تھا جب انسان جنگل کا ایک شکاری تھا کہ وہ مختلف درندوں اور پرندوں کو مار کر اپنی قوت لایموت مہیا کرتا تھا، پھر دوسرے دور میں اس نے ترقی کرکے ماہی گیری شروع کی اور دریا سے مچھلیاں مارنے کے واسطے اس نے جال اور دیگر سامان تیار کئے - پھر میوہ برداری پر اس نے اپنی توجہ مبذول کی اور فواکہات کے مزے سے اس کے کام و دہن آشنا ہوئے، اس حالت میں اسے درختوں کی مختلف فصلوں کا علم ہوا اور تجربہ نے اس پر ایسے نکات اور رموز منکشف کردیئے جن سے اس نے درختوں کا بونا اور کاشت کرنا سیکھا، اس زراعت میں اس کو اس قدر فراغت نصیب ہوئی کہ مختلف فنون وحرفت ومشقت میں اس نے قدم رکھا اور سوشل خیالات اور پولیٹکل معاملات کا چرچا شروع ہوگیا، اسی سلسلہ میں شخصی انتقام کی خواہش کی جگہ یہ خیال پیدا ہوا کہ ہر جرم اس لئے سزا کے قابل ہے کہ اس سے سوسائٹی کے امن میں خلل پیدا ہوتا ہے، اس طرح ایک قبیلہ کی حکومت ایک شخص واحد کے ہاتھ سے نکل کر متعدد گھرانوں اور خاندانوں کا ایک مجموعہ بنا اور پھر دائرہ تمدن ترقی کرتے کرتے اس قدر

بڑھاکر ملکی اور قومی حکومت کے لئے ریاست و بادشاہت معرض وجود میں آئیں +

بنی آدم کا تمدن متعدد حیثیتوں سے ایک مذہب سے وابستہ ہے، اقوام کے عروج و زوال میں ان کا مذہب بہت کچھ دخیل ثابت ہوا ہے، یہانتک کہ زمانہ قدیم سے اب تک یہ امر زیر بحث ہے کہ ان میں سے کون سبب ہے زمانہ گذشتہ کے محققین اور نیز اہل مذہب اس رائے پر پہنچے ہیں کہ مذہب سبب ہے اور تمدن اس کا نتیجہ، ان کی تالیفات و تصنیفات مذاہب کی نسبت طعن و تشنیع سے مملو نظر آتی ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی آنکھیں ان کی روشنی طبع سے اسقدر خیرہ ہوگیئں ہیں کہ مذاہب ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں رہے، وہ مذاہب کو صفحہ ہستی سے محو ہوجانے کی دھمکی دے رہے ہیں، چنانچہ اس موقع پر ہم چند یورپین فلاسفروں کی رائے ان کی مشہور و معروف تصانیف سے اخذ کرکے اس کے اسناد پیش کرتے ہیں۔

مسیو بنجمن کونسٹان ( )

نے اپنی مشہور کتاب میں جس کا نام "مذہب اور اُس کا سرچشمہ اور اُس کی شکلیں اور اُس کی ترقی"، ہے ان امراض سے بحث کی ہے جنہوں نے باطل اعتقادات کی مدد سے انسانی گروہوں کے جسم کو کھوکھلا ڈالا ہے اور اسکے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ان کا علاج شخصی آزادی، ضمیر یا کانشینس کی آزادی، اعتقاد کی آزادی اور تمام ضروری آزادیوں کے بغیر ناممکن ہے، پھر وہ لکھتا ہے کہ "اس طریقہ سے مذاہب اپنے ہر قسم کے زنگ اور میل سے پاک و صاف ہوجائیں گے مگر ہم کو خیال نہیں کہ ایسا ہو سکے کیونکہ مذہبی اصول و قواعد میں سے کوئی قاعدہ بھی ایسا نہیں ہے جس کو زنگ نہ کھا چکا ہو اور چونکہ یہ اصول و قواعد منافی علم ہیں اس لئے یہ بالکل واضح ہے کہ تمام مذاہب اور دین ضرور ایک روز صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہوجائیں گے"، یہاں ایک مشہور فلسفی نے اپنی رائے کے مطابق تمام مذاہب کے لئے بغیر کسی استثنا کے یک قلم پیشین گوئی کردی ہے کہ ان کا زوال لازمی اور ضروری ہے، آگے چل کر وہی لکھتا ہے کہ "ہر ایک قاعدہ خواہ وہ موجودہ حالت میں کتنا ہی مفید کیوں نہ ہو لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور ہوگی جو آیندہ زمانہ میں ترقی کے لئے سدّ راہ ہوگی، چونکہ وہ قاعدہ ایک عرصہ کے بعد ایک ساکن شکل اختیار کریگا جس کا اتباع عقل انسانی کے لئے اپنے اکتشافات میں جن کی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے ناممکن ہوگا اور جب ایسا ہوگا تو اس منجمد قاعدہ کا مذہبی احترام دلوں سے مفقود ہوجائیگا اور ایسے اصول و قواعد کی تلاش ہوگی جو ان جدید ترقیات اور اکتشافات کے منافع نہیں ہیں" +

علامہ ویرلش مذہب کے بارے میں ایک موقع پر لکھتا ہے کہ "مذہبی فضیلت اور بالخصوص اعلیٰ درجہ کی فضیلت جو اولیا اللہ کے ساتھ مختص ہے یہ ہے کہ تمام سیاسی اور تمدنی زندگی کو خیرباد کہو اور تمام دنیوی کاروبار کو مثل ایک لغو اور باطل چیز کے ترک کرو تاکہ تمہارے لئے یہ امر ممکن ہو کہ تم رنج و غم اور شکستہ دلی کے ساتھ جنت کے انتظار میں سکھتے رہو اور اپنی تمام طبعی خصلتوں اور خواہشات کو قتل کرڈالو اور اپنے نفس کو مٹادو" +

غرض یہ ہے کہ فلاسفران یورپ اور ماہرین علوم مغربی یہ رائے رکھتے ہیں کہ انسان کی ترقی کا انحصار علم کی ترقی اور اس کے نشو و نما پر ہے، اور علم کی ترقی اس امر پر موقوف ہے کہ عقل کو اس کے قیود سے آزاد کردیا جائے اور علمی مباحث کے لئے کسی قسم کی کوئی مزاحمت اور روک ٹوک باقی نہ رہے تاکہ اس

غازی مصطفی کمال پاشا

هر کجا راه دهد اسپ بران تا زکه ما

بار ها مات درین عرصه بتدبیر شدیم (نظیری)

موسولینی

شهنشاه رضاخان شاه ایران

آن مسلمانان که میری کرده اند
در شهنشاهی فقیری کرده اند

(اقبال)

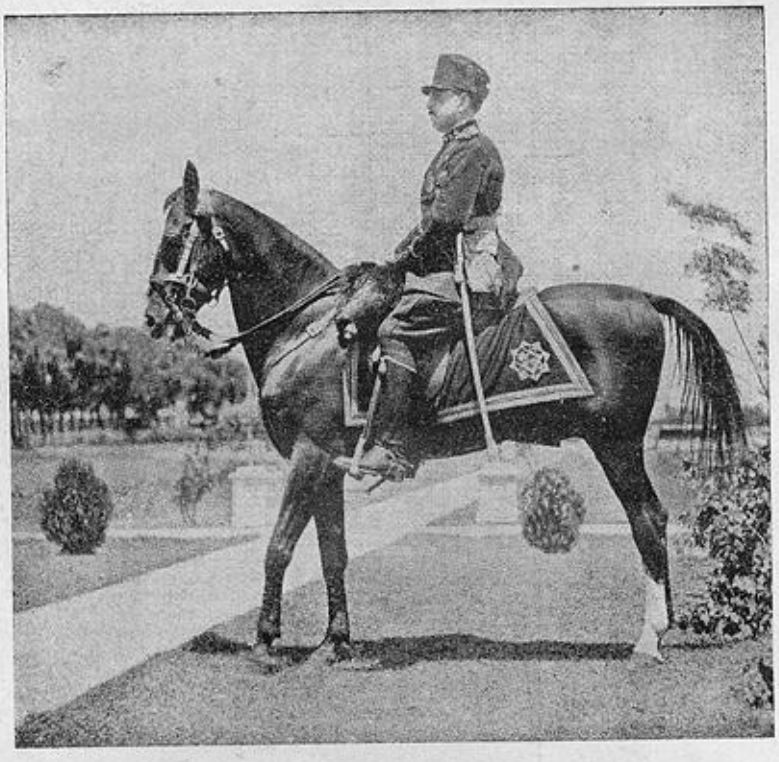

ای امیرِ کامگار ای شهریار
نوجوان و مثلِ پیران پخته کار

خیز و اندر گردش آور جامِ عشق
در قهستان تازه کن پیغامِ عشق

(اقبال)

مزاحمت سے وہ بدترین نتائج پیدا نہ ہوں جو قدیم زمانوں میں علمی اور مذہبی گروہوں کے باہمی جدال و قتال سے پیدا ہوئے تھے، ان کا اعتقاد ہے کہ عقل اور علم کی آزادی پر انسان کی مادی اور ادبی صلاح و فلاح منحصر ہے،

علامہ روس ( ) پر ایک مقام پر لکھتا ہے کہ "جب ہم کہتے ہیں کہ مناسب یہ ہے کہ ہم معقول چیزوں کا اعتقاد رکھیں تو اہل مذہب کہتے ہیں کہ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، پھر وہ انسانی عقل کے مٹیے کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جو عدل و ظلم اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرنے کا دعویٰ کرتی ہے اور جب وہ عقل اور بصیرت کو استعداد اندھا کر دیتے ہیں کہ کرامات اور خوارق عادات اس کو بالکل معمولی اور عادی امور معلوم ہونے لگتے ہیں اور وہ عقل سفید کو سیاہ اور بدی کو نیکی سمجھنے لگتی ہے تو مذہب کہتا ہے کہ اطاعت کرو، کس کی اطاعت کریں؟ آیا عقل کی اطاعت کریں؟ اپنے نیچرل خرائض کی؟ دلی احساسات کی؟ حقیقی قوانین فطرت کی جو انسان کے لئے مفید ہیں؟ ہرگز نہیں، مگر تم اندھے بن کر اس شخص کی اطاعت کرو جو خدا کے نام سے حکم دیتا ہے اگرچہ وہ بادشاہ کے قتل کرنے یا باپ کے مار ڈالنے کا ہی حکم دے، یا ایک قتل عام برپا کرنے پر آمادہ کرے۔ کیونکہ تجھ میں نہ روح ہے نہ خمیر بلکہ تو خدا میں فنا ہو گیا"۔

یہ ہیں وہ اعتقادات اور خیالات جن پر علمائے یورپ مذہب کے بارے میں فخر کرتے ہیں اور تمام ترقیات کو اپنے ذاتی عقول پر منحصر کرتے ہیں، لیکن وہ اس زریں اصول سے بے خبر ہیں کہ الدین ھو العقل ولا دین لمن لا عقل له اس میں شک نہیں کہ عقل نوع انسان کی بہترین خصوصیت ہے اور خداوند تعالیٰ کی افضل ترین نعمت جو انسان کو عطا کی گئی ہے، جس مقصد کے لئے یہ عظیم الشان نعمت عطا ہوئی ہے اگر اسی مقصد میں استعمال کی جائے اور اس کی صحت و اعتدال قایم رکھنے کی توجہ مبذول کی جائے تو اس سے حیرت انگیز نتائج ظاہر ہوتے ہیں، چنانچہ اسی عقل کی بنا پر جہاں علمائے یورپ مذہب کے بارے میں اس قدر مخالف ہیں وہاں وہ اس امر کا بھی اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ مذہبی احساس نفس انسانی میں ایک ایسا فطری اور خلقی احساس ہے جیسا کہ انسان کو غذا اور ہوا کی ضرورت کا احساس ہے، چنانچہ

علامہ جیسلر ( ) ایک جرمنی فلاسفر اپنی کتاب تاریخ الاعتقاد میں لکھتا ہے کہ "مذہب مثل اس احساس کے جس کا وہ نتیجہ ہے ہمیشہ رہنے والی چیز ہے، مگر مذہبی علوم مثل دیگر علوم و فنون کے ہیں، جو رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کرتے جاتے ہیں جس قدر کہ انسانی عقل ترقی کرتی ہے، اور انسانی تعلق ہمیشہ حقوق اور علم قوانین کے درمیان موجود رہتا ہے"۔ خود لاروس ہی مذہبی نظامات کی نسبت طعن کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ "جو چیز انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی پر آمادہ کرتی ہے وہ مذہب نہیں ہے بلکہ وہ عام خیال ہے اور قوت طبیعت اور نیز وہ احساسات ہیں جن کی نشوونما سوسائٹی اور خاندان کے درمیان ہوتی ہے، جس قدر کہ معلومات اور تمدن کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اسی قدر یہ عام خیال بھی اپنی موجودہ سطح سے اونچا ہو جاتا ہے، اگر مذہب کی یہ تعریف ہے کہ وہ ایسے عمدہ خیالات کا مجموعہ ہے جو تمام انسانی افراد کو ایک ایسی سوسائٹی میں مربوط کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کے افراد مادی فوائد سے متمتع اور روشن خیال ہوں تو بے شک اس صورت میں یہ قول صحیح ہوگا کہ مذہب نوع انسان کے لئے ایک ضروری اور لابدی چیز ہے"۔

یہ امر کہ عقل انسانی خواہ ترقی کے کسی اعلیٰ ترین درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے مگر وہ بغیر مذہب کے زندہ نہیں رہ سکتی اس کی واضح دلیل ہے کہ علمائے یورپ نے بھی باوجود مخالفت مذہب بالآخر مجبور ہو کر ایک مذہب تصنیف کیا جس کا نام مذہب طبعی رکھا۔ اس کے علاوہ ہم روزانہ برائی العین مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ موجود ہیں جو جسمانی صحت سے متمتع ہیں، دولت و ثروت میں قارون ثانی ہیں اونہوں نے مختلف علوم و فنون میں تعلیم و تربیت پائی ہے، مگر باوجود ان تمام باتوں کے ان کو ہر وقت ایک قسم کی اندرونی گھبراہٹ اور دلی بے اطمینانی اور بے چینی اور سخت حیرت ہوتی ہے جو ان کی تمام راحتوں اور لذتوں میں مثل کانٹے کے کھٹکتی رہتی ہے، ان کو اپنے دل میں ایک ایسا تکدر اور ملال محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی سبب ان کو معلوم نہیں ہوتا، اور جو صرف اسی وقت زائل ہوتا ہے جبکہ مذہب کے آب آتشیں رنگ کا ایک گلاس ان کو تسکین بخش مل جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ اس پر اس قدر فریفتہ اور دلدادہ ہو جاتے ہیں کہ بعض مرتبہ تمام دنیوی جاہ و مال اس کے سامنے ہیچ معلوم ہونے لگتا ہے +

مذہبی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے اب ہم اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتے ہیں یعنی انسان کے مدنی الطبع ہونے سے بحث کرتے ہیں، یہ امر مسلّم الثبوت ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع پیدا کیا گیا ہے، یعنی انسانوں کی ایک جماعت کثیرہ کا راحت سے عمر طبعی تک پہنچنے اور آیندہ نسلوں کو راحت و آرام سے عمر طبعی تک پہنچانے کی غرض سے باہم مل کر بود و باش اختیار کرنا انسانی فطرت ہے +

جب راحت سے عمر طبعی تک پہنچنے اور آئندہ نسلوں کو عمر طبعی تک براحت و آسایش پہنچانے کے لئے ایک کثیر جماعت باہم مل کر رہتی ہے، تب ان میں تعامل اور تعاون شروع ہوتا ہے، یعنی تمام وہ امور جو شخصی، اہلی اور نوعی زیست کے باقی رہنے اور بہتر ہونے کے لئے ضروری ہیں ان کو وہ سب اشخاص آپس میں علیٰ قدر مراتب بانٹ لیتے ہیں، ہر شخص کے ان تمام کاموں میں سے جو وہ روزانہ انجام دیتا ہے تھوڑے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی ذات کے لئے کرتا ہے، اور زیادہ وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے فائدہ کے لئے ہوتے ہیں +

تصاحب اور تعامل سے جو مطلق آزادی کسی جزیرے کے ایک تنہا باشندے کو ہو سکتی تھی اس میں بڑا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، تنہائی میں وہ اپنے فعل کا خود مختار تھا لیکن تصاحب و تعاشر میں یہ ناممکن ہے بلکہ دوسروں کا خیال غالب ہوتا ہے، تنہائی میں صرف اپنی زیست راحت سے بسر کرنے کی فکر ہوتی ہے، تصاحب و تعاشر میں نوع انسان کی زیست کی فکر اس پر زیادہ ہو جاتی ہے +

اب جبکہ انسان کا بالطبع مدنی الطبع ہونا ثابت ہو گیا تو ضرورت اس امر کی ہوئی کہ یہ معلوم کیا جائے کہ اس کا برتاؤ ایک دوسرے کے ساتھ کن اصول پر ہونا چاہئے، آیا اس کو اپنی ذاتی خواہشات پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دینا چاہئے یا اپنی ضروریات زندگی کو مقدم سمجھنا ضروری ہے، جب ہر فرد کے انفرادی افعال جو زیست میں دخل رکھتے ہیں اس اعتبار سے کئے جائیں کہ وہ فاعل کی زیست کو راحت و آرام کے ساتھ عمر طبعی تک پہنچا دیں تب وہ نافع للذات کہلاتے ہیں، اور جب اس اعتبار سے کئے جائیں کہ اُن سے اپنی ذات کے برخلاف دوسروں کو فائدہ ہو تب وہ نافع للغیر کہلاتے ہیں، بالفاظ دیگر اپنے ذاتی مقاصد کی طلب کا نام انانیت ہے اور

دوسروں کے مقاصد کی طلب کو اخوانیت سے تعبیر کرتے ہیں +

انسان میں راحت پسند اور صحبت پسند ہونا دونوں امر طبعی ہیں اور وہی ان تمام افعال کی بنا ہیں، جن کا تعلق زیست سے ہے، اس لئے تمام افعال خواہ وہ نافع للذات ہوں یا نافع للغیر باہم ایسے وابستہ ہیں کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، تصاحب اور تعامل کی حالت میں جس قدر نافع للذات افعال واجب ہیں اسی قدر نافع للغیر بھی واجب ہیں، اب وہ اشخاص صرف نافع للذات افعال کرتے ہیں اور نافع للغیر کو چھوڑ دیتے ہیں وہ اصول تصاحب اور تعامل کو برہم کر کے قوم کی تباہی کا سبب ہوتے ہیں اور چونکہ خود بھی قوم کے ایک فرد ہیں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اشخاص جو اپنا وقت عزیز زیادہ افعال للغیر میں گذارتے ہیں اور ضروری نافع للذات کی پرواہ نہیں کرتے وہ فنا ہو جاتے ہیں، ہربرٹ اسپینسر نے اس موضوع پر کافی توجہ کی ہے اور انائیت اور اخوانیت دونوں میں توافق و تطبیق کی کوشش کی ہے، اس نے دکھایا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی میں بھی اگر افراط پسندی سے کام لیا جائے تو خود اسی کی بربادی لازم آتی ہے۔ اگر ہر شخص اپنے ہی اغراض کا طالب ہو تو کسی فرد کی بھی غرض نہ حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ ہر آدمی اکثر حالات میں دوسروں کی مدد کا محتاج ہوتا ہے، اور تمام افعال اپنی زیست کے لئے انجام نہیں دے سکتا دوسری طرف اگر ہر شخص اپنی ذات کو تمامتر صرف دوسروں کے لئے وقف کر دے تو یہ خود اسی کے لئے مضر ثابت ہوگا، اس لئے کہ اگر ہر شخص خود اپنی خبر گیری سے بے پرواہی برتے تو وہ اس اہلیت کو نقصان عظیم پہنچائیگا جو اس میں دوسروں کی اعانت کی ہے، اور اصل فائدہ مفقود ہو جائے گا، اس بحث کو فلاسفر مذکور نے نہایت دلچسپ طریقہ پر بیان کیا ہے اور بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ہمارا مقصد نہ تو خالص انائیت ہونا چاہئے اور نہ محض اخوانیت۔ بلکہ ان دونوں کی تطبیق و توفیق +

لیکن یہاں اگر ذرا نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ فی الحقیقت انائیت اور اخوانیت میں اس سے بھی کم منافات و تباین ہے جتنا کہ ہربرٹ اسپینسر کو نظر آتا ہے، اس لئے کہ نفس کی حقیقی تکمیل صرف مقاصد اجتماعیہ ہی کی تکمیل سے ممکن ہے، چنانچہ ہیگل کا مقولہ ہے کہ "ہم اپنی تکمیل اپنی قربانی سے کر سکتے ہیں"، اور اس طریقہ سے جس حد تک ہم کو اپنی ذات کا تحقق ہو جاتا ہے اسی حد تک ہم کلی نقطۂ نظر سے قریب ہوتے جاتے ہیں، یعنی وہ نقطۂ نظر جس سے ہماری نگاہ میں اپنی شخصی بھلائی کسی دوسرے کی بھلائی سے زیادہ اہم نہیں رہ جاتی، اس میں شک نہیں کہ اپنی انفرادی ترقی کا خیال دوسروں کی ترقی کے مقابلہ میں ہمارے لئے ہمیشہ لازمی ہے، کیونکہ اپنی ذاتی ضرورتوں کو ہر شخص خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے اور اپنی ذات کی ترقی و تکمیل کے وسائل خود ہی خوب جانتا ہے، لیکن اپنی ذات کی فلاح اندیشی، جماعت کی فلاح اندیشی کے نقطۂ نظر پر مبنی ہو تو اس کو صحیح معنوں میں انائیت نہیں کہا جا سکتا، اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ ایک فرد کی تکمیل ہے، لیکن جماعت کے لئے جس میں ذاتی خواہشوں کو اجتماعی منافع کے لئے قربان کر دیا جاتا ہے اور ذاتی ترقی کا اصل مقصد اجتماعی ترقی ہوتی ہے، جب یہ مسلم ہو جائے تو انائیت اور اخوانیت میں کوئی تناقض نہیں رہتا، کیونکہ اس صورت میں ہم نہ صرف اپنی بھلائی چاہتے ہیں

اور محض دوسروں کی بلکہ دونوں کی اور یہ سمجھ کر کہ دونوں ایک ہی کل کے جزو ہیں +

انفرادی ہستی بحیثیت ایک فرد ہونے کے بالکل نیست ہے، چنانچہ **ارسطو** نے انسان کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ "ایک سیاسی حیوان ہے" اور اخلاقیات پر جبتک اس کو سیاسیات یعنی علم جماعت یا سوسائٹی کا ایک جز نہ قرار دیا جائے تسلی بخش بحث نہیں ہوسکتی، کیونکہ جس قدر بھی کہ فرائض و محاسن اخلاق ہیں وہ ہر قدم پر ہمارے ایک دوسرے کے ساتھ باہمی روابط پر موقوف ہیں۔ اگرچہ دور جدید انفرادی آزادی اور شخصی حریت کا حامی نظر آتا ہے لیکن حکمائے قدیم کے خیالات اس کے برعکس معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ افلاطون کی مشہور کتاب جمہوریت ہے جس میں وہ انسان کی اجتماعی فطرت سے اس درجہ متاثر تھا اور اجتماعی پہلو سے حیات انسانی کے مطالعہ کو اس قدر ضروری جانتا تھا کہ انفرادی محاسن اور شخصی آزادی کی تحقیق کی بجائے پہلے اس نے اچھی حکومت کے ممیزات معلوم کرنے کی کوشش کی، ان پر کافی روشنی ڈالنے کے بعد اس کے نزدیک ایک عمدہ شخص واحد کا امتیاز نہایت آسان تھا، یہی وجہ ہے کہ اخلاقیات میں افلاطون کی سب سے بڑی تصنیف اس کی کتاب جمہوریت ہے جس میں اس نے ایک نصب العینی حکومت کا خاکہ کھینچا ہے۔ یونانیوں کی عام رائج تقسیم کی رو سے اس حکومت کے وجود کے لئے افلاطون کے نزدیک چار بڑے فضائل کا کسی شخص واحد میں پایا جانا ضروری تھا۔ حکمت، شجاعت عفت اور عدالت، ان فضائل کی جو اہمیت حکومت کے لئے ہے اس سے وہ انفرادی زندگی میں ان کی اہمیت کا نتیجہ نکالتا تھا +

نہ صرف افلاطون ہی بلکہ ارسطو کو بھی انسان کے مدنی الطبع ہونے کا کچھ کم دعویٰ نہ تھا، اس نے اخلاقیات پر جو بلند پایہ کتاب لکھی ہے اس کا حصہ اولین یہی ہے کہ اخلاقیات سیاسیات کا ایک جز ہے، اس کی کتاب ان تمام فضائل سے مملو ہے جو کسی حکومت میں اچھے شہریوں کے لئے ضروری ہیں اور جن کو وہ یونان میں موجود پاتا تھا، لہذا معلوم ہوا کہ یونانیوں کا بہترین علم اخلاق ایک ایسی حکومت کے تخیل پر مبنی تھا جس کے اندر رہکر افراد کو اپنی زندگی کی تکمیل کرنی چاہئے، اور فرقہ رواقیہ یا

کا مسلک صرف اس وقت وجود میں آیا جبکہ یونانی حکومت کا بہترین زمانہ گذر چکا تھا، اور ان پر روم کے باشندے فاتحانہ حکومت کر رہے تھے +

رواقیت کی رو سے نیکوکار انسان جس کو وہ حکیم کے نام سے موسوم کرتے تھے کسی خاص رشتہ اجتماعی کا پابند نہیں ہوتا تھا بلکہ خود اپنی مستقل اور آزاد زندگی رکھتا تھا، لیکن باوجود اس کے وہ اس کو تسلیم کئے بغیر نہیں رہ سکے کہ ایک اعلیٰ اخلاقی آدمی اچھا شہری ہوتا ہے، ان کی تعلیمات جسمانی، روحانی، اخلاقی بلند اور اعلیٰ تھیں، لیکن اصول تمدن سے اجتماعی روابط کی ان میں کمی پائی جاتی تھی، جس نے ان کو زمانہ کی نظروں میں تقریباً بے معنی اور خارج از انسانیت بنا دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تعلیمات انفرادی آزادی کے قریب لفاظیوں کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے +

یہاں آکر ہم کو اس کا بھی انکشاف ہو جاتا ہے کہ مسیحیت میں رہبانیت کس حد تک جائز ہے، اسی رواقیت کے اصول پر مسیحیت نے بھی یہی راہ اختیار کی یعنی عیسائی مذہب کی بنیاد بھی بلا تقید ملک و ملت رواقیت پر ہے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی مستقل بالذات

اور مستغنی عن الاجتماع حیات کی قائل نظر آتی ہے، اس کا مسلک یہ ہے کہ ہر شخص کو خود اپنی نجات کی راہ نکالنا چاہئے، اور زندگی کے اعلیٰ نصب العین کے حصول کے لئے والدین، اعزہ و اقارب اور دوست احباب تک کو چھوڑ دینا چاہئے۔ چنانچہ بڑے بڑے خدا پرست جنگل بیابان یا پہاڑ کی کھوہ میں عبادت الٰہی میں مصروف رہنا پسند کرتے رہے ہیں، اور اس متمدن زندگی پر اس رہبانیت کی زندگی کو بہمہ وجوہ ترجیح دیتے ہیں، لیکن اگر اصول مسیحیت پر اور اُس زمانہ پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت کو اپنے زمانہ میں چونکہ ایک بالکل نئے حالات کی دنیا سے مقابلہ کرنا تھا اس لئے لازمی طور پر اس کو رہبانیت پر کسی قدر زیادہ زور دینا پڑا، لیکن جب اس نے کچھ عرصہ بعد ایک بڑی دنیا کو فتح کر لیا تو اس کا اجتماعی رخ سامنے آنے لگا اور بالآخر وہ اس پر زور دینے میں بھی کسی دوسرے مذہب سے پیچھے نہیں رہا کہ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند + کہ در آفرینش ز یک جوہر اند، اور کمال رسی کے لئے خدا اور بندوں دونوں کے ساتھ اتصال و اتحاد ضروری ہوگیا، چنانچہ عیسائی دنیا میں بھی اب یہی رُخ زیادہ اہم اور ضروری خیال کیا جاتا ہے +

اس کے بعد جب ہم مذہب اسلام کی طرف نظر کرتے ہیں تو صاف الفاظ میں ہم کو نظر آتا ہے کہ لا رہبانیۃ فی الاسلام یعنی اسلام میں غیر متمدن زندگی کسی طرح جائز ہی نہیں ہے۔ اصول شرع یہ تعلیم دیتے ہیں کہ ہم کسی طرح بھی غیر متمدن زندگی بسر کرکے عاقبت میں نجات کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ وہ رہبانیت کی زندگی کو سرے سے ہی ناجائز بتاتے ہیں، اور اگر ذرا بھی غور و خوض سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ در اصل انسان ایک دوسرے کا

اس قدر محتاج پیدا کیا گیا ہے کہ وہ رہبانیت کی زندگی بہ راحت بسر ہی نہیں کر سکتا۔ یہ مسئلہ اس وقت بالکل صاف ہو جاتا ہے جب یہ فرض کر لیا جائے کہ کسی خاص جگہ کے تمام باشندے رہبانیت کی زندگی بسر کرنے لگے، قیاس اس کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ ان کی مایحتاج اشیاء کی فراہمی کس صورت سے ممکن ہے، جب ایک اصول چند افراد کے لئے محال ہو تو اقوام کے لئے وہ کس طرح قابل تقلید ہو سکتا ہے، انسان کو شخصی زندگی قایم رکھنے والی چیزوں کے بعد جس اشد ضرورت کا احساس ہوتا ہے وہ نوع انسان کے گروہ کو ایک جامع ہو کر رہنے کی ضرورت ہے، اس میں شک نہیں کہ ہر انسان ذاتی طور پر بالکل آزاد ہے اور کوئی چیز اس کو مقید نہیں کر سکتی، لیکن اگر اس کا دوسرا رُخ اٹھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک دوسری حیثیت سے وہ اسقدر ضعیف اور عاجز ہے کہ اس کو اپنی زندگی کی حفاظت کی غرض سے اس آزادی کا ایک بہت بڑا حصہ قربان کرنا پڑتا ہے، اسی وجہ سے علمائے تمدن کا اتفاق ہے کہ انسان اپنی طبیعت کے برخلاف اجتماع کے لئے مجبور ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی ناممکن ہے، اور وہ اس سے کسی وقت بھی مستغنی نہیں ہو سکتا، لہذا ظاہر ہے کہ انسان کو اپنی ایحتاج کی فراہمی اور اس دنیا میں سہل الحصول زندگی بسر کرنے کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ وہ ایک دوسرے سے متحد ہو کر رہے، بجز دیوانوں کے باقی ہر شخص کی زندگی تقریباً ایک مربوط شیرازہ ہوتی ہے، اس کے افعال کم و بیش ایک ترتیب نظم و نسق کے تحت میں واقع ہوتے ہیں، اوّل روز سے جب وہ اس عالم میں اپنی آنکھ کھولتا ہے تو اس کو ضروریات زندگی دوسرے کی طرف دستِ سوال دراز کرنے پر مجبور کرتی ہیں، بچہ کو جب بھوک بیتاب کرتی ہے تو وہ رُو کر

اپنی ماں سے دودھ طلب کرتا ہے، جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو ستر پوشی کے لئے اُس کو کپڑے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اسی طرح جب شیر مادر سے تغذیہ بند ہو جاتا ہے تو حیوانات اور نباتات کی طرف اُس کو اپنی توجہ مبذول کرنا پڑتی ہے، جس قدر وہ ترقی کرتا جاتا ہے اُسی قدر اُس کی ضروریات زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں، ان تمام ضروریات کو ایک فرد واحد کس طرح انجام دے سکتا +

دیگر افراد بنی نوع مل کر اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کی ضرورت کے انجام دہی میں وقت صرف کرتے ہیں، ایک بڑھئی عمدہ عمدہ کرسیاں، الماریاں اور انواع واقسام کا فرنیچر تیار کرتا ہے وہ سب اُس کے لئے بیکار ہے، لیکن ایک عمدہ کوٹھی کے لئے نہایت ضروری ہے، بڑھئی کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ اناج اور کپڑا ہے لیکن وہ خود اُس کے پیدا کرنے یا بنانے سے عاجز محض ہے، ایک کسان اناج دیکر بڑھئی سے کولھو یا ہل تیار کراتا ہے، لوہار سے دیگر آلاتِ زراعت لیتا ہے، دھوبی سے کپڑے دُھلواتا ہے، درزی سے کپڑے سلواتا ہے، غرض ایک پیشہ ور کا کام دوسرے پیشہ ور سے بآسانی نکلتا ہے، اور اس طرح تمدّن زندگی ترقی کرتی جاتی ہے +

اب ہر جگہ کا جداگانہ تمدّن ہے کہ وہاں کے باشندے کس طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں، اس کے لئے کوئی خاص قانون مقرر نہیں ہو سکتا، آزاد رو سے آزاد رو اور وحشی سے وحشی آدمی بھی اپنے اجتماعی ماحول کے اثر سے کلیتہً محفوظ اور غیر متاثر نہیں رہ سکتا، جو جماعت، قوم یا نسل، جس آب و ہوا اور خطۂ زمین میں بود و باش اختیار کرتی ہے اُسی کے ماحول سے اثر پذیر ہونا اُس کو ناگزیر ہے اسی وجہ سے مختلف ممالک اور مذاہب کا تمدن مختلف ہوتا ہے یہی اخلاقی آب و ہوا جس میں کوئی شخص زندگی گذارتا ہے اُس کی خواہشوں کا اصلی عالم ہو جاتا ہے، لیکن اصولاً ہر انسان اپنی ذات کو ذات نہیں بلکہ وہ کسی جماعت کا ایک جز سمجھتا ہے، یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ مِل جیسے مصنّف تک نے جو بعض حیثیات سے سخت انفرادیت کا قائل ہے اسی پر زور دیا ہے وہ کہتا ہے کہ " اجتماعیت اسقدر فطری اور لازمی شے ہے کہ بعض غیر معمولی حالات یا عمداً تجرد کی کوشش کے سوا انسان اپنی ذات کا جماعت سے علیحدہ تخیّل کر ہی نہیں سکتا اور جسقدر نوع انسان وحشیانہ عہد کی آزادی سے دور ہوتی جاتی ہے اُسی قدر یہ شیرازہ زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتا جاتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ انسانی ماحول کی جو چیز کسی حالتِ اجتماعی کے لئے لازمی ہوتی ہے وہ روز بروز ہر فرد جماعت کے تخیّل کا غیر منفک جز بنتی جاتی ہے" +

لہذا ہم جب کسی جماعت کو مشترک زبان، مشترک قانون، مشترک مذہب اور مشترک مقاصد کے رشتہ سے باہم پیوستہ دیکھتے ہیں تو ایک وسیع معنی کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے تمام افراد ایک ہی عالم میں زندگی گذارتے ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں شخصی اور انفرادی امتیازات قایم رہتے ہیں، بعض اشخاص ان مشترک رشتوں سے کم وابستہ ہوتے اور بعض زیادہ، بلکہ غور و دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر لمحہ، ہر آن ان میں سے ہر ایک کے عالم میں کافی تغیر واقع ہوتا رہتا ہے، تاہم مقامی رسوم اور ماحول کا اثر ان کے شخصی امتیازات پر غالب رہتا ہے۔ دوسروں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے، روزمرہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی احتیاج بطور خود ہی کسی جماعت کے افراد

میں ایک مجانست و موانست پیدا کر دینے کے لئے کافی ہیں، اور جب اس پر تعلیم و تربیت کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس کی قوت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، چنانچہ اس کی زندہ مثال ہماری آنکھوں کے سامنے اہلِ یورپ اور بالخصوص اہلِ امریکہ موجود ہیں، یہ لوگ ایک زبان رکھتے ہیں، ایک قانون کی کڑی سے منضبط ہیں اور اپنے تمام مساعی و مقاصد میں بھی ہم آواز ہیں، تعلیم و تربیت، اتحاد و اُنسیت سونے پر سُہاگا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ سب سے زیادہ متمدن، اپنی ضروریات زندگی میں بافراغت بسر کرنے والے ہیں، اور دیگر اقوام پر بہمہ وجوہ فوقیت رکھتے ہیں۔ موجودہ عظیم الشان جنگ میں امریکہ کا نمایاں حصہ اظہر من الشمس ہے، برخلاف اس کے ہندوستان ہے جہاں چپہ چپہ کی زبان مختلف، ہر قوم اور ہر جماعت کا مذہب نیا، ہر ایک کا جداگانہ قانون، نہ کوئی غرض و غایت مشترک نہ اتحاد و موانست، ایک دوسرے کا دشمن، ایک کی ترقی دوسرے کے لئے باعثِ حسد، جگہ جگہ کا رسم و رواج مختلف، کسی ایک فرقہ کا لباس دوسری جماعت کے لئے باعث ننگ و عار ہے، اور ایک قوم کا اکل و شرب دوسروں کے لئے باعث ضحیک و استہزا ہے، جہاں مغائرت کا یہ عالم ہو وہاں کا تمدن ظاہر ہے، اقوام سے لے کر ایک ایک فرد تک تمدنی زندگی میں کوسوں پیچھے ہے اور مجبوراً تقلید کا حامی، نتیجہ یہ ہے کہ ہمیشہ سے کسی نہ کسی متحد قوم کے زیرِ اثر رہا ہے، اور ان کے طرز اور تمدنی معاشرت کو احتراماً واجب سمجھتا ہے +

زمانہ حال کے مختلف مصنفین اس خیال کے حامی ہیں کہ جس طرح کسی جاندار جسم کے تمام اعضا میں ایک مشترک حیات کام کرتی ہے اسی طرح کی ایک مشترک حیات انسانی جماعت کے مختلف اعضا یا افراد میں بھی پائی جاتی ہے بعض لوگوں نے اس خیال کو تمثیل کے پیرایہ میں پیش کیا ہے، یعنی انسانی جماعتوں اور حیوانی یا نباتاتی اجسام کی ساخت میں وجوہ مماثلت دکھانے کی کوشش کی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی تمثیلات بعض اوقات حقیقت فہمی میں معین ہوتی ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی ان سے بصیرت اور حقیقت رسی کے بجائے ذہانت و طباعی کا ثبوت زیادہ ملتا ہے، ہر نوع انسانی شخصیت کوئی مستقل بالذات ہستی نہیں ہے، بلکہ دوسری شخصیتوں کے ساتھ کچھ روابط قایم کئے بغیر اس کا تصور تک ناممکن ہے، انسان کی زندگی کا دارومدار انہیں روابط پر ہے، جن سے الگ کر لینے کے بعد یہ فنا ہو جاتی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ کسی عضو کو جسم سے کاٹ لیں تو وہ مردہ ہو جاتا ہے، آدمی کی زندگی جس نصب العین اور جن اخلاقی رسوم و عوائد میں نشو و نما پاتی ہے وہی اس کی اخلاقی زندگی کا تمامتر آب و رنگ ہوتے ہیں +

فرائض تمدن

جہاں ماہرانِ فلسفہ متفقہ طور پر اس کے حامی ہیں کہ نوعِ انسانی کے تمدن پر اقلیم یا آب و ہوا، غذا، سرزمین اور مناظر فطرت اپنا کافی ڈالتے ہیں، وہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان سب میں سب سے زیادہ نتائج جس چیز سے انسانی تمدنی زندگی پر مرتب ہوئے ہیں وہ اس کا عنصر فراہمی دولت ہے، ہر ملک و ملت میں جب ایک خاص حد تک دولت جمع ہو جاتی ہے، اُس وقت وہ مختلف طریقوں سے ترقی کرنا شروع کرتے ہیں، خود علم کی ترقی دولت کی افزونی سے وابستہ ہے، جس وقت تک ہر فرد خود اپنی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں ہمہ تن

مصروف رہیگا اس وقت تک نہ تو کسی کو اعلیٰ ترین مشاغل کا ذوق و شوق ہوگا اور نہ اس کی فرصت ملیگی کہ کوئی جدید ترقی کی جاسکے، اگر کسی سوسائٹی کے تمام افراد اس قدر صرف کردیں جس قدر کہ وہ کماتے ہوں تو اُن کے پاس کچھ سرمایہ اُن لوگوں کے لئے نہ بچیگا جو فراہمی سرمایہ کے ناقابل ہیں، لیکن اگر خرچ سے آمدنی زیادہ ہوگی تو بافراغت لوگوں کی ایک ایسی جماعت قایم ہوجائیگی جو زیرکی و فہم عقل و بینش میں اپنے سے زیادہ متمدن ممالک سے کسی طرح کم نہ ہوں گے، اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملک ترقی ترقی کرتا چلا جائیگا، اس وقت اس کی ضرورت باقی ہی نہیں رہیگی کہ تمام اشخاص انفرادی حیثیتوں سے علیحدہ علیحدہ رزق رسانی کے لئے محنت کریں، بلکہ وہ اپنا وقت اس سے زیادہ کارآمد کام میں صرف کریں گے، اور علم و عقل کی روشنی میں مختلف طلسمات نیرنگ عالم دیکھ سکیں گے اور اس طرح ایجاد و اختراع کا دروازہ کھل جائے گا +

اب ہم اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ قوانین انسانی اور حقوق الناس تمدن زندگی میں کس درجہ اثر رکھتے ہیں، یہاں یہ امر واضح ہوجانا چاہئے کہ کسی سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کا انحصار صرف اکراہ اور اجبار پر موقوف ہوتا ہے، اس میں سلاطین وقت یا اُن کے قوانین مروجہ کو بہت کم دخل ہوتا ہے، کیونکہ وہ اقوام جو بالطبع مطیع الفتان ہوتی ہیں اُن کے لئے رعب سلطانی اور قوانین ملک بالکل بے اثر ہوتے ہیں، اسی طرح پر وہ اقوام جو اصل معنوں میں امن پسند اور عاقل ہوجاتی ہیں تو ان کے لئے بھی قوانین کی فطرتاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی، جو قوانین کہ ایک خاص وقت میں مفید ثابت ہوتے ہیں وہی دوسرے وقت بیکار اور بتدریج مضر ہونے لگتے ہیں، اس لئے بہترین اصول یہ ہے کہ بجائے اسکے کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سخت اور قطعی قوانین و ضوابط قایم کئے جائیں، افراد میں اس امر کی کوشش کی جائے کہ ان میں خصائل حسنہ پیدا ہوں اور اعمال و افعال پسندیدہ پیدا ہوں، لیکن ابتدا میں نازو آزادی کی روک تھام کے لئے قوانین کا وجود ضروری ہے، چونکہ جس چیز کو لوگ اوّل خوف سے کرتے ہیں وہ بتدریج عادت ہوجاتی ہے، اور پھر اُسی کو وہ شعوری آزادی سے انجام دینے لگتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اوّل قانون وجود میں آتا ہے پھر عادات اور پھر نیکی، اصل منشاء قانون لوگوں کے حقوق و فرائض کی اقامت اور تنظیم ہے، اور یہ دونوں چیزیں باہم لازم و ملزوم ہیں، جب ایک شخص کوئی حق رکھتا ہے تو دوسروں پر نہ صرف اس حق کی حرمت فرض ہوجاتی ہے بلکہ ساتھ ہی اس حق کو فلاح عامہ کے لئے استعمال کرنے کا فرض بھی اس پر عاید ہوجاتا ہے، یعنی حقوق الناس کے یہ معنی ہیں کہ رفاہ عام کے لئے اس کو بعض چیزوں کا مالک بنادیا گیا ہے +

حقوق دو قسم کے ہوتے ہیں، اوّل حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد، اگر غور و تدبر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ غایت تخلیق اشرف المخلوقات کی بنا یا انتہا صرف ان دونوں قسم کے حقوق کا اپنی زندگی میں کامل طور پر انجام دینا ہے، حقوق اللہ سے وہ حق مراد ہیں جو خالق مطلق نے اپنی مخلوق کے ذمہ عائد کئے ہیں، ان حقوق کا ادا کرنا ہر فرد انسانی کے لئے خالق کی رضاجوئی کی غرض سے فرض ہے، اگر اس کی غرض و غایت خوشنودی خالق نہ ہوگی نہ ہوگی تو وہ حق پورا نہ ہوگا، حقوق اللہ کی نسبت اسقدر کافی ہے +

دوسرے حقوق العباد ہیں ان میں سے بعض وہ حقوق ہیں جن کا تعلق افراد کو صرف اپنی ذات سے ہوتا ہے

مسجد ایاصوفیہ جو کبھی گرجا تھی

وہ اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں (اقبال)

اور

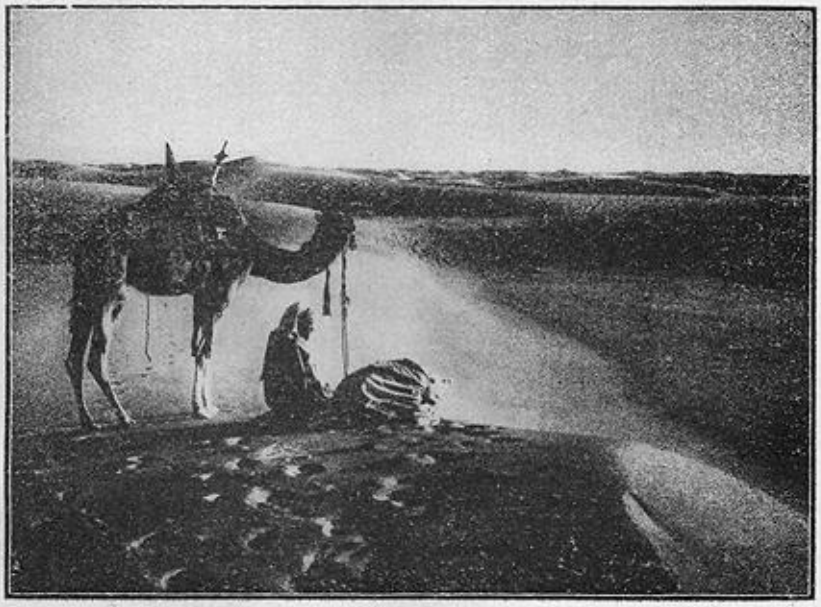

کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں (اقبال)

اور ان میں سے بعض وہ ہیں جو ایک شخص کے ذمہ دوسرے کے حقوق بہ حیثیت نوع انسان واجب ہیں، اس میں سے سب سے پہلے ہم ذاتی فرائض کو لیتے ہیں، ہر شخص بخوبی واقف ہے کہ ترکیب انسانی دو اجزا سے ہوئی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل ممتاز ہیں، ان میں سے ایک جسم اور دوسرا روح ہے، اور باوجود اس کے کہ ان کی طبائع بالکل متغائر ہیں، لیکن ان دونوں میں ایسا عجیب وغریب اتحاد پایا جاتا ہے کہ ایک کے موثر ہونے پر دوسرا ضرور متاثر ہوتا ہے، لہذا ہر انسان پر یہ فرض ہے کہ وہ ان دونوں جوہروں کی حفاظت بخوبی کرے، علامہ لاک لکھتا ہے کہ "وہ سعادت و فلاح جس سے دنیا میں فائدہ اٹھانا انسان کے لئے ممکن ہے اس کے واسطے دو چیزیں لازمی ہیں، اوّل عقل صحیح دوسرے جسم سالم" یہ دونوں نعمتیں تمام دیگر نعمتوں کی اصل ہیں، اور جس شخص کے پاس یہ دونوں موجود ہیں وہ خوش قسمت ہے، چونکہ یہی دونوں سعادت اور شقاوت کی بنیاد ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان کو دو قسم کی ضروریات ہوتی ہیں، ایک روحانی ضروریات جو نفسانی سعادت اور روحانی فلاح کو مستلزم ہیں اور دوسری جسمانی ضروریات جو جسمانی سعادت کو مستلزم ہیں، اب نفسانی یا روحانی ضروریات تو وہ ہوئیں جن کے استعمال میں لانے سے انسانی نفس صحیح سالم اپنے فرائض کی انجام دہی کے قابل رہتا ہے، اور جسمانی ضروریات وہ ہوئیں جن سے جسم تندرست اور اُن فرائض کی انجام دہی کے قابل رہتا ہے جو اس دنیوی زندگی میں اس کے ذمہ فرض کئے گئے ہیں۔

اب ان حقوق الناس میں سے جن کا تعلق ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے منجملہ دیگر حقوق کے اہم ترین حقوق (۱) حقوق زندگی (۲) آزادی (۳) ملکیت (۴) سعادت اور (۵) تعلیم قرار دئے جا سکتے ہیں۔

انسانی حقوق میں مقدم ترین حق زندہ رہنے کا ہے اس سے مطلب یہ ہے کہ تکمیل نفس ایک شخصی چیز ہے، ورنہ اگر اس کو غیر شخصی چیز تصور کر لیا جائے تو پھر شخصی حیات اس پر قربان ہو سکتی ہے، لیکن غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس نفس یا شخصیت کی تکمیل مقصود بالذات ہے وہ دراصل انفرادی نہیں ہے بلکہ ایک حد تک اجتماعی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ بعض مواقع ایسے پیش آجاتے ہیں جہاں افراد کی قربانی جماعت کے لئے مستحسن قرار دی جاتی ہے، لیکن یہ صورتیں دراصل مستثنیات میں سے ہوتی ہیں، عام طور پر یہ اصول مسلّمہ نہیں ہے، بلکہ عمومی حیثیت سے انسانی فلاح، انسانی حیات کے بقا و تحفظ ہی کے مقتضی ہے، اس لئے حرمت حیات کا حق تمام حقوق میں اوّل ہے، غیر متمدّن اقوام میں اس حق کی حرمت کا لحاظ نہیں کیا جاتا، اپنے ذاتی فوائد کو ملحوظ رکھ کر بچوں کو مرد ض ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں، اسیران جنگ اکثر بے دریغ تہ تیغ کر دیئے جاتے ہیں، متمدن اقوام اس حق کا پاس و ادب زیادہ کرتی ہیں، اور حتی الوسع ان مواقع سے احتراز کرتی ہیں جہاں اس حق کے ضایع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

حق زندگی کے بعد حق آزادی ہے، انسان فطری اور خلقی طور پر آزاد پیدا کیا گیا ہے، اس کو آزادی کی طرف رہنمائی کرنے کے لئے کسی ہادی کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ انسان میں آزادی کا احساس منجملہ ان احساسات کے ہے جس کی فطرت پر انسان فطرتاً مائل ہوتا ہے، یہی وہ

آزادی ہے جس کا شعور ہر ذی عقل انسان اپنے نفس میں پاتا ہے۔ تمام تاریخی واقعات و حادثات جو تمام اقوام میں ہوئے ہیں اسی آزادی پر مبنی ہیں، وہ کونسی آزادی ہے جس کے حصول کی غرض سے یورپ نے نہایت جانبازی کے ساتھ جہاد کیا ہے اور اپنی عزیز جانیں قربان کر دی ہیں؟ وہ کون سی آزادی ہے جس کی نسبت میلوودویلو ( ) کہتا ہے کہ "آزادی دنیا کی ہر قسم کی سعادت وفلاح سے افضل ہے" اور جس کی نسبت مسیلو پاچے لکھتا ہے کہ "آزادی ہر ایک انسانی ترقی کی اصل اصول ہے" اور جس کی وکٹر ہیگو اس طرح مدح سرائی کرتا ہے کہ "آزادی ایک ایسی ہوا ہے جو نفس انسانی کی زندگی کے لئے ایک ضروری چیز ہے"، کیا اس آزادی سے یہ مراد ہے کہ انسان تمام قیود اور ہر قسم کے روابط سے آزاد ہو کر محض بے قید اور مطلق العنان ہو جائے۔ اگر اس آزادی کو اس کے ہم معنی کہا جاتا ہے تو یہ اس لفظ کا ناجائز استعمال ہے، خودسری یا مطلق العنانی کسی حالت میں بھی کسی خوش نظم یا متمدن سوسائٹی میں جائز قرار نہیں دی جاسکتی ہے، اس سے تو یہ مراد ہوگی کہ کسی جماعت کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ جو اس کا دل چاہے کرے، وہ آزادی جس کے اشتیاق میں تمام قوموں کے نلاسفر بے چین ہیں، وہ معتدل آزادی ہے جس کی بدولت انسان اپنی تمام قوتوں کو جو قدرت سے اُس کو عطا کی گئی ہیں بغیر کسی مزاحمت وخوف کے استعمال کر سکے، بشرطیکہ ان حدود مقررہ ( ) سے متجاوز نہ ہو جو عادلانہ قوانین نے قرار دیدی ہیں، کیونکہ اگر ان حدود سے تجاوز ہوگا تو وہ قوم کے دیگر افراد کے لئے مضر ثابت ہوگا، اور اس طرح اصول تمدن کے خلاف ہوگا، اس معتدل آزادی کے ضمن میں نفس کی آزادی، عقلی آزادی اور عقلی آزادی آسکتی ہیں +

حق آزادی کے بعد حق ملکیت آتا ہے اس سے جو فرض عاید ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کو عاقلانہ اور عادلانہ طور پر فلاح عامہ کے لئے استعمال کیا جائے، وہ اقوام جو اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتی ہیں اُنکو یہ حق نہیں دینا چاہئے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی اقوام میں یہ حق بالکل مفقود ہے، افلاطون کا یہ خیال ہے کہ ایک اعلیٰ نظام حکومت میں تمام چیزیں مشترک ہونا چاہئیں، اسکے نزدیک ملکیت شخصی کا کوئی حق ہی نہیں ہے، یہی وہ اصول ہے جس کی بنا پر زمانہ موجودہ میں بالشویک حق ملکیت کو شخصی ملکیت سے نکالکر ہر فرد بشر پر یکساں مشترک ملکیت میں دینا چاہتے ہیں، وہ افلاطون کے اس معنی میں بھی ہم خیال ہیں کہ عقد یا نکاح بالکل لغو شے ہے، توالد و تناسل یا ترقی نسل کے لئے منجلہ دیگر اشیا کے عورت کو بھی کسی شخص کی ملکیت میں نہ ہونا چاہئے، اس مشترک یکساں ملکیت سے جو اقوام کو نقصان پہنچے ہیں ان کا اندازہ ان اقوام کی حالت دیکھنے سے بخوبی ہو جاتا ہے جن میں یہ اصول کچھ عرصہ تک ہی رائج رہے ہیں +

دیگر اشیا کی مشترکہ ملکیت سے جو ایک حد تک ناممکن الوقوع ہے صنف نازک کو ہی دیکھئے کہ چند مذاہب یا اقوام میں اس کا رواج ہے وہ آج مہذّب اور متمدّن اقوام میں کس نظر سے دیکھے جاتے ہیں، اگر تعصب سے کام نہ لیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ دراصل بے حیائی اور بے شرمی کا مجسمہ ہیں،

حق معاہدہ وہ اخلاقی فرض ہے جس سے باہم ایک دوسرے سے جو معاہدہ ہو اس کو پورا کرنے کا فرض عائد ہوتا ہے، تمدن کے ابتدائی درجات میں معاہدہ کوئی شے ہی نہیں

ہوتی اور ایفائے وعدہ سے ہر شخص ناآشنائے محض ہوتا ہے وہاں قوت بازو فیصلہ کن رکن ہوتا ہے، ہر وہ فرد جس میں نسبتاً دوسرے اشخاص سے قوت وطاقت زیادہ ہوتی ہے وہ اپنا کام نکال لیتا ہے، چنانچہ اسی بناء پر یہ کہا جاتا ہے کہ "جماعتیں اپنی طبیعتی حالت سے معاہدہ کی طرف ترقی کرتی ہیں" جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر متمدن سوسائٹی کا یہ فرض ہے کہ وہ اس عہد یا معاہدہ کو جو آپس میں طے ہو ہر حالت میں پوری پابندی کے ساتھ وفا کرے، اگر ایفائے عہد کسی سوسائٹی سے مفقود ہو جائے تو اس کے افراد میں اتحاد و موانست ایک منٹ بھی قایم نہیں رہ سکتی اور نتیجہ پوری جماعت کی بربادی ہوتا ہے ◆

اسی طرح تعلیم سے وہ حق مراد ہے کہ جس کے ذریعہ سے نفس عاقلہ کی تکمیل ہوتی ہے، ایک اعلیٰ نظام اور متمدن سوسائٹی کے لئے نہ صرف تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم ضروری اور لازمی جز ہے، جس کے بغیر متمدن ہونا محال ہے۔ تمام کتب سیر اس پر شاہد ہیں کہ تمام وہ اقوام اور ممالک جو تمدنی ترقیات میں پیچھے ہیں وہ ہمیشہ سے تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ غیر تمدن زندگی کے زنگ کو جو صیقل کر کے صاف کرتی ہے، اور اس کو ابھار کر متمدن طبقہ سے لا ملاتی ہے وہ صرف تعلیم ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ تمام جماعتوں کے لئے جو تمدنی زندگی میں فائق ہونا چاہتی ہیں، یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے افراد کی تعلیم کا اعلیٰ انتظام کریں، آج تمام وہ اقوام جو مدارج تمدن کے ملاءِ اعلیٰ پر نظر آتی ہیں صدیوں پہلے سے اپنے افراد کی تعلیم میں منہمک اور سرگرداں رہی ہیں جب ان کے نفوس عاقلہ کی پورے طور پر تکمیل ہو چکی تو زمانہ کے متمدن افراد میں شمار ہونے لگی ہیں، یہاں تعلیم سے مراد کوئی خاص تعلیم مغربی یا مشرقی یا کسی خاص جگہ یا قوم کی نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ تعلیم ہے جس کے ذریعہ سے دماغ نشوونما پاکر جہالت کی تاریکیوں سے نکل جاتا ہے ◆

ان تمام حقوق الناس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو یہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے کہ جس قوم وملت کے ہم فرد ہیں اُس کی اعلیٰ ترین ترقی اور فلاح وبہبود کے لئے ہماری زندگی کے نشوونما کو جو ذرائع اور وسایل درکار ہیں اُن پر ہم کو پورا پورا حق حاصل ہے اور ان تمام ذرائع اور وسائل کو اسی مقصد کے لئے استعمال کرنا ہمارا تمدنی فرض ہونا چاہئے ◆

ترکیب تمدن

انفرادی ہستیاں جب کسی ایک رشتہ میں منسلک ہوتی ہیں تو اُن کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں، منجملہ ان کے سب سے اوّل مجموعہ ایک خاندان یا قبیلہ کی صورت میں ظہور پذیر ہوتا ہے، یہ جماعت چند افراد کا باہم رشتہ قرابت سے وابستہ ہونے کا نام ہے، اس کا اصل اصول موانست فطری ہوتی ہے، اور یہی اس کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اس کا مقصد دراصل بچاں گئی طفولیت کی حفاظت وخبرگیری اور فطری محبت وموانست کے ساتھ ایک دوسرے سے ربط واتحاد ہے، یہ نظام قدرتی طور پر اس خوش اسلوبی سے انجام پاتا ہے کہ کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں ہو سکتا، ایام طفولیت یا شیرخوارگی میں جو حفاظت اور خبرگیری والدین کرتے ہیں وہ بہتر سے بہتر بھی کوئی نظام سلطنت نہیں کر سکتی۔ اسی طرح دوستی کا دائرہ جسقدر کم ہوگا اُسیقدر اسمیں پائیداری اور خلوص زیادہ ہوگا، خاندان کا ایک بزرگ مثل بادشاہ کے ہوتا ہے اس کے خورد سب اس کے احکام کے ماتحت ہوتے ہیں۔ جسب مشورہ خاندان وہ تمام امور کی انجام دہی کے لئے حسب مراتب احکام نافذ کرتا ہے اور اس طرح تمام خاندانی کام انجام

پاتے ہیں، اندرونی اور بیرونی تمام معاملات خاندان کے سامنے پیش ہوتے ہیں، اگر کوئی مسئلہ متنازعہ فیہ ہوتا ہے تو وہ ہر دو فریق کے بیانات سنکر بزرگ خاندان کے ہاتھوں سے طے پاجاتا ہے، گویا خاندان ایک جمہوریت کا نمونہ ہے، گو چھوٹے پیمانہ پر ہو مگر اصول بالکل یکساں ہوتے ہیں، اسی طرح چند خاندان ملکر ایک جماعت ہوتی ہے اس کو قوم کہتے ہیں، قوم میں بھی مثل خاندان کے تمام ان حقوق کی بدرجۂ اکمل پابندی ہوتی ہے، تمام قوم کا ایک سردار قرار دیدیا جاتا ہے اور اس کے مشورہ کے مطابق تمام قوم کے مراحل طے پاتے ہیں، ہر فرد قوم کا اخلاقی فرض ہوتا ہے کہ وہ تمدنی فرائض کی پابندی کرے، ایک قوم بحیثیت اپنی ذات کے بقابلہ دوسری اقوام کے متحد ہوتی ہے۔ بیرونی دشمنوں سے محافظت اور اندرونی معاملات کی تنظیم اس کا فرض منصبی ہوتا ہے، اب جب چند اقوام مل جاتی ہیں تو اس سے ایک ملک یا سلطنت کی بنیاد پڑتی ہے اور اس طرح حکومتیں عرض وجود میں آتی ہیں +

یہ پہلے بیان ہوچکا ہے کہ خاندانی تعلقات کی بنیاد باہمی فطری محبت پر ہوتی ہے، لیکن اس سلسلہ سے قطع نظر کرکے ہم کاروباری زندگی پر سطحی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے برعکس ہیں، چونکہ کاروبار میں صرف باہمی معاہدہ ہی شرط ہوتی ہے اس کو کوئی تعلق فطری جذبات سے نہیں ہوتا ہے، وہاں تعلقات مربیانہ ہوتے ہیں یہاں افسری اور ماتحتی کے تعلقات ہوتے ہیں، اگرچہ خاندان میں بھی یہی حاکم و محکوم کا رشتہ ہوتا ہے، لیکن نوعیت جداگانہ ہوتی ہے۔ وہاں تو ایک مربی اپنے کم سن متعلقین کی بحیثیت مربی تعلیم و تربیت کرتا ہے، یہاں صرف ایک معاہدہ ہے جس کے لئے وہ ایک خاص کام کے لئے مقرر ہوتا ہے، اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے ایسے قوانین وضوابط ترتیب دئے جائیں جن سے ماتحت لوگوں پر تشدد نہ ہوسکے اور حاکم محکوم کو درجۂ غلامی تک نہ پہنچا سکیں +

زمانہ گذشتہ و حال کا موازنہ ہم کو یہ بتاتا ہے کہ جسقدر زیادہ تمدنی ترقیات میں گام زن نظر آتا ہے، اُسی قدر خلوص و موانست میں کمی اور رسم و رواج میں ترقی روز افزوں ہوتی جاتی ہے، زمانہ سابق میں ایک آقا اور خادم کا باہمی کاروباری تعلق مثل ایک خاندانی تعلق کے ہوتا تھا، جو معاہدہ کاروباری حاکم و محکوم میں ہوتا تھا وہ موانست وخلوص کی زنجیر سے مستحکم ہوجاتا تھا، آقا کا اخلاق، خادم کے اخلاص پر سنٹ کا کام کرتا تھا، یہی وجہ تھی کہ آقا کا برتاؤ مربیانہ ہوتا تھا اور خادم کا طرز عمل مودبانہ اور مخلصانہ ہوتا تھا، آقا کی خوش حالی اور نیک نامی سے خادم کو دلی مسرت ہوتی تھی اور اس پر کسی قسم کی مصیبت خادم کے لئے سوہان روح ہوتی تھی، لیکن فی زمانہ یہ باتیں محض افسانہ ہوکر رہ گئی ہیں کہ وفادار خادم اپنے آقاؤں کے لئے اپنی عزیز جانیں تک قربان کردیتے تھے +

اسی طرح اُستادوں اور شاگردوں کا برتاؤ مخلصانہ اور مربیانہ ہوتا تھا، شاگرد اپنے اساتذہ کا خیال اپنے والدین سے زیادہ کرتے تھے، ان کے ادب میں اپنی بہبودی تصور کرتے تھے، کسی خاص علم کے اُستاد کی شاگردی کو اپنا فخر جانتے تھے اور صدہا کوس کی منازل پا پیادہ طے کرکے ان کے پاس پہنچتے تھے اور بالآخر ارسطو زماں اور افلاطون دوران ہوتے تھے، علمائے سلف کے سوانح اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے شاگردانِ رشید کو مثل اپنی اولاد کے تربیت دیتے تھے اور سچے دل سے چاہتے تھے کہ جو کچھ

وہ خود جانتے ہیں وہ سب اپنے شاگردوں کو ذہن نشین کرادیں، یہی وجہ تھی کہ اکثر شاگرد اپنے اُستاد سے کسی خاص فن میں زیادہ ماہر ہو جاتے تھے، جن پر خود اُستاد فخر کرتے تھے اور وہ اُن کے لئے مایۂ ناز ہوتے تھے، اس کی مثالیں اکثر موجود ہیں کہ اُستاد اور شاگرد کا برتاؤ بیحد خلوص پر مبنی ہوتا تھا۔

برخلاف اس کے موجودہ زمانہ میں ہر طالب علم یہ سمجھتا ہے کہ وہ کچھ روپیہ خرچ کرتا ہے جس کے بدلہ اُسکے اُستاد کا یہ فرض ہے کہ وہ اُس کو تعلیم دیدے اور وہ بھی ایک خاص وقت معین پر، اسی طرح اُستاد یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مقررہ رقم کے عوض ایک وقت محدود میں اپنا کچھ حصہ وقت صرف کردیں بلالحاظ اس کے اُن کا مقصد اصلی حاصل ہو یا فوت۔ نہ ایک دوسرے کا خیال، نہ ادب، نہ پاس، نہ اخلاص نہ مودت، نتیجہ یہ ہے کہ شاگرد محض ڈگری یافتہ عالم بے عمل ہوتے ہیں۔

اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جب مربیانہ تعلق کسی فطری رشتہ محبت پر مبنی نہیں ہوتا تو اس میں کسی قسم کا خلوص باقی نہیں رہتا محض رسمی ضابطہ کی خانہ پُری رہ جاتی ہے اور آگے چل کر اس کا یہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر بیان ہوا ہے اب اگر کاروباری تعلقات خالص معاہدانہ حیثیت کے ہونگے تو ایک حد تک ناانصافی کے لئے سدباب ضرور ہو جائیگا اور پھر خود بخود رفتہ رفتہ وفاداری اور محبت کے جذبات پیدا ہو جائینگے، لیکن اگر خود معاہدہ ہی محض رسماً اور رواجاً ہوگا تو اس کا اثر بالکل برعکس ہوگا، اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ماتحتی کی سختی اور ناگواری صورتوں کے کم کرنے کے لئے معاونت اور اتحادِ عمل یعنی تعامل و تعاون کی صورتیں اختیار کی جائیں تاکہ مودت پیدا ہو۔

اگر لوگوں کے کاروباری تعلقات کو محض معاہدانہ رکھنا ہے تو ان مربیانہ اور ہمدردانہ فرائض کو جو افراد کے ہاتھ میں نہیں چھوڑے جا سکتے ہیں، ایک خاص جماعت کو من حیث المجموع اپنے ذمہ لینا چاہئیں، اگرچہ یہ کام ایک مرکزی حکومت کا ہے لیکن یہ کام ہر شہر خود انجام دے سکتا ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت کا انتظام، وسائل تعلیمی کی فراہمی، حادثات کی روک تھام بصورت حفظ ماتقدم، اشیائے خوردنی میں میل یا اور دھوکہ بازی کا انسداد۔ اسی طرح وہ لوگ جو محنت مزدوری کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتے اُن کے لئے ضروریات زندگی کی فراہمی یہ سب امور تمدنی زندگی کے لئے لازمہ انسانیت ہیں۔

ان تمام امور مذکورہ بالا کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم اب اس سوال پر غور کرتے ہیں کہ آیا کسی قوم کو انفرادیت کی طرف قدم بڑھانا چاہئے یا اشتراکیت کی طرف۔ اس مسئلہ پر دو گروہ جداگانہ متضاد رائے رکھتے ہیں، جماعت انفرادیہ کا یہ خیال ہے کہ تا بہ امکان افراد کی آزادی کو قایم رکھنا زیادہ اہم ہے لیکن دوسرا گروہ اشتراکیہ یہ کہتا ہے کہ اصلی شے افراد کے افعال کو فلاح عام کے نقطۂ نظر سے منضبط اور محدود کرنا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ان دونوں مخالف آرا کی تطبیق اس صورت سے بآسانی ممکن ہے کہ نہ تو کل کی فلاح بغیر افراد کی فلاح کے ممکن ہے اور نہ ہر شخص کو انفرادی آزادی بغیر اس شرط کے دی جا سکتی ہے کہ بہ حیثیت مجموعی اس میں کوئی عام فلاح مضمر ہو، لہذا اب سوال یہ ہے کہ کن چیزوں میں لوگوں کو زیادہ آزادی دینا مستحسن ہے اور کن چیزوں میں ان کے افعال کی نگرانی اور تحدید ضروری ہے۔ بہرحال زمانہ موجودہ عمومی ترقی کے لئے اشتراکیت کا زیادہ حامی نظر آتا ہے اور فی الحقیقت یہی اصل تمدن ہے۔

عبدالباسط ایم اے

نصیر الدین حیدر بادشاہ

(از جناب خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی)
(خاص برائے نیرنگ خیال)

شاہ زمن غازی الدین حیدر بہادر نے انتقال کیا ابھی جنازہ موتی محل سے اُٹھنے نہ پایا تھا کہ صاحب رزیڈنٹ بہادر بہ اتفاق رائے ارکین سلطنت دجناب بیگم صاحبہ۔ صاحب عالم، ابو النصر قطب الدین عادل حضرت شاہ زماں نصیر الدین حیدر بادشاہ غازی سے عرض کیا کہ آپ خلد مکان کے بوچہ پر سوار ہوکر فرح بخش میں تشریف لائیں تخت شاہی پر متمکن ہوں، صاحب عالم چیخ مارکر رونے لگے، تمام حضار نے گذارش کی :۔ "حضور ہمیشہ سے یونہیں ہوتا آیا ہے"۔

بوچہ پر سوار ہوکر بارہ دری سے در دولت پر تشریف لائے صاحب رزیڈنٹ بہادر چینی بازار سے ہوتے ہوئے انگریزی پلٹن واسطے انتظام کے لیکر کوٹھی فرح بخش پر حاضر ہوئے بادشاہ نے حسب دستور خیمہ سبز میں پہلے دو رکعت نماز ادا کی پھر عبائے خاص بردوش کر کے تخت شاہی پر متمکن ہوئے، صاحب رزیڈنٹ بہادر اور مجتہد العصر نے تاج فرق مبارک پر رکھا۔ ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء ایک شخص نے قبلہ رو کھڑے ہوکر اذان دی، اقربائے بادشاہ، ارکان دولت نے نذریں پیش کیں، توپیں سلامی کی چلیں، ارباب نشاط نے مبارک باد گانا شروع کی ٭

تیسرے روز نواب معتمد الدولہ مختار الملک نواب سید محمد خان بہادر ضیغم جنگ معروف بہ آغا میر افتخار الدولہ، مہاراجہ میوہ رام کو خلعت بحالی ہوا، ممالک محروسہ میں فرمان شاہی جاری ہوا، کئی روز تک جشن شاہانہ برپا رہا، جلوس کی تاریخیں، تہنیت کے قصیدے پیش ہوئے تاریخ جلوس

بہ بست و ہفتم ماہ ربیع الاول و شنبہ
نصیر الدین حیدر شاہ والا شد سریرآرا
جہاں از جوش شادی شد فرح ناک و طرب آگیں
بگفت از خازن دولت کہ دو گنجینہا بکشا
غرض روز جلوس میمنت مانوس و بعد از ہم
قروص سیم و زر بخشید و پوشا یند خلعتہا
بتاریخ جلوس قطعہائے نذر موزوں شد
کہ خواہد بود بر نوک زباں و یاد اکثر ہا
ولیکن از سر الہام واثق گفت تاریخش
نصیر الدین حیدر داد زیب اورنگ ملکی را

بہت سے سکے نظم ہوئے لیکن یہ ایک سکہ پسند والا ہوا اور وہی ضرب میں آیا ؎

بہ دہر سکہ شاہی زدہ ز لطف الٰہ
سپہر مرتبہ شاہ زماں سلیمان جاہ

جمعرات کو نہایت دھوم دھام اور جلوس شاہانہ سے درگاہ حضرت عباس علمبردار تک واسطے سلام کے سواری حضور کی چوک سے ہوکر گئی، فقرا اور مساکین کو اشرفی و روپیہ لٹایا گیا، درگاہ میں حاضری کا دسترخوان نہایت تکلف اور شان سے ہوا، حضور نے انگریزی طرز کا لباس زیب جسم کیا، سر پر مندیل نما تاج مع کلغی، سیاہ اچکن اس پر شاہی عبا اور پتلون پاؤں میں بوٹ، دُبلے پتلے، چھریرا بدن، سیر چشم، غصہ ور، عنفوان شباب، پچیس برس کا سن ابتدا میں انتظام بہت اچھا رہا رفتہ رفتہ عیش و عشرت میں مصروف

ہوئے، نواب معتمد الدولہ موقوف کئے گئے بلکہ مقید ہو کر خارج البلد ہوئے، راجہ امرت لال عرض بیگی کو قید سخت کا حکم دے کر راجہ درشن سنگھ غالب جنگ کے حوالے کیا آخر بلطائف الحیل محافظوں کو زرکثیر دیکر شب کو اپنے گھر میں بھاگ آئے اور تلوار سے اپنا گلا کاٹ کر جان دیدی اُس کی تاریخ کسی نے لکھی

ہاتف زغیب گفت کہ شاباش امرت لال

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

سہ پہر کو چمن نیدی گل اور فواروں کی ہوتی تھی۔ سو طائفہ شہر کا چیدہ اور سو دیہات کا ملازم سرکار تھا، یہ سب حاضر ہوتے تھے، پچیس پچیس طائفے ایک ایک رنگ کے جوڑے پہنے ہوئے اور بھان متی۔ چونے والیاں، ڈومنیاں، قوال، بین کار، ربابیئے، سرودیئے، ریچھ والے قلندر، بکری، اور بیدر یئے ہوئے حاضر +

کمرے میں تمام عیش موجود تھا، انگریزی میز پر بادہ ارغوانی کے کنٹر، گزک کا سامان، تشتریوں میں پستے اور بادام رکھے ہوئے، دوسری طرف پلاؤ، دو پیازہ، عمدہ عمدہ پکوان، مربہ، اچار، ادھر خود بدولت تشریف لاتے اُدھر انگریزی باجے بجنے لگتے؛ خود بدولت اکل و شرب میں مصروف ہوئے ایک ایک دن میں پانچ پانچ سو جوڑے اور جواہر نگار کرتے تقسیم کردئے +

نواب ملکہ زمانیہ کا بہت اچھا زمانہ تھا، ایک روز محل میں تشریف فرما ہوئے، ایک رقعہ ہاتھ میں تھا۔ ملکہ نے پوچھا مرزا ہاتھ میں کیا ہے، فرمایا "بچاسی لاکھ روپیہ فیض آباد سے آیا ہے" یہ کہکر اُن کی طرف پھینکدیا +

قدسیہ محل کے واسطے جاڑوں میں سوالاکھ روپیہ کی دورضائیاں بنا کرتی تھیں، گرمیوں میں ملازموں کو تقسیم ہوجاتی تھیں +

دھنیا مہری اور "ڈلہ" مہری کا بڑا عروج تھا۔ کہنے کو کہاریاں تھیں، لیکن دھوم دھڑکے سے اُن کی سواریاں نکلتی تھیں؛ دھنیا مہری نے پل، مسجد اور کنوئیں بنوائے دھنیا مہری کا پل ابتک نہایت استحکام سے بنا ہوا لکھنؤ میں موجود ہے

حکما درزی مشہور خیاط تھا کسی شہر سے ایک سوداگر نہایت نفیس عطر لایا، مہینوں اس اُمید پر پڑا رہا کہ شاہی دربار میں رسائی ہو، قسمت نے یاوری نہ کی، ایک روز حکما درزی سے سلطنت کی کچھ شکایت کی اور کہا تمہارے شہر سے ناامید جاتے ہیں حکما نے عطر منگوا کر دیکھا قیمت پوچھی، کہا سب مال پچاس ہزار کا ہے، ناک بھوں چڑھا کر بولا یہ عطر اور بادشاہ کے واسطے، اس سے اچھا تو اُنکے گھوڑوں کے اصطبل میں پڑتا ہے کہ پیشاب اور لید کی بو نہ آئے، اچھا میرے اصطبل میں چھڑک آؤ اور قیمت دیدی

بادشاہ کی خاص پوشاک حکما کے ہاتھوں تیار ہوتی تھی، ہزار روپیہ گرمی کی پوشاک کے ملتے تھے اور جب نئی پوشاک بدلی جاتی تھی، دوسرے روز تقسیم ہوجاتی تھی +

جاڑوں کی پوشاک کے سوالاکھ روپے ملا کئے حکما نے اپنے وطن خیر آباد میں بہت سی عمارتیں بنوائیں، لکھنؤ میں، حکما کا باغ، مسجد، گنج مشہور ہے +

بادشاہ کا پہلا محل نواب ملکہ زمانیہ جو عالی حوصلہ اور نہایت سیر چشم تھیں، دوسرا محل مخدرہ علیا +

تیسرا محل نواب خورشید محل محبوب ترین تھا، ایک دن نواب نے ازراہ نوازش اپنا تاج اُن کے سر پر رکھ دیا تھا اُس دن سے تاج محل مشہور ہوا +

چھاپے خانہ پتھر کا ولایت سے منگوایا +

حجام انگریز ملازم رکھا گیا +

ایک محتاج خانہ تعمیر کیا گیا جس میں اندھے، لنگڑے، اپاہج

عورت مرد رکھے گئے، ہزار روپیہ کا خرچ رزیڈنٹ بہادر کے ذریعے سے منظور ہوا جو اب تک جاری ہے +

انگریزی تعلیم کا اسکول قایم ہوا +

موتی محل میں رسد خانہ سلطانی بنوایا گیا، شفا خانہ یونانی و انگریزی قایم ہوا +

گنگا سے نہر لکھنؤ تک بنوائی +

شاہی شجاعت مشہور عالم تھی، ایک مرتبہ فیلخانے سے سفید ہاتھی مست ہوکر شہر میں نکل آیا۔ لوگوں کا بہت نقصان ہوا، بادشاہ کو خبر ہوئی بوچہ پر سوار ہوکر چوک میں آئے، ہاتھی کو دیکھ کر آواز دی وہ سر جھکا کر سامنے آیا ارشاد ہوا بھوکا ہے اسے دودھ جلیبی کھلا دو، جب وہ خوب سیر ہوکر کھا چکا، بادشاہ خود اس پر سوار ہوکر فیل خانے میں آئے اور ہاتھی بندھوا دیا گیا +

چھتر منزل کے قریب ایک امام باڑہ بنوایا، اس میں ناکدخدا لڑکیاں سیدانیاں، اچھوتیوں کے نام سے رکھی گئیں، بیش بہا تنخواہیں مقرر ہوئیں، نفیس پوشاک زیور مطلّا مرصع کار عطا ہوا، مگر ان کو غیر مرد سے بات کرنے کا حکم نہ تھا، اگر کوئی بات خلاف حکم صادر ہوتی فوراً دیواریں چنوا کر تیر انداز کی جاتی تھیں +

لالہ رام پرشاد رفیق مہاراجہ افتخار الدولہ نے کئی حسین عورتیں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں وہ داخل محل شاہی ہوئیں اور خطاب عیش محل عطا ہوا +

شہر کی نامی طوائف کریم بخش داخل محل ہوئی +

فیض النسا مغلانی حسین طرحدار محل میں داخل ہوگئی

نواب معتمد الدولہ بہادر وزیر جب معزول ہوئے، انکے قایم مقام میر فضل علی خاں صاحب نائب مقرر ہوئے، خطاب اعتماد الدولہ بہادر مرحمت ہوا +

منشی غلام مرتضیٰ روضہ خوان جنّت آرام گاہ کے مقبرے میں دس روپے ماہوار قرآن خوانی کا پاتے تھے، آدمی تھے ظریف الطبع، آداب مصاحبت سے واقف تھے، اقبال الدّولہ کے دربار میں داخل ہوئے، چند روز ملازمت پر، رستم نگر عمارت عالی شان بنوائی +

بعد انتقال نواب اعتماد الدولہ نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں وزیر مقرر ہوئے، یہ وزیر بہت عقلمند تھے اپنے تدبیر سالم سے ممّن، محمد بخش خواص کو دربار شاہی سے نکلوایا +

نصیر الدین حیدر بہادر کا زمانہ بھی عالیشان فیاضیوں سے بھرا ہوا ہے، دس برس حکومت کر کے پینتیس ۳۵ برس کی عمر چوتھی ربیع الثانی ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء دفعتہً انتقال فرمایا، اپنے نو تعمیر کربلا میں جو دریائے گومتی کے قریب ہے دفن ہوئے، قبر پر ایک تاریخ کندہ ہے اور ایک لوہے کا حضیرہ بھی ہے +

اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانہ آخریں بادشاہ کے مزاج میں اہلِ عملہ کی طرف سے کچھ شکوک پیدا ہوئے، آب و طعام غیر معتمد کے ہاتھ سے نوش نہ فرماتے تھے، اور خاصہ اپنے سامنے پکواتے تھے، بیماری ضعف قوت اور سقوط اشتہا کی تھی، انیچی، دایہ دھنیا مہری اور گھو مہری خدمتگذاری میں حاضر رہتے تھے اور ایک رفیق احسان حسین خاں تھے، کئی مہینے سے دربار عام موقوف کردیا، یورپین لیڈیاں جو انگریزی میز پر ملازم تھیں انکو علیحدہ کر دیا کہ اب میز نہ ہوگا اور نہ تم ہمکو آیندہ دیکھو گی۔ وہ وعادیکر چلی گئیں، معتمد الدولہ نے کچھ ڈاکٹر علاج کے واسطے پیش کئے، آپ نے قبول نہ کیا، جمعہ کے روز پوشاک بدلی بظاہر سب طرح اچھے تھے، شام کو افضل النسا نے کنٹر میں آب تربز پیش کیا، حضور نے نوش فرمایا، اس کے بعد کریلے دایہ نے پیش کئے، کچھ کھائے، رات کو آرام کیا پھر آنکھ کھلی تو سردی معلوم ہوتی تھی، رضائی اُڑھا دی گئی،

دو گھنٹے تک بیہوش رہے، اس عالم میں روح نے مفارقت کی۔ محل میں کہرام برپا ہوگیا، فتح الدولہ برق نے انتقال کی تاریخ کہی ؎

دہ سال پنج روز حکومت نمود شاہ

افسوس ہے آج وہی بادشاہ جو ہر وقت نازک بدن حسینوں کے پہلو میں رہتا تھا، آج دریا کے کنارے بسترِ خاک پر آرام کر رہا ہے +

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت

فریبِ عمل

مل گئی تجھکو اگر منزلِ لیلےٰ تو کیا؟
اور مَیں یونہی رہا بادیہ پیما تو کیا؟
تیرا منظر ہے بلندی پہ سہی کیا حاصل!
میری آنکھیں رہیں محروم تماشا تو کیا؟
جادۂ طور بھی اُس نور کا اک سایہ ہے
تُو نے دیکھا بھی تو کیا، میں نے نہ دیکھا تو کیا؟

تاثیر

اُردو کا دَورِ انقلاب

(از جناب افصح الفصحا مولانا مولوی سید حسن مرتضٰی صاحب شفق عمادپوری)

اُردو کو ترقی کا نیا دَور تنزّل کی طرف لئے جا رہا ہے زمانے کی رفتار اُس کی طرف مُڑ کر نہیں دیکھتی وہ کہاں جارہی ہے اور کہاں پہنچیگی، **عربی، فارسی** سے اُس کا چولی دامن کا ساتھ تھا جب سے مشرق نے مغربی تہذیب کا جامہ پہن لیا ہے۔ **انگریزی** بھی اُس کے گلے کا ہار ہوگئی ہے، نامانوس الفاظ کے ثقل نے اُس کو مرکز سے ہٹا دیا ہے اُردو پرچے کو، **اُردو پیپر**، ادب کو **لٹریچر**، مضمون کو **آرٹیکل**، تقریر کو **اسپیچ** کہدینا معمولی بات ہے، وقت کو **ٹائم**، دفتر کو **آفس**، تاریخ کو **ڈیٹ**، پتے یا نشان کو **ایڈرس** بولنا بے تکلف روزمرہ ہے، جن چیزوں کے لئے اپنے الفاظ موجود ہیں وہ بھی سات سمندر پار کی زبان میں بولے جاتے ہیں، **مادرِ ہند** کی گود میں پرورش پاکر بھی ہماری زبان **دیسی سے ولایتی** ہوئی جاتی ہے، اُردو اخبار یا رسالے نگاہوں پر بار ہیں، **انگریزی** اخبار یا رسالے اور کچھ نہیں تو میز کی زینت کے لئے درکار ہیں، لیاقت نہ رکھتا ہو مگر ایک **انگریزی** پرچہ ہاتھ میں رکھتا ہو تو نئی روشنی کا روشن خیال ہے، قابلیت رکھتا ہو مگر **اُردو** کی کتاب ہاتھ میں لئے ہو تو پرانے خیال کا کہنہ سال ہے، ایسے مفتوح ساری دنیا سے الگ ہند ہی میں براجتے ہیں جن کے منہ میں فاتح کی زبان تو ہے اپنی مادری زبان نہیں ہے، اُردو غریب پر ایک طرف سے جلاوطنی کا فرمان، اور دوسری طرف سے نئی بھرتی کا سامان

دُہرے شکنجے میں اور اکیلی جان ہے
غم صیاد فکرِ باغباں ہے دو عملے میں ہمارا آشیاں ہے

مُلکی بھائیوں کی یہ ہٹ کہ وہ اسے کھینچ تان کر **ہندی** یا بگڑی ہوئی **بھاشا** بنانا چاہتے ہیں، کئی پُشتوں سے بُری بھلی **اُردو** ہی بولتے بھی اور **لکھتے** بھی تھے، اب اگلوں کے نام کی طرح اگلوں کی زبان کو بھی مٹانا چاہتے ہیں، **بھاشا** مٹ گئی یا گنگا جمنا کے دوآبے میں ڈوب گئی تو **برج بھاشا** کی پیاری راجکماری **اُردو** ہی کو گود میں لے لو، سنو مادرِ وطن تم سے کیا کہتی ہے +

قالب میں روح، تن میں ابھی کچھ ہے جان بھی
کیا ہوگا جب رہے گی نہ مُنہ میں زبان بھی

مذہب کی آڑ میں سیاست تِنکے اوٹ پہاڑ اوجھل، مذہب کا پورا لگاؤ دل سے ہے زبان سے نہیں، مذہبی زبان **سنسکرت** یا **بھاشا** سہی، اگر ملکی زبان اردو رہے جیسے تھی اور ہے تو مذہب کا کچھ بگڑتا نہیں اور دیس کا بناؤ اپنی جگہ پر رہتا ہے، **اُردو** کے دو مرکز **دہلی** اور **لکھنؤ** قرار دیئے گئے، تو وہاں کے مسلم اور ہندو دونوں ہی ماہر فن ہوکر یکساں طور پر مستند ٹھہرے، دیکھو:- **شنکر دیال نسیم** شاگرد **خواجہ آتش** لکھنوی کو حضرت اُستاذی **امیر مینائی** نے فصحا کی صف میں جگہ دی اور اپنے **اُردو لُغت** میں اُن کے اشعار کی سند لی، کیا اب اس خلعت سے عار ہے؟ کیا اس شرف کو ہاتھ سے کھونا چاہتے ہو؟ البتہ **اُردو** کو نت نئے اور ناجائز عمل سے پاک رکھو، **انگریزی، بھاشا، سنسکرت، عربی، فارسی** کسی زبان کے نامانوس لغات، دشوار الفاظ گرانبار ترکیبوں کا بوجھ **اُردو** پر نہ ڈالو، نزاکت جس کو نہ

سنبھال سکے، لطافت جس کو نہ اُٹھا سکے، سلاست جس کی تاب نہ لا سکے، ایسا بوجھ اُس کے تول کو بھاری، مول کو ہلکا کر دیگا، میں اس مضمون میں دکھانا چاہتا ہوں کہ اُردو کی کیسی کایا پلٹ ہوئی ہے، عام طور پر انقلاب زمانہ کے کیا کیا اثر اُس پر پڑے ہیں، ملک کی توجہ بھی اُس کی طرف ہے تو غفلت کے ساتھ، ترقی بھی ہے تو تنزل کا پہلو لئے ہوئے دیکھو! اُردو کی وسعت ایسی کہ ملک کا کوئی گوشہ اُس سے خالی نہیں، اختلاف ایسا کہ ایک صوبے کی زبان دوسرے صوبے سے الگ، مختلف اضلاع میں زبان کا رنگ مختلف، خواص کی اور عوام کی اور، انگریزی خواں چوتھائی **انگریزی** ملی ہوئی، عربی داں نامانوس **عربی** سے مخلوط، ہندی والے اَنمل **ہندی** ملائی ہوئی **اُردو** بولتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں، اس طوفان بے تمیزی میں زبان کی آبرو پر پانی پھر گیا ہے، موتیوں کی لڑی بکھر گئی ہے۔ منتشر ہو کر اُردو کی بھلی اور بُری جتنی قسمیں ہو گئی ہیں اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(بعض قسموں کے محاسن اور اکثر کے عیوب پر نظر کرو)

(۱) **اُردوئے معلّٰی**:- **شاہجہان** کے قلعۂ معلّٰی سے نکل کر خواص **دہلی** کی گودوں میں پل کر آجتک سلاست و فصاحت کے سکے بٹھا رہی ہے۔ دیکھو:- **غالب** کی اُردوئے معلٰی۔ **ذوق** کی قصیدہ گوئی، **مومن** کی غزلسرائی، **داغ** کا ہرا بھرا گلزار، **آزاد** کی **آب حیات** سے دُھلی ہوئی نثر، **نذیر احمد** کے اخلاقی افسانے، **شبلی** کے تاریخی و ادبی کارنامے **حالی** کی قومی صدائیں۔ **حسن نظامی** کے چٹکلے اور چلتے ہوئے لٹکے، **راشد الخیری** کے جوگ بروگ والے مرقعے وغیرہ +

(۲) **اُردوئے مُطلّا**:- شاہان اودھ کے سائے میں پل کر شعرائے **لکھنؤ** کی آغوش تربیت سے نکل کر، زرّیں صحیفوں، رنگین لطیفوں، قیمتی تصنیفوں کے دامن میں پھول برسا رہی ہے دیکھو! سلسلۂ **مصحفی** کے شعرا کی گلفشانیاں، **ناسخ**، **وزیر**، **اسیر**، **منیر** کی بالاخوانیاں، **آتش**، **رند**، **صبا** اور **میر تعشق** کی شیوا بیانیاں، **امیر مینائی** کی قادر الکلامی تمام اصناف سخن کی جان، **میر انیس** کی زبردست مرثیہ گوئی اور اُن کے خاندان کی زبان، **شرر** کے دلکش و دلگداز افسانے، **سرشار** کی لبریز سرور داستانیں وغیرہ +

ان دونوں قسموں کو جو **دہلی** اور **لکھنؤ** کے اُفق سے نکل کر ادبی سطح کو روشن کئے ہوئے ہیں۔ **ماہتاب و آفتاب** سے نسبت دی جائے تو بجا ہے، ملک کے کسی اور خطے کو ان دونوں کے کسب انوار سے مُنہ پھیرنا کب روا ہے، اب ان قسموں پر بھی اک نگاہ غلط انداز ڈالئے جو اپنی حد سے دور اور دائرے سے باہر نکل گئی ہیں +

(۳) **فرہنگی اُردو**:- جو بعض علما کے قلم سے لغات نامانوس کی بدولت محتاج فرہنگ بن کر نکلتی ہے **صراح و قاموس** کی غواصی کے بغیر حل نہیں ہوتی۔ پھر ایسی بلاغت کیا جو فصاحت کو بحر مغلق میں ڈبو دے یا لفاظی سے زبان کا لطف کھو بیٹھے +

(۴) **خود آہنگی اُردو**:- نئے تعلیم یافتہ فارسی داں بھی تشبیہوں یا استعاروں سے روشناس ہو کر جدت کی جولانی دکھاتے ہیں، سلاست کی روش چھوڑ کر دقت پسندی کے میدان میں گھوڑے دوڑاتے ہیں ع نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن

یہ دونوں قسمیں کبھی بیجا قابلیت کی نمائش سے بھری ہوئی کبھی تکلّف و تصنّع کی آرائش سے لدی ہوئی رہتی ہیں +

اب وہ قسمیں آتی ہیں جو لفظی، معنوی، ادبی، علمی نقائص کی بھرمار سے صاف ستھری زبان کا دامن گرد آلود کر دیتی ہیں، گویا ان کا وجود زبان کے لئے ننگ اور ملک کے لئے شرم کا باعث ہے،

(۵) تھو ڈرنگی اُردو:- تجارتی مطبوعات کی ارزانی سے اس ٹکسال باہر زبان کے کھوٹے سکّے چلائے جاتے ہیں، اڈیٹیر کا لقب انگریزی، قلم انگریزی اور کسی زبان کا ماہر نہیں بقول **انشا** "نہ عربی، نہ فارسی، نہ ترکی ہے" اپنے رنگ میں زورِ قلم دکھاتا ہے، نام کے نامہ نگار اپنے اپنے رنگ کے نقشے الگ کھینچتے ہیں، نئی دُکان کی نظم والے ردیف سے آزاد، قافیوں سے بری، بے وزن شعر تولتے ہیں، اشتہاری دنیا والے گرم بازاری کے لئے اپنی اپنی بولیاں الگ بولتے ہیں، خبروں کے سلسلے میں ایک خبر **سنسنی خیز** فارسی قابلیت کا حسرت انگیز ثبوت دیتی ہے، **دن بدن** کا استعمال بجائے **روز بروز** نئے دن کا روزمرہ ہے ملک یا قوم کی نظر سے گذرنے والی مطبوعات میں بڑا حصہ اخبار ہی کا ہوتا ہے، پھر **روزانہ** یا ہفتہ وار **اخباری** لغزشیں کہاں تک زبان کی خدمت کرینگی، اس کا اندازہ لگاکر دست و قلم کو جنبش دی جائے تو **اخبار والے** واقعی زبان کی خدمت کرسکتے ہیں +

(۶) ہُڑدنگی اُردو: جن کے مُنہ میں زبان نہیں وہ بھی ظرافت کے چٹخارے لیتے ہیں، صحبت میں بل پڑے یا متانت میں خلل ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑجائیں اسی کا نام مہذب مذاق ہے، مذاق وہی اچھا جس میں متانت کی جھلک ہو ظرافت اُتنی ہی بامزہ جتنا کھانے میں نمک ہو، **اَلْمِزَاحُ فِی الْکَلَامِ کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ**، یہاں غیروں کی ہنسی اُڑانا ہوتا ہے، وہاں ہر بات ہنسی کھیل ہے،

جو کچھ سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے
میں روتا ہوں اُنکو ہنسی سوجھتی ہے

(۷) بے ڈھنگی اُردو- تار بابو، ریل بابو، دفتر کے لالہ جی، کچہری کے منشی جی، کچھ ہندی، کچھ بنگلہ، کچھ انگریزی کچھ غلط فارسی ملا ملاکر بولتے اور لکھتے ہیں، منشی تیرتھ پرشاد لالہ گرد بر سہائے وغیرہ کی چٹھیاں گرا دیجئے، پھر اُن کے سرشتے اور کاغذات سے اس کی نقل لے لیجئے جتنی سطریں ہونگی اُن سے کم غلطیاں بھی نہ ہونگی سے خود غلط املا غلط، انشا غلط

(۸) **فرنگی اُردو**:- صاحب کے دفتر والے افسر سے محرر، خانساماں، چپراسی تک بولتے ہیں بلکہ اُن کی زبان میں یوں کہئے کہ "بولتا مانگتے ہیں" لکھتے ہیں تو انگریزی قلم سے خواہ مخواہ انگریزی الفاظ نکلتے ہیں، صاحب خوش ہیں کہ وہ ہم سے انگریزی سیکھتا ہے اور ہم اُس سے اُردو +

(۹) جنگی اُردو:- دو کڑی کمان والے آپس میں اُلجھ پڑتے ہیں تو یہ بھی اُن میں کود پڑتی ہے، مُلّاؤں میں چلتی ہے تو کفر کے فتوے لئے ہوئے، ناموروں میں دشنام مہذب کے ساتھ، عوام میں بے نقط اس لئے کہ عوام کا لفظ ہی بے نقط حرفوں سے بنا ہے تیغ زبان کے زخم گہرے ہوتے ہیں اس لئے یہ تعزیرات ھند کے کسی نئے دفعہ کی سزاوار ہے، (**داغ دہلوی**)

بات کا زخم ہے تلوار کے زخموں سے سوا
قتل کر دیجئے پر مُنہ سے کچھ ارشاد نہ ہو

(۱۰) ننگی اُردو:- دو اکھڑ جاہل، نیم وحشی، تہذیب کا لباس شرافت کا جامہ، شائستگی کا پیرہن اُتار کر گالیوں پر اُتر آتے ہیں تو متانت آنکھیں بند کرلیتی ہے، اور غیرت کانوں میں اُنگلیاں ڈال لیتی ہے، معاذ اللہ یہ بڑی شورش انگیز ہے اس کو شور دریائے شور کی سزا مناسب ہے، اس نے تقریباً آدھے **ہندوستان** کو ننگا کردیا ہے، ننگے ملک کی زبان بھی ننگی رہی تو شرم شرم!

اُردو کی اتنی قسمیں کیوں ہوگئیں، دنیا کی اور زبانیں عمر طبعی کو پہنچ گئیں یہ تو اُن سب میں سب سے چھوٹی ہے، بچپن

سے جوانی کے خط و خال نکھرتے کیا اور بگڑتے جاتے ہیں، اصلاح کے لئے تعلیم پھیلاؤ اور تعلیم کے ساتھ زبان کی تربیت بھی، تشخیص کرنے والے اپنی حکیمانہ رائے سے اسباب بھی بتائینگے اور علاج بھی، علاج کے لئے اسباب پر نظر کیجئے، دو سبب اس وقت پیشِ نظر ہیں :-

(۱) مرکز کی تقلید چھوڑ کر تحقیق سے منہ موڑ کر زبان کے دائرے سے باہر ہو جانا +

(۲) عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ کے مختلف مذاق رکھنے والوں کا غیر مانوس الفاظ، نو احداث ترکیبیں بے کھٹکے استعمال میں لانا +

پہلے سبب پر نظر

ہندوستان کے پورے دائرے میں اُردو پھیلی ہوئی ہے اور اُس کا مرکز دہلی یا لکھنؤ کے سوا کوئی نہیں، دونوں کی زبانیں "اُردوئے معلّٰی" یا "اُردوئے مطلا" قبولیت کا خلعت پا چکی ہیں، یہ کہنا کہ تقلید کیسی جب ملک بھر کی زبان اُردو ہے" گویا بے مرکز کا دائرہ بنانا ہے، کون کہتا ہے کہ ہندوستان کی زبان اُردو نہیں، اُردو کی عالمگیری سے تو ملک کا کوئی گوشہ خالی نہیں، دوسری کوئی زبان ایسی نہیں جو ہر صوبے میں کم و بیش بولی یا سمجھی جاتی ہو، یہ شرف اُردو ہی کو حاصل ہے کہ بُری بھلی، تھوڑی بہت ہندوستان بھر میں رائج ہے، البتہ زبان کا سُدھرنا اور سنورنا مرکز کی تقلید پر موقوف ہے، قاعدے کی پابندی پر منحصر ہے +

طوائف الملوکی ہی سے ملک پر آفتیں آئیں، زبان کی طوائف الملوکی یہی ہے کہ دہلی یا لکھنؤ کے پائے تخت کو چھوڑ کر ہر صوبے یا ہر ضلعے کو اپنا دار السلطنت بنالے (داغ دہلوی)

کیوں داغ دہلوی کی زبان مستند ہو پیدا کیا خدا نے اُسے تختگاہ میں

نت نئے "دخل در معقولات" کو دیکھتے ہوئے وہ یہاں تک کہہ گئے ؎

غیروں کا اختراع و تصرف غلط ہے داغ
اُردو ہی وہ نہیں جو ہماری زبان نہیں

عدم تقلید اہل زبان اُردو کے دامن پر ایسا بدنما داغ ہے جو بڑھتے بڑھتے اُس کی ساری خوبیاں ملیامیٹ کر سکتا ہے تعلیم و تربیت کے بغیر کوئی زبان نہیں آتی پھر اُردو کیا بچوں کا کھیل ہے ؎

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہدو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

اہل زبان کے سامنے زباندانی کا دعویٰ، جادو بیان کے آگے خوش بیانی کا غرہ ایسا ہے جیسے سورج کے سامنے چراغ یا چاند کے آگے داغ، امیر مینائی

دعوئے زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے
اظہار بوئے مشک غزالوں کے سامنے

سوال :- دہلی یا لکھنؤ والوں کے سوا دوسری جگہ کے ماہر فن و زباندان بیکار ہیں تو شاعری و زباندانی کا سودا کیوں سر پر سوار ہو +

جواب :- کہیں کے رہنے والے کیوں نہ ہوں، مرکز کی تقلید، اساتذہ کے استفادہ، زبان کی تحقیق سے دہلویوں اور لکھنویوں کے ہم پایہ مانے جا سکتے ہیں، سکونت سے نہ سہی، نسبت سے سہی، صحبت سے سہی، تربیت سے سہی، اگلے شعرائے پارسی کی مثالیں موجود ہیں حضرت خسرو علامہ فیضی ہندوستان ہی کی خاک پاک سے زبان پارس کے سرمایہ ناز ہوئے، پھر ہند کی سرزمین والے اہل فن و زبان داں ہو کر کیوں اُردو کے سرمایہ ناز نہ ہونگے، اہل زبان فقط دہلوی یا لکھنوی ہوتے تو خواص کے

علاوہ عوام کی زبان بھی مستند ہوتی، فصحا کی طرح عام شعراء کا بھی کلام سند ہو جاتا (امیر مینائی) فرماتے ہیں ؎

ہم سند کے لئے لغت میں امیر
فصحا کی زبان لیتے ہیں

جب دہلی اور لکھنؤ کے لئے بھی خواص کی شرط ٹھہری تو ہر جگہ کے نوخیز ناآشنا کیوں اجتہاد سے کام لیتے ہیں؟ ماہر فن کی اور بات ہے ؎

شاعری کھیل نہیں ہے جسے لڑکا کھیلے
ہم نے بچپن برس اس فن میں ہیں پاپڑ بیلے

آجکل تلمذ و استفادہ لوگ کسرِ شان سمجھتے ہیں، اور بعض اَلشُّعَرَاءُ تَلَامِذَۃُ الرَّحْمٰن کو تمغائے شرف جانتے ہیں۔ اچھا شاعری الہام سہی، شاعر پیغمبر سخن سہی، مگر کسی اُمت کا بے پیغمبر یا کسی پیغمبر کا بے اُمت رہنا کون سی فخر کی بات ہے +

اگلے شعرا نسبت تلمذ کو فخر سمجھتے تھے، دیکھو چند مثالیں، تعلّی یا عجز دونوں پہلوؤں سے تلمذ ہی مایۂ ناز ہے +

(وزیر) اُس کا ہوں میں شاگرد جس کو کہتے ہیں منصف
لیا ملکِ معانی بادشاہِ شاعراں ہو کر

(رند) چل کے یہ عرض کرو حضرتِ آتش سے رند
معرکہ آپ کا یہ طفلِ دبستاں جیتا

طفلِ دبستاں، میدان سے گوئے سبقت لیجانے پر بھی اُستاد ہی سے عرضِ حال کرنے جاتا ہے کہ آپ ہی کا فیض تھا ورنہ میں کیا؟

(صبا) تم ایک ہی آتش زباں ہو چپ بھی رہو
چراغ پا نہ کہیں سُن کے انوری ہو جائے

آتش زباں کی ترکیب بتا رہی ہے کہ اپنی زبان پر نہیں اُستاد کی زبان پر فخر ہے۔ صبا تخلص اُس پر چراغ پا کا محاورہ انوری کے ساتھ نورٌ علیٰ نور ہے، دیکھو یہی شاعری و زبان دانی کا شعور ہے +

(داغ) یہ بہارِ داغ ہے گلزارِ ابراہیم کی
ذوق کہتے ہیں جسے ہے فیض اُس اُستاد کا

اُستاد کا تخلص ذوق نام ابراہیم ہے، اس لئے گلزارِ ابراہیم ذوق سلیم کا پتا دیتا ہے +

(تسلیم) مرا جو نالۂ موزوں ہے تسلیم
تصدّق ہے نسیم دہلوی کا

نالۂ موزوں کے وزن کا اندازہ کر و جو شاگرد کا پلہ اُستاد سے ہلکا نہیں ہونے دیتا +

(شوق قدوائی) جتنی میرے سخن کی ہے دھوم
سب ہے فیضِ اسیر مرحوم

افسوس! حضرت شوق قدوائی بھی مرحوم ہو گئے)

(ناچیز راقم سطور جو کسی شمار میں نہیں)

مے گلرنگ سخن سے یہ ٹپکتا ہے شفق
تو ہے شاگرد امیر احمد مینائی کا

آجکل ٹوٹی پھوٹی اُردو میں انگریزی کا ترجمہ کر دینے والا کچھ جوڑ توڑ کر سوکھی روکھی بیجان نظمیں لکھ لینے والے سبھی کچھ سمجھے جاتے ہیں، نہ کوئی شعرا کی سُنتا ہے نہ اہلِ زبان کی محاورات کی چھان بین ہے نہ متروکات کی پابندی، زبان کی ترقی، زبان کی وسعت یاد ہے زبان کی صحت سے کچھ بحث نہیں، دعووں کی بلند پروازیاں ہیں اور بلند پروازیوں کے دعوے۔ (امیر مینائی) بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے، اُردو کی ترقی کے لئے انجمنیں قایم ہوتی ہیں، تعلیمگاہیں کھلتی ہیں تو فقط علوم جدیدہ کے ماہر ارکان خصوصی ہوتے ہیں، شعرا یا اہلِ زبان گداگر، پرانے خیال والے سمجھ کر پوچھے ہی نہیں جاتے۔ فقط شمس العلما یا خان بہادر سرکار

شاعری، زبان دانی کے بھی بہادر سمجھے جاتے ہیں +

دوسرے سبب پر نگاہ

کوئی کہتا ہے "اُردو معجون مرکّب ہے، ہر زبان کو اپنے دامن میں لے سکتی ہے، عربی فارسی اُس میں ملی جلی ہے تو انگریزی بھی بڑھ کر ہاتھ ملانے کی مستحق ہے یہ موجودہ کشور کشا کی زبان ہے، اُردو میں جس طرح تائے ثقیلہ و دال ثقیلہ وغیرہ ہیں، انگریزی میں بھی ہیں پھر ثقیل کو ثقیل سے ملنے میں کیا عذر ہے ؎ کند ہم جنس باجنس پرواز"

طبیب ہر شخص کو معجون مرکب بنانے کا مجاز کر دیتا ہے یا اپنی طبّی معلومات سے ترکیب دیتا ہے، دو ثقیل آپس میں ملیں گے تو ثقالت بڑھے گی یا گھٹ جائیگی، اُردو نے غیر زبان کے جتنے الفاظ خوشی سے اپنے دامن میں لیلئے ہیں یا بے تکلف چلے آئے ہیں، فصحا نے اُنہیں اس لئے چھوڑ دیا کہ ادائے مطلب کے لئے نئے الفاظ نہ بنائے جاسکتے تھے نہ بنانے کی ضرورت تھی جس مفہوم یا مدّعا کے الفاظ اُس کے پاس پہلے سے موجود ہیں، اور مشہور و مقبول بھی ہیں اُن کی جگہ نامانوس الفاظ کیوں بھرتی کئے جائیں پھولوں کے رہتے ہوئے اُس کا دامن کانٹوں میں کیوں اُلجھے، اُردو ہاتھ نہ بڑھائے اور انگریزی اُس سے زبردستی ہاتھ ملائے، یہ کون سی تہذیب ہے، کشور کشا کی زبان مہذّب ہے تو باقی زبانیں کیا غیر مہذّب ہیں، کیا وہ کبھی کشور کشا کی زبانیں نہ تھیں۔ میں تو اوپر ہی لکھ چکا مفتوح فاتح کی زبان پڑھ کر اپنی مادری زبان یکقلم بھول جائیں تو یہ کونسی سعادتمندی ہے، جنس باہمجنس کی پرواز تک مرغ وہم و خیال بھی نہیں پہنچ سکتا، ماشاء اللہ دو زبانوں میں جنس ہی جنس دکھائی دی، یہ نئی منطق ہے جس میں جنس ہے مگر فصل ندارد +

انگریزی کو چھوڑیئے یہ تو آپ کے عہد نوخیز میں نازل ہوئی ہے، فصحا کہتے ہیں، عربی کے نامانوس لغات، فارسی کی گرانبار ترکیبوں کا بھی بوجھ اُردو کی نزاکت نہیں سنبھال سکتی (داغ دہلوی) کہتے ہیں اُسے زبان اُردو جیسی نورنگ فارسی کا اُردو ہی معجون مرکب نہیں، انسان خود ایک معجون مرکب ہے،

آدمی زادہ طرفہ معجونیست
از فرشتہ سرشت و از حیواں

جس طرح آدمی کا قوّت ملکی سے قوت حیوانی پر غالب رہنا آدمیت ہے، اُردو کا غیر ملکی زبانوں سے مغلوب نہ ہونا اُس کی صلاحیت ہے، یہاں دقّت یہ ہے کہ ایک زمانہ اُس کے بگاڑنے ہی پر تلا ہوا ہے لایصلح العطار ما افسد الدھر، (راقم عفی عنہ)

نسخے کی طرح جس کا بدلتا رہے مزاج
کیا اُس مریض کا ہو مداوا طبیب سے

کوئی کہتا ہے، تخیّل جدید کا نیا لباس زیب تن کرنا، تخیّل قدیم کا پُرانا خرقہ اُتار کر پھینک دینا چاہئے، پُرانی لکیر کے فقیر نہ بنو، قصیدہ گوئی، غزلسرائی حسن و عشق کے ترانے سب بے وقت کا راگ ہیں، سرسری نظر میں یہ خوشنما تجویز بلا تائید پاس کر دینے کے قابل ہے، لیکن ذوق سلیم ہاں میں ہاں ملا دینے سے معذور ہے، تخیّل جدید بمصداق کُلّ جدیدٍ لذیذٌ مزے کی چیز ہے، مگر زبان جدید، وزن جدید، تصرّفات جدید، اختراعات جدید باختیار خود سامان ملامت ہیں، خدا اُردو کو سلامت رکھے، ایسی ملامتیں اُس سے دور رہیں، ان ملامتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح اُس سے نکال کر پھینک دینا چاہئے،

سوز دل پروانہ مگس را ندہند

تخئیل قدیم کا پُرانا خرقہ اُتار دینا خرقِ عادت سے کم نہیں اور خرقِ عادت فلسفۂ جدید میں محال ہے، مہذّب قومیں اسلاف کے قدیم کارناموں کو زندہ رکھتی ہیں، نئی تہذیب قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی اساتذہ کے تمام اصنافِ سخن کو مُردہ سمجھ کر دفن کر دینا چاہتی ہے، پُرانی لکیر چھوڑ کر نئی لکیر کے فقیر شاہراہ سے دُور غلط رستے پر جا رہے ہیں ترقیِّ معکوس سے اُردو کو قعرِ تنزّل میں گرا رہے ہیں، قصیدہ گوئی، غزلسرائی دونوں ایک "سخن فہمی عالمِ بالامعلوم شد" کہاں قصیدہ کہاں غزل؟ زہے سر دو بے محل، قصائد مدحیہ خوشامد کے جرم میں خارج البلد ہو چکے، تشبیب کا شباب بھی رخصت ہو گیا، گُریز نے راہ گریز لی، اَلْمَاضِی لَا یُذْکَرْ +

غزلسرائی جس نے حافظ کو لسان الغیب، سعدی کو بلبل شیراز، خسرو کو طوطی ہند بنا دیا، میر کے نشتر، غالب کے تیر نیمکش، مومن کے انداز، آتش کے سوز و ساز، امیر و داغ کے ناز و نیاز کا رنگ جما دیا، اب اُس کے نقش قدم بھی مٹا دئے جائیں، درد بھرے دل چوٹ کھائی ہوئی طبیعتیں، اچھوتے خیالات ہی نہ رہے تو غزلیں کون سُنے اور کس کی سامعہ نوازی کی جائے، حسن و عشق کے دُکھڑے پُرانے ہو گئے، حُسن عیب ہے تو "عیب نماید ہنرش در نظر" بھی پُرانا ہی مقولہ ہے عشق سزاوار ملامت ہے تو یہ سزا بھی نئی نہیں، شعرا نے بھی زمانے کی ہَوا کا رُخ بدلتے دیکھ کر دواوین غزلیات کے ورق تہ کر دئیے ہیں ؎

زمانے کا ورق اُلٹا ہوا ایسا نظر آیا
شفق تہ کر کے میں نے دردِ غم کی داستاں رکھدی

(بوساطت کوثر میرٹھی) خاکپائے شعرا
شفق رضوی عفی عنہ عماد پوری

ہمدردی

جب کبھی میں دنیا کے سب سے بڑے دولتمند ہنری فورڈ (جو کہ اپنی آمدنی میں سے لاکھوں روپے، بچّوں کی تعلیم؛ بیماروں کی خبرگیری، غُربا کی امداد، اور بوڑھوں کی دستگیری کے لئے خرچ کرتا ہے) کی تعریفیں سُنتا ہوں، تو میرے دل پر ایک خاص اثر ہوتا ہے +

مگر میں ساتھ ہی اُس غریب دیہاتی کو یاد کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جو کہ اپنی ایک بھانجی کو، جو یتیم ہو گئی تھی، پرورش کے لئے اپنے گھر لے آیا تھا +

دیہاتی کی بیوی نے اُس وقت کہا تھا "اگر ہم صغرا کو گھر لے آئے تو ہم اور زیادہ تنگدست ہو جائیں گے، اور روٹی کے ساتھ دال تک میسّر ہو سکیگی" +

اور دیہاتی نے جواب دیا تھا "کوئی ڈر نہیں... ہم روکھی سوکھی سے ہی گذارہ کریں گے" +

ہنری فورڈ ابھی اس دیہاتی سے بہت پیچھے ہے!

بدرالدین

شاہنشاہ رضا خان شاہِ ایران

اس بات کے باور کرنے میں چاہے کتنا ہی شک کیا جائے کہ کسی ملک کو راہنما کی تلاش میں اتنی مایوسی نہیں ہوئی جتنی کہ ۱۹۲۱ء میں ایران کو ہوئی تھی، اور رضا شاہ کی نسبت بھی چاہے کچھ ہی کہا جائے، مگر اس سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے وقت میں ملک کا حقیقی خیر خواہ تھا۔

جس وقت وہ ایران کے اسٹیج پر ظاہر ہوا تو اس کی عمر چالیس سال کے قریب تھی، کاسک فوج کے دستہ کے باہر اسے کوئی جانتا نہ تھا، وہ اُمّی محض تھا، دنیا کی سیاحت تو کجا اُس نے ایران میں بھی بہت کم سفر کیا تھا، سیاسیات سے بالکل بے بہرہ، لیکن پچیس ۲۵ سو سواروں کی سرکردگی میں طہران کے اندر داخل ہوتے ہی اُس نے اپنے آپ کو نپولین یا میسولینی کی حیثیت میں پیش کیا، اور باوجود اسکے کہ اس میں نپولین جیسی فوجی ذہانت اور میسولینی ایسا خلقی تدبّر موجود نہ تھا، تاہم وہ ان دونوں کے اوصاف خصوصی سے بہرہ ور ضرور تھا، وہ فطرتاً آزاد منش تھا، اور حصولِ مقاصد کی راہ میں نہایت دلیری اور فرزانگی سے پیش قدمی کرتا تھا، اور یہی وہ خصوصیات ہیں جنہوں نے اُسے تختِ شاہی پر متمکن کر کے وصی اللہ کے رتبہ تک پہنچا دیا، رضا شاہ کی رفتار ترقی کا اگر کل خاتمہ بھی ہو جائے تو بھی اُس کے اقتدار اور زوال کی داستان ایران کی تاریخ میں سنہری حروف سے مثبت رہیگی۔

کیانیوں کے انحطاط سے ایران کے زوال کا دور شروع ہوتا ہے، اُس زمانہ کی تاریخ ہمارے نزدیک نہایت دھندلی ہے، ان سے صرف طلبا نے مدارس ہی بہرہ اندوز ہو سکتے ہیں، مگر تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اہل ایران ابتک اپنے آپ کو دورِ ماضیہ کے عروج کا جائز حقدار خیال کرتے ہیں، چنانچہ طہران میں یہ افسانہ ابتک متداول ہے گذشتہ صدی کے اختتام پر جب ناصر الدین شاہ قاچار یونان کے ایک مدبّر سے ملاقی ہوا تو اُس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یونانی اپنے گذشتہ اختلافات کو بالکل فراموش کر چکے ہیں"، یونانی مدبّر جو انیسویں صدی کی عقل کا مالک تھا یہ سمجھ ہی نہ سکا کہ شاہ کس کے متعلق گفتگو کر رہا ہے، مگر شاہ نے اپنے وقت کے دیگر ایرانیوں کی طرح نہایت فخر و مباہات سے اپنے آپ کو کیخسرو، دارا اور زرکسیس کی روایات کا وارث اصلی اور شاہ عبّاس صفوی اور خاندان قاچار کی شہرت و ناموری کا مالک حقیقی جتلایا۔

عظمت ماضیہ کے اس احساس کی موجودگی میں کہ ایرانیوں کی گذشتہ تاریخ نہایت شاندار ہے، نہایت افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ اُنہوں نے اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ "پدرم سلطان بود" کی رٹ لگاتے اور اسلاف کے کارناموں پر اِتراتے تھے، مگر اتنا نہیں سوچتے کہ وہ خود کسقدر قعرِ ذلت میں گر چکے ہیں، اور اُن کی موجودہ حالت کیا ہے! اٹھارہویں صدی سے لیکر انیسویں صدی تک ان کی عام ملکی حالت نہایت روبہ تنزل رہی ہے، یہاں تک کہ جن قبائل اور اقوام کو وہ جاہل اور وحشی سمجھتے تھے، وہی یکے بعد دیگرے دارالسلطنت کے مختلف صوبجات پر قبضہ کرتے جاتے تھے، اور ایرانیوں کا جذبہ حریت اسقدر مردہ ہو چکا تھا کہ انہیں اپنے کھوئے

ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کا کبھی خیال بھی نہیں آیا +

اس میں شک نہیں کہ ایرانیوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں تھوڑا بہت ناصرالدین شاہ قاچار کا بھی ہے، اور باوجود اس کے کہ وہ قدیم خیالات کا آدمی اور پرانی لکیر کا فقیر تھا، اس کے دل میں نئی روشنی کی لہر ضرور موجزن تھی، مگر عملی جوہر دکھانا کامیاب ہی رہا +

ناصرالدین کے قتل سے لے کر رضاشاہ کے دخل تک (یعنی ۱۸۹۶ء سے لیکر ۱۹۲۱ء تک) کی تاریخ ایران کا خلاصہ صرف دو جملوں میں ادا ہو سکتا ہے، ایک تو یورپین اقوام کا اثر و رسوخ اور دوسرے ملک کے قدیم نظام کی تباہی و بربادی +

رضاشاہ ایسے آدمی کا شاہ ایران کے زمرہ میں آنا ہی طہران کی متمدن اور تہذیب یافتہ دنیا کو اوپر سے نیچے لا پھینکنے کے لئے کافی ہے، وہ مازندران کی پہاڑیوں میں ایک غریب کسان کے ہاں پیدا ہوا تھا، اس کے آبا و اجداد اکثر حکومت کو تنگ کیا کرتے تھے، مگر اس بیان کے تسلیم کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کہ اس کا خاندان اپنے حلقۂ اثر میں ایک امتیازی درجہ رکھتا تھا +

رضاخان کے ابتدائی حالات بہت کم ملتے ہیں، اسکے وزیراعظم کا بیان ہے کہ "جب اس کی عمر پندرہ سال کی ہوئی تو وہ معاش کی تلاش میں گھر سے نکلا، طہران آیا اور ایک فوج وزیر کے ہاں سائیس مقرر ہوا، مگر اس واقعہ کے پانچ ہی سال بعد وہ ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے فوج کا سک میں بھرتی ہو گیا، اور اُس وقت سے لیکر وزیر سلطنت اور بالآخر بادشاہ بننے تک اُس نے اپنے آپ کو نہایت ذکی الحس ثابت کیا ہے +

رضاشاہ کو شاہی خاندان سے تعلق رکھنے یا اعلیٰ درجہ کا مہذب و تعلیم یافتہ ثابت کرنے کے لئے مغربی نامہ نگاروں نے قسم قسم کی افسانہ نگاریاں دکھائی ہیں، کوئی اُسے بیٹروگراڈ میں تعلیم حاصل کرتا ہوا دیکھتا ہے، کوئی اُسے شاہ ایران کا سفیر اور کوئی اُسے بیٹروگراڈ کی فیشن ایبل سوسائٹی کا ایک رکن سمجھتا ہے +

یہ تمام باتیں من گھڑت افسانے ہیں، ہر وہ شخص جسے واقعات کا کچھ نہ کچھ علم ہو یہ کہہ سکتا ہے کہ رضاشاہ نے آجتک ایران سے باہر ایک قدم نہیں نکالا، اور نہ ہی اُس نے ابھی تک روس اور قسطنطنیہ کی شکل دیکھی ہے، وہ کبھی کسی شاہ کے ایما سے باہر نہیں بھیجا گیا، اور نہ ہی اُس نے کبھی ترکی وردی پہنی ہے، وہ کبھی فوجی اُمیدوار نہیں بنا اور نہ ہی اُسے روسی کے سوا یورپ کی کوئی اور زبان آتی ہے +

رضاشاہ کا خاندانی نام "پہلوی" ہے، یہ فارسی زبان کا ایک قدیم لفظ ہے، اور اغلباً اس نے اُس وقت انتخاب کیا تھا جب وہ وزیراعلیٰ کے فرائض انجام دے رہا تھا، اور جس وقت ایران میں خطابات کی تنسیخ اور خاندانی ناموں کی اختیاری کا قانون وضع ہوا تھا، بہت کم عہدہ دار ناموں کے ساتھ یاد کئے جاتے تھے، وہ عموماً "یمین الدولہ" "سپہر سلطنت" یا اس قسم کے دیگر معزز القابوں سے خطاب کئے جاتے تھے، رضاشاہ نے اپنے لئے وہ نام تجویز کیا جو اسے بیحد پسند خاطر تھا، بعضوں نے حیوانوں اور پرندوں کے ناموں پر اپنے نام رکھے، اور اکثروں نے تو بہت سے دل خوش کن الفاظ کی آمیزش سے چند بے معنی نام تیار کئے، رضاشاہ نے اورنگ قاچار پر جلوہ افروز ہوتے ہی نہایت جوش و ادعا کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ "پہلوی" اسکا خاندانی نام ہے، یہ خاندان شاہانِ قدیم کی نسل سے ہے، اور نیز یہ کہ وہ خود بھی شاہی خون سے ہے +

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ "گذشتہ سات آٹھ سو سال سے "پہلوی" خاندان کا ستارۂ اقبال سخت گردش میں رہا ہے، اسے مصائب و آلام کی تیرہ و تار آندھیوں نے اس درجہ محیط کر لیا تھا کہ اُس کے اکثر افراد کو جن میں اس کا باپ بھی شامل تھا، نامساعدتِ روزگار اور نیرنگیٔ تقدیر سے تنگ آکر مجبوراً غریب پیشوں کی طرف رجوع کرنا پڑا، مگر اس سے اُن کی قدامت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آسکتا"، مگر یہ افسانہ بھی آجکل کے جدت طراز دماغوں کی اختراع معلوم ہوتا ہے +

کاسک فوج میں بھرتی ہونے کے وقت سے رضاشاہ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، اس زمانہ کی تاریخ بھی کچھ اتنی تاریک نہیں ہے، رضا خان نہایت قوی ہیکل، بہادر، تنومند، اور من چلا نوجوان تھا، فوج کاسک کے تمام سپاہی اس سے دبتے اور اس کا لوہا مانتے تھے، ۱۹۱۹ء میں جب جنگلیوں کے خلاف لشکر ہوئی تو رضا خان نے شجاعت کے وہ جوہر دکھائے کہ ناموری کے مراحل طے کر کے ترقی کے بام پر چڑھ گیا، ۱۹۲۰ء میں جب آذربائجان کے اشتراکی جمہوریت پسندوں نے کاسک فوج کو شکست فاش دی تو رضا خان نے فوج کے منتشر شیرازہ کو دوبارہ ترتیب دینے میں نہایت نمایاں حصہ لیا، اس قابلیت اور حسنِ خدمت کے صلہ میں اُسے قاسم خان اور مسعود خان کی ماتحتی میں فوج کا ایک کرنیل بنا دیا گیا +

ان دنوں طہران میں رشوت ستانی کی بڑی گرم بازاری تھی، مگر یہ راز آجتک طشت از بام نہیں ہو سکا کہ کسی شخص کو نقد و جنس کے صلہ میں کچھ فائدہ بھی حاصل ہوا یا نہیں؟ مسٹر روتھ سٹین جو سوئیٹ کی طرف سے طہران میں سفیر رہ چکے ہیں، جب مسٹر ونسنٹ شین سے ماسکو میں ملے تو باتوں ہی باتوں میں کہنے لگے کہ "میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایران کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں"، اور جب اُن سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو وہ سوائے اس کے اور کچھ نہ کہہ سکے کہ "وہ آج انگریزوں اور روسیوں سے، اور کل فرانسیسیوں اور جرمنوں، غرضکہ ہر ایک سے روپیہ حاصل کر لینگے مگر کسی کا کام نہ کریں گے آپ روپیہ دیکر چھ سے زائد مرتبہ ان کا ملک خرید لیں مگر کیا مجال کہ کبھی اس کا نام بھی لے سکیں، اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ایران کبھی زوال پذیر نہیں ہو سکتا، اس کی بنیادیں نہایت مستحکم ہیں" +

اس قسم کا استحکام ۱۹۲۰-۲۱ء کی سردیوں میں اسقدر گرمجوشی پر تھا کہ اس نے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان ایرانیوں (جن میں چند فوجی افسر بھی شامل تھے) کے دلوں میں ایک قسم کی نفرت پیدا کر دی، اس مفید تحریک کا بانیٔ اعظم طہران کے مشہور اخبار "رعد" کا مدیر سید ضیاء الدین تھا، اس کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ کسی طرح سپہدار اعظم کی حکومت کو منقلب کر کے ملک پر سے خارجی اثرات زائل کر دیں، اسے اپنے انقلابی لائحہ عمل کو کامیاب بنانے کے لئے بہترین آلۂ کار قزوین کا کاسک رسالہ نظر آیا، چنانچہ اس نے سب سے پہلے مسعود خاں کو اپنا رازدار بنایا اور اس کی مدد سے قاسم خاں اور رضا خاں کو شریک حال کیا +

اس کے بعد اس جماعت نے فیصلہ کیا کہ ۲۰ اور ۲۱ فروری کی درمیانی شب کو طہران پر دھاوا بول دیا جائے، رضا شاہ کو ڈھائی ہزار سواروں کا افسر مقرر کیا گیا، اس نے بلا حیل و حجت اس تجویز پر عمل کیا، چپ چاپ قزوین کے رستے شہر میں داخل ہوا اور تمام دفاتر حکومت پر قبضہ کر لیا، یہ تمام کارروائی اس خاموشی اور سکون سے عمل میں لائی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی، لوگ ابھی سو کر بھی نہ اُٹھے تھے کہ

تمام ملک میں تنفرِ عظیم بپا ہوچکا تھا، اور رضا خان "سرداسپاہ" کے جلیل القدر خطاب سے تمام افواج کا افسرِ اعلیٰ تسلیم کیا جاچکا تھا +

آنریبل جے ایم بالفور جوان دنوں برطانوی وفد ایات کے ممبر کی حیثیت سے طہران میں مقیم تھے بیان کرتے ہیں کہ انہیں صبح کی حاضری کے وقت تک یہ پتہ نہ چل سکا تھا کہ شہر میں کوئی انقلاب رونما ہوچکا ہے یا نہیں، کسی مقام پر کوئی مقابلہ یا رُکاوٹ وغیرہ پیش نہ آئی تھی" +

یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایران کے رؤسا، اور امرا نہایت مہذب، شریف، خلیق اور تعلیم یافتہ ہیں، انہیں عیش وعشرت سے خاص لگاؤ ہے، اور ضرورت کے تو وہ بے حد دلدادہ ہیں، رضا خان نے اس جماعت میں شامل ہوکر سخت گھبراہٹ کا اظہار کیا، بہت سے امرا جنہیں فروری ۱۹۲۱ء میں اس سے ملنے کا پہلی دفعہ اتفاق ہوا تھا خیال کرتے تھے کہ وہ بالکل اَن پڑھ مگر قابل سپاہی ہے جو تمام عمر شاید اسی حالت میں رہیگا، چند ایک شہزادے جن میں سردار اسد بھی ہے اسے اپنے زیرِ حکم رکھ چکے تھے اور چند ایک کے لئے اسے محافظت کے فرائض انجام دینے پڑتے تھے، ان شہزادوں کی نظر میں یہ انقلاب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک تجویز تھی جو ضیاء الدین نے اپنی حکومت کی استقامت کے لئے تراشی تھی +

مگر ان کا یہ نقشِ خیالی بہت جلد مٹ گیا، رضا خان کو فوج کی کمان کرنے سے اپنی طاقت کا اندازہ ہوچکا تھا، وہ اپنے آپ کو ملکی سلطنت کا ایک عہدہ دار خیال کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ حکومت کے تمام اہم امورات اس کے مشورہ سے سرانجام پائیں، اس نے فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے کے لئے روپیہ طلب کیا اور اس بات کا بھی تقاضا کیا کہ جب کوئی امیر بگڑے تو اس کی سرکوبی کے لئے بھی اسے مامور کیا جائے +

ضیاء الدین کی حکومت رضا شاہ جیسے جابر آدمی کی جویا تھی، کیونکہ ٹکسوں کی وصولی بالکل ناممکن ہوچکی تھی، اور ملک کا محاصل اراضی بھی تقریباً اسی درجہ پر پہنچ چکا تھا فوری ضرورت کی بنا پر ضیاء الدین نے رضا شاہ کو حکم دیا کہ وہ چند سربرآوردہ اور متموّل امرا کو حراست میں لے لے، چنانچہ شہزادہ فیروز جو اینگلو پرشین مجلس کے ارکان میں سے تھا اپنے باپ فرمان فرما کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا، نئی حکومت کے ابتدائی ہفتہ میں بہت سے سردار جیل بھیجے گئے، اور جن سرداروں سے ٹیکس کا روپیہ وصول نہ ہوا اُن کی جائدادیں ضبط کر لی گئیں +

رضا خان وزیرِ اعظم کی حیثیت سے زیادہ دیر تک کام نہ کرسکا، اُس نے سویٹ سفیر کی مخالفت شروع کردی اور ساتھ ہی ساتھ افسرانِ فوج، امرائے ذی وقار اور بالخصوص اُن جاگیرداروں کو تنگ کرنا شروع کیا جو اُس وقت برسرِ اقتدار تھے، اس کے علاوہ اُس نے بادشاہ کو بھی ناراض کر لیا، کیونکہ اُس نے اُس کے چند رفتہ داروں کو غبن کے الزام میں گرفتار کرکے جیل بھیج دیا تھا +

اب رضا خان کے لئے دوسرا قدم اُٹھانا نہایت آسان ہوگیا، چنانچہ ۳ر اپریل کو اُس نے سید ضیاء الدین کو مجبور کیا کہ وہ اپنا استعفیٰ داخل کرے، اور اُسی دن ایک نیا کابینہ وزارت تیار کرکے خود وزیرِ جنگ بن بیٹھا، وزارتِ عظمیٰ کے لئے اُس نے قوام السلطان کو منتخب کیا، وہ گذشتہ ایّام میں بالزام غبن قید ہوچکا تھا، قوام جیل سے محل میں آیا اور ایرانی وزارت کا رکنِ اعظم مقرر ہوا، ہر ایک طرافی اس وزارت کو رضا خان کی کارستانی تصوّر کرتا تھا +

قدامت پسندوں نے اسے ایک نئی آفت خیال کیا، مگر رضا خان نے اس کے بالکل برعکس کر دکھایا، اُس نے ایک

خود مختار فوجی افسر کی حیثیت سے اپنے آپ کو فوج کی تنظیم، باغی قبائل کی گوشمالی اور خودسر صوبجات کو مرکزی حکومت میں شامل کرنے کے لئے وقف کر دیا، اُس نے فوج کی تعداد میں اضافہ کرکے چالیس ہزار آزمودہ کار سپاہ تک پہنچا دیا، چوری اور ڈاکہ کا بخوبی انسداد کیا، رفاہ عام کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیا، اور سڑکوں پر جا بجا پہرہ دار مقرر کرکے اپنے آپ کو حکومت کا دست راست ثابت کیا +

خارجی حکمت عملی اور مالی اصلاح کے متعلق اس کے خیالات قابل قدر تھے، وہ چاہتا تھا کہ ایران ٹرکی کے ساتھ معاہدہ کرکے معاملات خارجہ میں آزاد مطلق ہو، غیر جانبدار مگر غیر سیاسی عملہ کے ذریعہ مالیات کی اصلاح کرے +

سنہ ۱۹۲۱ء میں پہلے پہل "امریکن وفد مالیات" کے لئے گفتگو شروع ہوئی، چنانچہ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۲۲ء کو واشنگٹن میں ایرانی سفیر مرزا حسین خاں نے عہدنامہ مرتب کیا جس کی رو سے ڈاکٹر اے سی ملسپاغ جیسے ماہر اقتصادیات کی سرکردگی میں ایک وفد روانہ ہوا +

رضا خان کو اپنی مطلق العنانی کے پہلے دو سالوں میں مالی مشکلات کے علاوہ چند اور مشکلات سے بھی دوچار ہونا پڑا لورستان کی خودسر جماعت حکومت کے کل پرزوں کو بیکار کر رہی تھی، شمالی علاقہ جنگلیوں کے سردار کوچک خان کے ذریعے تباہ و برباد ہو رہا تھا، بلوچستان بھی اسی طرح بغاوت پر آمادہ و تیار تھا، خوزستان جیسے زرخیز ترین صوبہ میں شیخ خزل محمرہ نے انگریزوں کے زیر حمایت ایک آزاد سلطنت قایم کر لی تھی، ایران کو متحد و فارغ البال ہونے کے لئے ان تمام اضلاع کو اپنے ساتھ ملانا نہایت ضروری تھا، چنانچہ رضا خان نے کمر ہمت چُست کر لی، اور اس کار عظیم کے تکمیل کے لئے مکمل کھڑا ہوا، آج اسے اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اُس نے چار سال کے عرصہ میں اس کام کو سرانجام کرکے چھوڑا +

رضا خان کی فوجی طاقت عسکر، پولیس اور آمنوں پر مشتمل تھی، موخر الذکر جماعت بہت سست اور طماع تھی، قیام امن ان کے فرائض میں داخل تھا، مگر اُنہوں نے سفر کو دشوار تر کے تجارت کو خطرہ میں ڈال رکھا تھا، پولیس جس میں ابھی تک سویڈش افسر موجود تھے نظر انداز کی جاسکتی تھی، مگر دیگر صیغہ جات رضا کی خاص توجہ کے محتاج تھے +

رضا خان نے وزیر جنگ کی حیثیت سے تمام محکہ جات حکومت میں اتنا اثر و رسوخ اور ملک بھر میں اتنی ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی کہ سنہ ۱۹۲۳ء کے موسم خزاں میں اس کا دوسروں کی معرفت حکومت کرنا ایک بے معنی ستم معلوم ہوتا تھا، چنانچہ ۳۱ اکتوبر کو اُس نے حکومت کو مستعفی ہونے پر مجبور کیا، اور وزارت عظمیٰ کا قلمدان اپنے ہاتھ میں لے لیا، علاوہ ازیں وہ سردار سپاہ اور وزیر جنگ کے خطابات سے بھی ملقب تھا +

سنہ ۱۹۲۴ء کے موسم گرما میں شیخ محمرہ نے بختیاریوں اور کاشغیوں کو بغاوت پر آمادہ کیا، اور انہیں طرح طرح کے انعام و اکرام سے مالا مال کرکے سامان جنگ بہم پہنچانے کا وعدہ کیا، اس طرح ستمبر تک، تمام جنوب اور جنوب مغرب فتنہ و آشوب کے شعلوں سے بھڑک رہا تھا +

لوگوں کا خیال تھا کہ اگر ان کے خلاف کوئی فوجی کارروائی کی گئی تو انگریزی حکومت ضرور مداخلت کریگی، لیکن بہادر رضا خان نے ملکی اقتدار قایم رکھنے کے لئے اس کی مطلقاً پرواہ نہ کی، بلکہ ۲ نومبر کو اپنی فوج کے نام اُن کی سرزنش کا حکم صادر کیا، آمد و رفت کے تمام ذرائع مسدود کر دئے گئے اور شیخ کے علاقہ پر پیشقدمی کی گئی +

اصل جنگ تو ایک بے معنی بات تھی، اس لئے رضا خان نے اس میں کوئی حصہ نہ لیا، وہ ان دنوں شیراز گیا ہوا تھا،

بختیاریوں نے فوراً ہی اطاعت قبول کرلی، شیخ بھی ایک تار کے ذریعے رضاخان سے طالبِ عفو ہوا، اور آئندہ کے لئے غلام بن کر رہنے کا وعدہ کیا، رضاخان نے اپنی قوت اور برتری ہوئی ہردلعزیزی کا اندازہ کرتے ہوئے تار ہی کے ذریعے اسے معافی دینے سے انکار کردیا، اس کے بعد وہ آبنائے فارس پر آیا، اور بوشہر کے مقام سے پہلوی جہاز پر سوار ہوکر عازم محمرہ ہوا +

۵ر دسمبر کو رضاخان بصیری کے مقام پر خیمہ انداز ہوا، وہاں کے خوفزدہ لوگوں نے اس کے اعزاز میں خوشی منائی اور اس کے دوسرے ہی روز شیخ خزل اور اُس کے لڑکے ایک بختیاری امیر کی معیت میں حاضر خدمت ہوکر ایک غیر مشروط اطاعت کے لئے ملتجی ہوئے +

شیخ محمرہ کی اطاعت تسخیر ایران کا پیش خیمہ تھی، کیونکہ اس کی ہستی ایک سرمایہ دار اور فتنہ جو رامی کی حیثیت سے ایران کے لئے ایک خطرۂ عظیم تھی، اور اس کی شکست رضاخان کے لئے ایک عظیم الشان فتح کی نوید تھی، حکمت مالی کی رو سے بھی یہ کوئی حقیر چیز نہ تھی، کیونکہ امریکن دفاعیات نے اس کے ٹیکس کا اندازہ ایک کروڑ میں لاکھ روپیہ لگایا تھا، چنانچہ اسی وقت اس سے اس کی ادائگی کے لئے عہدنامہ لکھوالیا گیا +

اس کام سے فارغ ہوکر رضاخان بغداد کے رستہ واپس لوٹا، اور راہ میں طوافِ کربلا سے سعادت اندوز ہوا، کہا جاتا ہے کہ جنوری ۱۹۲۵ء میں جب وہ طہران کے اندر قدم زن ہوا، تو نہایت تزک و احتشام سے اُس کا خیر مقدم کیا گیا، لوگوں نے فتح کی خوشی میں مکانات کو سجایا، بازاروں کو آراستہ کیا، اور ایک فاتح اعظم کی حیثیت سے اُس کا شہر میں استقبال کیا گیا، ایرانی شعرا نے اُس کی شان میں عجیب و غریب قصائد لکھے، اور بعضوں نے تو اُسے کیخسرو اور دارا کے رتبہ سے بھی بڑھا دیا +

اس فتح عظیم نے رضاخان کی شہرت میں چار چاند لگادئے وہ عام لوگوں کی نگاہ میں قابلِ پرستش چیز بن گیا +

سنہ ۱۹۲۱ء کے آغاز بہار اور ۱۹۲۵ء کے انجام خزاں کے درمیان ایران کی مرکزی طاقت مستحکم ہوچکی تھی، اس وقت احمد شاہ جیسا موٹا تازہ اور عیش پسند نوجوان اپنی رعایا کے قلوب میں ذرہ بھر بھی وقار پیدا نہیں کرسکتا تھا، جب رضاشاہ آذربائجان کے صوبہ کو فتح کرکے مرکزی حکومت میں شامل کررہا تھا تو یہ فرانس میں داد عشرت دیکر وہاں کی حسین عورتوں کے ساتھ جرائد عالم کے لئے تصاویر کھنچوا رہا تھا، ملک کے بادشاہ کی یہ بے توجہی اور رضاخان کی یہ سرگرمی احمد شاہ کے حق میں سم قاتل ثابت ہوئی +

ایرانیوں کے دلوں پر اس تقابل کا اثر نہایت گہرا ہوا، اگر رضاخان کو اب بھی اپنی ترقی کا کوئی خیال نہ آتا تو لوگوں کی غلغلہ انداز صدائیں اسے چونکانے کے لئے تیار تھیں، شہزادہ ولیعہد جو طہران کے ایک محدود حلقہ میں کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، عام لوگوں کی نظروں میں ایک مجسمۂ بیجان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا تھا، اور اس کے بھائی کو موقع دینا تو ایک خواب تھا، خیال تھا، سودائے خام تھا" رضاخان کی تاجپوشی سے دو سال پہلے یعنی ۱۹۲۴ء کے موسم بہار میں جب احمد شاہ کی معزولی کے متعلق پہلے پہل علانیہ بحث چھڑی تھی تو عوام کی نظر انتخاب ان ہی دونوں پر پڑی تھی، مغربی دماغوں کو بھی یہ انتخاب نہایت آسان معلوم ہوتا تھا، مگر اکثر مذہبی اور سیاسی ایرانیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے یہ مسئلہ معرضِ التوا میں رہ گیا، وہ کہتے تھے کہ شاہ ایران بادشاہ ہونگا بادشاہ ہے، ظل اللہ ہے، خلیفۃ اللہ ہے اس لئے اُسکے احکامات آسانی سے منقل نہیں ہوسکتے، مگر بعض مجتہدوں

اور ان کے مقلدین کے نزدیک احمد شاہ کے خاندان کا خواہ وہ کسی قماش کا تھا، دست بردار ہونا یقینی تھا +

آخر کار ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو ایرانی پارلیمنٹ نے احمد شاہ کو معزول کر کے ملک کی عارضی حکومت رضا خان پہلوی کو تفویض کر دی، اُس روز مجلس کے دروازہ پر لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ ان میں امن قایم کرنا مشکل ہو گیا تھا، ایران کے علما گو اب اتنے مخالف نہیں رہے تھے جتنے کہ ایک سال پہلے تحریک جمہوریت پر تھے، مگر ان کا زبردست مطالبہ یہ تھا کہ اظہار رائے سے احتراز کیا جائے اور اثر و رسوخ کو کام میں نہ لایا جائے، چند ایک زبردست مدبّروں اور سیاست دانوں کو اس کام سے علانیہ روک لیا گیا، بہر حال اُستّی ارکان مجلس نے رائے دی، جن میں صرف پانچ آدمی مخالفت کی جرأت کر سکے اور تیس آدمیوں نے خاموشی اختیار کی +

رضا خان نے شہزادہ ولی عہد اور اُس کے خاندان کو سرحد کی طرف نکال دیا، رائے دہندگان کو مدعو کیا، اور ایک مجلس انتخاب منعقد کی، مجلس نے نہایت غور و تفحص کے بعد ۱۴ دسمبر ۱۹۲۵ء کو رضا خان کی مستقل بادشاہت کا اعلان کر دیا، اس دن سے "پہلوی" خاندان نسلاً بعد نسلاً تخت ایران کا جائز وارث قرار پایا +

ایک روسی اس موقعہ پر یہ کہہ سکتا ہے کہ رضا خان نے ایران کی بادشاہت انگریزوں کی مدد سے حاصل کی ہے، اور وہی اسے اب تک سنبھالا دئے جا رہے ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ چند ایرانی بھی اُن کے ہمنوا ہو جائیں، کیونکہ جس دن سے وہ تخت ایران پر جلوہ افروز ہوا ہے، انگریزوں کا اقتدار ملک میں بہت بڑھ گیا ہے اور دن بدن بڑھتا چلا جاتا ہے، انگریز جو ایران کے کسی دوسرے معاملہ میں اگر کوئی تعلق نہ بھی ہو تو انہیں ان مدارس کے انتظام میں جو اُنہوں نے وہاں جاری کر رکھے ہیں، دلچسپی ہونی ضروری ہے، کیا اس اعانت کے ساتھ کوئی شرائط بھی چسپاں تھیں یا نہیں؟ یہ ایک علیحدہ سوال ہے، اور اگر ہوں بھی تو یہ ظاہر ہے کہ وہ پوری نہیں کی گئیں، کیونکہ حکومت ایران نے ابھی تک عراق پر انگریزوں کا قبضہ تسلیم نہیں کیا، شیخ محمرہ بھی تا حال نظر بند ہے، اور اُسے طہران سے باہر جانے کی اجازت نہیں ملی، انگریزوں کو کوئی خاص رعایات نہیں دی جاتیں، برطانیہ نے سڑکوں اور عمارتوں کے متعلق جو نقشہ جات تجویز کئے تھے، اُن پر بھی کوئی خاص توجہ نہیں کی گئی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ برطانوی قرضہ کی ادائگی کا ابھی تک کوئی بندوبست نہیں کیا گیا، ان تمام باتوں کے باوجود انگریزوں کے پاس ایک چیز "حکمت عملی" ہے، اور یہ اُسی کا اعجاز ہے کہ وہ کامیاب نظر آ رہے ہیں +

رضا خان کی حکومت کے پہلے چار مہینوں نے ایران کی آنکھیں کھول دیں اور بتلا دیا کہ ملک میں کیسا زبردست انقلاب رونما ہوا ہے، رضا خان نے وزیر اعظم کی حیثیت سے فوج کو براہِ راست اپنے زیر فرمان رکھا، باقی تمام وزارتوں کی پوری طرح نگہداشت کی اور مجلس کی کارروائیوں میں نہایت سرگرمی سے حصّہ لیا، جب کبھی قوانین ملکی کے نفاذ طاقت کی نمائش کی ضرورت ہوتی تو وہ اس میں بھی حصّہ لیتا تھا، مگر نہایت خفیہ طور سے جس کا ایران میں کسی کو پتہ بھی نہ لگتا، چنانچہ ۱۹۲۴ء میں جب صیغہ مالیات کو ٹیکسوں کی وصولی کے لئے قوانین وضع کرانے کی اشد ضرورت محسوس ہوئی تو رضا خان نے دن رات کام کر کے یہ تمام قوانین ۴۸ گھنٹوں میں پاس کرا لئے، مگر اس نے تخت نشین ہوتے ہی ملک کے قوانین کے بموجب وزارت عظمیٰ، وزارت جنگ اور فوج کی کمان سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، اس کے علاوہ شہنشاہ ہونے کی حیثیت سے اُس نے چند ہی موقعوں پر اپنے اثر، رسوخ اور قوت کو صرف کیا

سب سے تعجب انگیز بات یہ ہے کہ اُس نے اپنے شاہنشاہانہ حقوق کو پورے طور پر استعمال نہیں کیا، وہ گوشۂ تنہائی میں رہتا ہے، اس لئے اُسے ملکی اور قومی معاملات میں پوری دسترس حاصل نہیں +

اس انقلاب کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ رضا خان ناممکن الحصول ہوکر عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہوگیا، وزیر اعظم کی حیثیت سے وہ طہران کے ہر اُس آدمی کا جو وطن کی کچھ نہ کچھ خدمت کرتا تھا دوست تھا، وہ مشیران ملکی، حکام سلطنت، مدبّران خارجہ اور دیگر عہدہ داران سے خود ملتا تھا، اور اُن سے ہر معاملہ میں آزادانہ مشورہ لیتا تھا، مگر اب وہ بہت کم لوگوں سے ملاقات کرتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اب صرف دو آدمیوں کو اُس کے محل میں داخل ہونے کی عام اجازت ہے۔ ان میں ایک تو اس کا وزیر سلطنت ہے، اور دوسرا برطانوی سفیر، ایران میں شہنشاہ کے بعد دوسری زبردست ہستی ڈاکٹر اے سی سپاغ مشیر مالیات کی خیال کی جاتی ہے، مگر جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا ہے وہ بھی رضا خان کے بادشاہ بننے کے وقت سے لیکر ابتک صرف ایک دفعہ ذاتی طور پر ملاقات کرسکے ہیں +

سالِ گذشتہ میں اعلیٰ حضرت نے ایک اور معاملہ میں بھی بڑی بے پروائی کا اظہار کیا ہے، وہ فوج جو اس کی سرگرم کوشش کی وجہ سے ۱۹۲۳-۲۵ء میں بالکل منظم ہوگئی تھی، اب پھر بے ترتیب ہوگئی ہے، اور تھوڑے عرصہ سے تو وہ اسقدر بگڑ گئی ہے کہ قابو سے باہر ہورہی ہے +

شہنشاہ ہوتے ہی رضا خان نے اپنے آپ کو پہلوی خاندان کی ترتیب اور جشن تاجپوشی کی تیاری میں ہمہ تن مصروف کردیا، اس نے اعلان کیا کہ اُس کا ہشت سالہ لڑکا محمد رضا پہلوی اُس کا جانشین ہوگا، حالانکہ اُس کا پہلا لڑکا اس سے بہت بڑا تھا، مگر اس میں شاہی شوکت اور شاہانہ جاہ و جلال مفقود تھا، شہزادہ ولی عہد کی تعلیم و تربیت کا خاص بندوبست کیا گیا ہے، اُس کا یومیہ پروگرام دیکھنے سے پتہ لگتا ہے کہ اُسے صبح سے لیکر شام تک نہایت سخت کام کرنا پڑتا ہے اس دستور العمل کا تقریباً آدھا حصّہ تو فوجی اور جسمانی ورزش سے متعلق ہے، مگر باقی ماندہ مطالعۂ سیاست، مذہب، تواریخ حساب، سائنس اور زبان دانی کے لئے وقف ہے، زبانوں میں فارسی، عربی، فرانسیسی اور انگریزی خاص طور پر شامل ہیں، توقع کی جاتی ہے کہ وہ بمصداق

"اگر پدر نتواں پسر تمام کند"

ان تمام خامیوں کو جو اعلیٰ حضرت میں پائی جاتی ہیں پوری کردیگا +

شہزادہ ولیعہد کی والدہ کو ایک اور نوجوان خاتون کے ساتھ جو امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور جس سے اعلیٰ حضرت نے پچھلے ہی سال شادی کی، ایران کی ملکہ قرار دیا گیا ہے، شہزادہ ولیعہد کی والدہ گو بڑی ہیں، مگر اعلیٰحضرت کے حکم سے دونوں کا منصب ایک جیسا رکھا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ رضا خان نے پہلی دو بیویوں کو طلاق دیدی تھی، ان میں سے ایک تو اُس کے بادشاہ ہونے سے پیشتر ہی فوت ہوگئی تھی اور دوسری ابتک مازندران میں موجود ہے +

۲۵ اپریل ۱۹۲۶ء کو رضا شاہ کی تاجپوشی نہایت تزک و احتشام سے ادا کی گئی، تمام ایران بلکہ ایشیا نے اسمیں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا، اس تقریب پر محل گلستان میں حکومت کے تمام بیش بہا جواہر، تخت نادر شاہ اور تخت طاؤس کی نمائش کی گئی +

رضا خان کی دلی خواہش تھی کہ اُس کی تاجپوشی اس وزنی تاج سے جو "تاج قاچار" کہلاتا تھا، نہ کی جائے، بلکہ ایک نئے تاج سے ہو، اور وہ تاج پہلوی خاندان کے لئے مخصوص

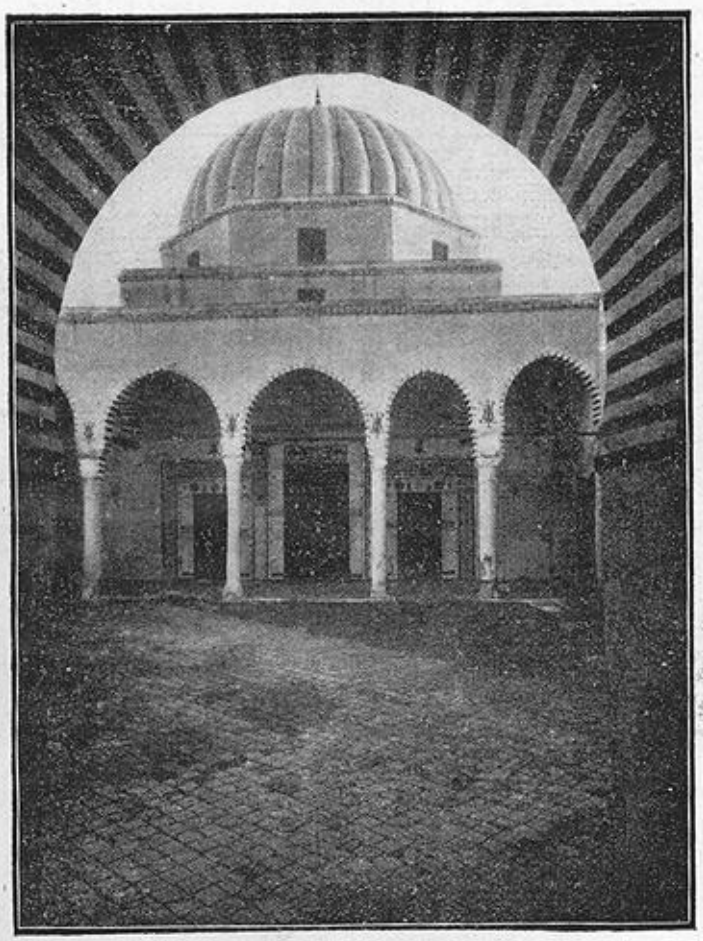

شمالی افریقہ کی ایک مسجد

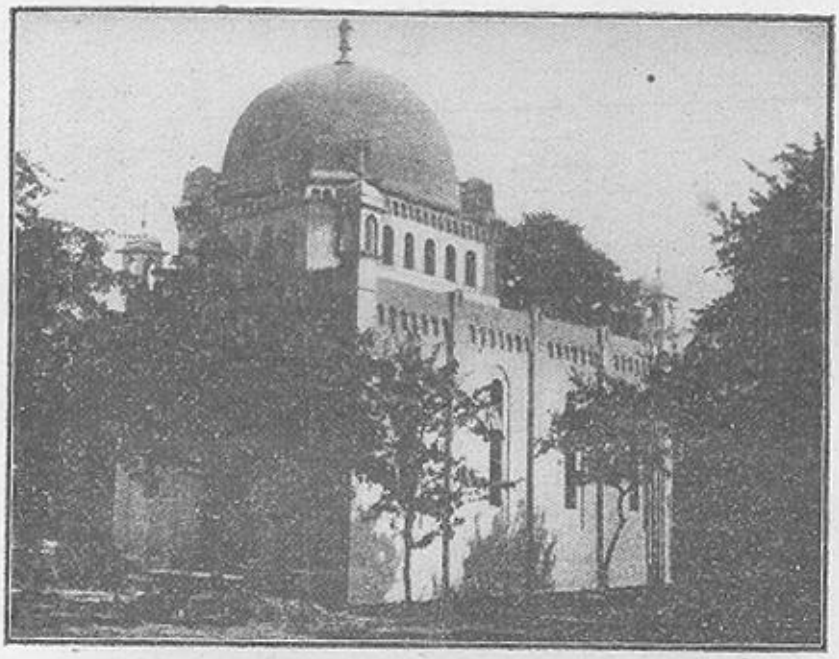

مسجدل انكن

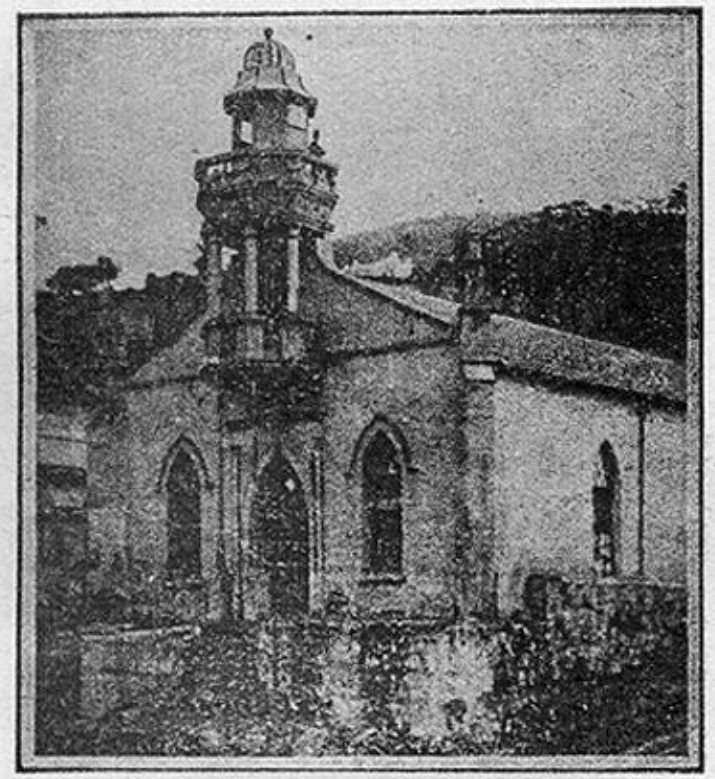

نٹال جنوبی افریقہ کی ایک مسجد

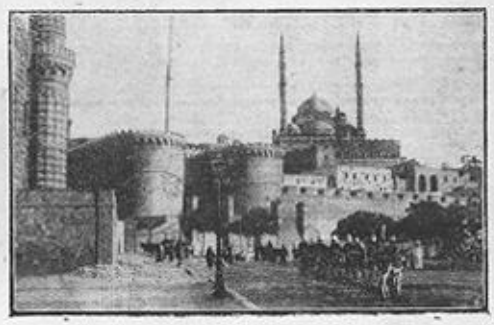

مصر اور قسطنطنیہ کی مساجد

کردیا جائے، چنانچہ معززین اور اکابرین شہر نے چندہ کرکے سونے اور جواہرات سے ایک نیا تاج تیار کرایا، خلعت شاہی ایسی بیش قیمت اور خوبصورت تھی کہ اس کا جواب ناممکن ہے، وہ سفید، سیاہ اور گلابی موتیوں کا ایک مجموعہ تھی جو نہایت قرینے سے چکن کی صورت میں پروئے گئے تھے، تخت پوشی کے لئے نادرشاہ کا تخت تجویز ہوا +

تخت نادری نے جو کئی سالوں سے خزانۂ عامرہ میں بند پڑا تھا اپنی عظمت و شان سے لوگوں کو مبہوت کردیا، یہ وہی تیموری تخت ہے جو نادرشاہ دہلی سے اپنے ساتھ لایا تھا، اس کے بازوؤں پر دنیا بھر کے بہترین زمرد جھالریں لٹک رہی تھیں، ان میں سے ہر ایک زمرد اغلباً دوسو رتی وزنی کا تھا، یہ جھالریں خاص خاص مواقع پر ہی آویزاں کی جاتی ہیں، ورنہ خزانہ میں محفوظ رہتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ تخت نادری کی اکثر تصاویر میں نظر نہیں آتیں +

تخت طاؤس بھی بجائے خود ایک نفیس چیز ہے، مگر وہ سیاحین کے بیان کے بموجب تخت نادری یا اصلی تخت طاؤس کا جس کی یہ نقل ہے اور جو عنقا صفت ہے، کسی حالت میں بھی مقابلہ نہیں کرسکتا، موجودہ تخت طاؤس میں صرف چند جواہرات اور دو چھوٹے چھوٹے مور ہیں، شامیانہ بالکل ہی نہیں، اس کی وضع قطع، تراش خراش اور نقش و نگار دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ دراصل اسی مشہور و معروف اور خوبصورت کنیز کے آرام کرنے کے لئے بنایا گیا تھا جس کا نام طاؤس تھا اور جس پر بادشاہ بے طرح شیدا تھا +

یہ تخت طاؤس درباری کمرہ کے آخر میں رکھا گیا اور اسکے بالمقابل تخت نادری آراستہ کیا گیا، اور اسی پر رضاخان کی تاجپوشی عمل میں آئی +

۲۵ اپریل کو ساڑھے تین بجے بعد دوپہر حکومت کے تمام بڑے بڑے افسر، ایران اور اقصائے ایران کے تمام معزز نمائندے اور مہمان درباری لباس زیب تن کئے گلستان میں جمع ہوئے، شہر کے گلی کوچوں میں اتنا ہجوم تھا کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا +

اس کے ایک گھنٹہ بعد رضاخان کا خورد سال ولیعہد میر لشکر ضایارخان کی معیت میں دربار کے اندر داخل ہوا، یہ امیر رضاخان کا دوست تھا، اور جنگ و جدال کے دنوں میں اس کا معد و معاون رہ چکا تھا، وزیر اعظم کیانی تاج سنبھالے وزیر دربار پہلوی تاج لئے، وزیر جنگ شمشیر جہاں کشائے نادری تھامے، سردار اسد بختیاری موتیوں کا تاج لئے، وزیر اغراض عامہ دریانور ہیرا اُٹھائے اور دیگر امراء و وزراء اسی قسم کی اور نادرہ روزگار اشیاء جلوس کی صورت میں ولیعہد کے پیچھے پیچھے داخل دربار ہوئے +

جب یہ تمام کام درست ہوچکا اور سب لوگ حسب مراتب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو ایرانی فوجی باجا اپنی سامعہ نوازی سے حاضرین کو مبہوت بنانے لگا، اس کے ساتھ ہی رضاخان نہایت کرّوفر سے لباس درباری زیب برادر کلاہ نادری زیب سر کئے کمرہ میں داخل ہوا، اس کے بعد چند امرائے والاتبار اندر آئے، وزیر دربار نے پہلوی تاج شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا جسے رضاخان نے اُٹھا کر سر پر رکھ لیا، اس وقت سلامی اُتاری گئی، اور تمام ممالک محروسہ میں اس عمل کو دُہرایا گیا +

ازاں بعد بادشاہ نے تخت سے ایک مختصر سی تقریر کی، ہدیۂ تہنیت قبول کیا اور پھر اسی جلوس کے ساتھ دربار سے رخصت ہوگیا +

½ ۴ بجے کے قریب اسی لباس اور شاہی تخت پر بیٹھکر رضاخان کا جلوس شہر میں سے گذرا، ساڑھے تین سو گردی

بلوچی، بختیاری، کاشغائی، ترک و عرب نوجوان اس کے آگے آگے تھے، تمام بازار آراستہ و پیراستہ تھے، لوگوں نے نہایت جوش کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا، جابجا قربانیاں ہوئیں، ہر جگہ پر "رضا خان زندہ باد" کی صدائیں بلند کی گئیں، رات کو آتش بازی چھوڑی گئی، غرضکہ ایک ہفتہ تک طہران میں یہی سماں رہا، اس جشن کی عظمت اور کامیابی کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ بولشویکوں کے سفیر نے بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، حالانکہ وہ شہنشاہ پرستی کے بالکل برخلاف تھا، اور حق تو یہ ہے کہ رضا شاہ کی تاجپوشی کو جو رتبہ اور فخر حاصل ہوا ہے وہ ناصرالدین کے بعد کسی اور شہنشاہ کو نصیب نہیں ہوا +

اعلیٰحضرت نے تاجپوشی کے بعد سب سے اوّل کابینۂ وزارت کو تبدیل کیا اور اس کے ساتھ ہی وزیراعظم کو جو اُس کا دوست تھا مستعفی ہونے پر مجبور کیا، یہ واقعہ ۷ جون کا ہے، اس کے بعد ستمبر میں ایک نیا کابینۂ وزارت شہزادہ فیروز کی سرکردگی میں مرتب کر کے متوفی الممالک کو وزیراعظم مقرر کر دیا +

رضا خان میں جہاں چند خامیاں ہیں وہاں بیشمار خوبیاں بھی موجود ہیں، وہ نہایت سرگرم اور پُرجوش کام کرنے والا آدمی ہے، وہ عقل اور تدبّر کے زیور سے آراستہ ہے، وہ دل و جان سے اس بات کا حامی ہے کہ ایران کی حکومت نہایت مستحکم ہو، اس کے ایک وزیر کا بیان ہے کہ قدرت نے اسے ایسا عجیب و غریب دماغ عطا کیا ہے کہ وہ آناً فاناً میں معاملہ کی تہہ تک پہنچ جاتا ہے، اور وہی فیصلہ کرتا ہے جس کی ملک کے اعلیٰ ترین مدبّروں سے اُمید ہوسکتی ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس قدر کامیابی کے باوجود اُسکا دماغ غرور اور رعونت سے بالکل خالی اور معرّا ہے، اور حق تو یہ ہے کہ صدہا سال کے بعد ایران کو ایسا بیدار مغز بادشاہ نصیب ہوا ہے +

محمد عبداللہ قریشی بی اے
لاہور

انگورہ

ترکی کے اس جدید دارالسلطنت کے متعلق سیاحین اور اخبارات کے نامہ نگاروں نے جو مشاہدات لکھے ہیں وہ ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

جے اے سپنڈر لکھتے ہیں:- کہ انگورہ کا اصل نام انکرہ ہے، ارمن عہد حکومت میں یہ ایک شاندار شہر تھا وہاں آجتک آگسٹس کا مندر موجود ہے +

انگورہ میں اس وقت جدید عمارات بن رہی ہیں، جن میں پارلیمنٹ ہاؤس، پیپلز پارٹی (جماعت عوام) کا دفتر اور سرکاری دفاتر، کلب گھر اور روسی سفارت خانہ بہت ہی شاندار ہیں، انگورہ میں اس وقت عام آبادی کے علاوہ چار پانچ ہزار نئے آدمی موجود ہیں، ان میں سے بعض دفاتر کے کلرک ہیں، بعض پارلیمنٹ کے ممبر، بعض افسر وغیرہ، ہر طرف زندگی اور حرکت دکھائی دیتی ہے، ترکی افسر صبح ۹ بجے سے لیکر شام کے ۶ بجے تک محنت کرتے ہیں، ایک دن ترکی پارلیمنٹ کا نظارہ دیکھا، وہاں ترکی کابینہ لین اور سارے تین سو ڈپٹی بیٹھے ہوئے تھے، ایک وزیر تقریر کر رہا تھا جس پر ایوان

کے مختلف حصّوں سے اعتراضات ہوتے تھے، وزیر موصوف اُن سوالات کا جواب نہایت خوش اخلاقی سے دیتے تھے یہ پارلیمنٹ بڑی سرگرمی سے کام کرتی ہے، جس دن مسئلہ موصل پیش ہونے والا تھا، اُس دن شام کے چار بجے سے لیکر رات کے دو بجے تک بحث و مباحثہ ہوتا رہا +

ترکوں میں قومیت کا جذبہ جنون کے حد تک پہنچا ہوا ہے ہر شخص مجبور ہے کہ ترکی زبان میں ہی اظہار خیالات کرے، یہانتک کہ ٹیلیفون پر بھی ترکی زبان ہی میں گفتگو کرنی پڑتی ہے، خواہ ہم آپس میں ہی گفتگو کریں، تمام غیر ملکی دکانوں پر بھی ترکی زبان میں ہی سائن بورڈ لگانے کا حکم ہے +

ترکی ٹوپی کی منسوخی کے بعد سے ترکوں نے عام طور پر کپڑوں کی ٹوپیاں پہن لی ہیں جو یورپین وضع کی ہیں +

مصر کے اخبار الاہرام سے ایک اخبار نے ذیل کا اقتباس شایع کیا ہے :-

"اب کی مرتبہ میں نے انگورہ کو دیکھا تو سال گذشتہ سے اس کو بہت وسیع اور شاندار پایا، آج انگورہ دو شہروں کا نام ہے، ان میں سے ایک قدیم انگورہ ہے جو پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اور بلندی پر ایک مضبوط قلعہ ہے، اور دوسرا جدید انگورہ ہے جو قریب کی وادیوں میں پھیلا ہوا ہے

ٹرکی کے ارکان حکومت کی رائے پہلے یہ تھی کہ قدیم انگورہ میں اصلاحات کر کے اس کو دار السلطنت کے مناسب بنالیا جائے یعنی اُس کی سڑکوں کو وسیع اور کشادہ کیا جائے اور قدیم مکانات کی جگہ جدید منازل تیار کی جائیں، اور اُن محلّوں کو جو آتشزدگی سے تباہ ہوگئے ہیں، باغات کی صورت میں منتقل کردیا جائے، چنانچہ اس رائے کی بنا پر قدیم انگورہ میں وزارت علمی اور وزارت زراعت کی عمارتیں تعمیر کی گئیں اور چند مدارس بھی بنائے گئے، لیکن پھر یہ رائے تبدیل ہوگئی، اور دانشمند ارکانِ حکومت نے غور وخوض کے بعد قرار دیا کہ چونکہ قدیم انگورہ کو دار السلطنت کی شان میں منتقل کرنا نہ صرف مشکل کام ہے بلکہ زمانہ دراز کی محنتوں اور کثیر مصارف کو چاہتا ہے، اسلئے ایک نیا شہر تعمیر کیا جائے اور اس کو دار السلطنت کی شان بخشی جائے، چنانچہ اس تجویز کی بنا پر ایک اسکیم بنائی گئی اور ۱۹۲۴ء میں اس کو مجلس وطنی کے سامنے پیش کیا گیا، جو عام رائے کی تائید سے منظور ہوگئی +

جدید انگورہ ایک وسیع علاقہ میں تیار کیا گیا ہے، جس میں ہر طرف جدید قسم کی عمارتیں ہیں اور جگہ باغات تیار کرنے کے لئے کشادہ قطعات چھوڑے گئے ہیں، اور بڑی بڑی کشادہ سڑکیں تیار کی جانے والی ہیں، جدید شہر کی بعض عمارتیں بالکل تیار ہوگئی ہیں، خصوصاً وہ عمارتیں جو انگورہ سے اسٹیشن جانے والی سڑک پر بنائی گئی ہیں، یہ سڑک جدید انگورہ سے مجلس وطنی کی عمارت کے قریب سے ہوتی ہوئی لا، کالج، اخبار حاکیت ملّیہ کے دفتر اور بعض دوسری مشہور عمارتوں کے راستے سے گذر رہی ہے، ایک بڑا ہوٹل بھی جس میں ۵۰ کمرے ہیں، اس سڑک پر تعمیر کیا گیا ہے، جس کا افتتاح عید جمہوریہ کے دن ہوا تھا، اس ہوٹل کے قریب ہی گذشتہ موسم بہار میں ایک بڑے وطنی عجائب خانہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے، سنگ بنیاد کا یہ جلسہ اسقدر زبردست اور شاندار تھا کہ آجتک ٹرکی میں اتنا بڑا اور شاندار جلسہ نہیں ہوا، اس جلسہ میں غازی مصطفیٰ کمال پاشا اور جمہوریہ ترکیہ کے تمام ارکان شریک تھے، کہا جاتا ہے کہ عنقریب جدید انگورہ اور اسٹیشن کے درمیان میدان جمہوریہ وغیرہ کے قریب ایک شاندار پارک بنایا جائیگا، جس سے اُن مدارس کے طلبا بہت فائدہ اُٹھائیں گے جو اس کے اطراف میں واقع ہیں +

قدیم انگورہ سے دو کیلومیٹر کے فاصلہ پر ایک بڑا محلہ آجکل

آباد کیا جا رہا ہے، جس کے مکانات کرایہ پر اُٹھائے جائینگے اس محلہ میں چار سو مکانات اس وقت تیار ہیں، اور سکونت کے قابل +

جدید انگورہ کی آبادی اور مکانات کی ساخت کو دیکھکر کہا جاسکتا ہے کہ وہ شہر پوٹسڈام سے بہت مشابہ ہے۔

بہر نوع جدید انگورہ تمام اعتبارات اور حیثیتوں سے ایک مغربی شہر ہے اور قدیم انگورہ کے قریب ہی واقع ہے، جدید انگورہ میں آجکل صرف وہ لوگ نظر آتے ہیں جو عمارتوں کی تعمیر میں مصروف ہیں، ہر طرف معمار اور مزدور ہی مزدور دکھائی دیتے ہیں اور زیادہ سامان جس سے عمارتیں تعمیر کی جارہی ہیں +

جدید انگورہ کی تعمیر میں جو مشکلات ترکوں کو پیش آئی ہیں وہ اسقدر اہم ہیں کہ اُنہوں نے اُن کے ارادوں میں غیر معمولی مزاحمت کی ہے، عمارتی سامان چونکہ انگورہ میں نہیں ملتا۔ اس لئے ان کو ذرا ذرا سی چیز باہر منگوانی پڑتی ہے، بعض چیزیں ان کو آستانہ سے ملتی ہیں، اور بعض اس سے بھی زیادہ مسافت کے شہروں سے، غرض لوہے، پتھر، اینٹ چونہ، کوئلہ اور رنگ کے مصالحے سب ان کو باہر سے منگوانے پڑتے ہیں +

ان تمام باتوں میں سب سے زیادہ قابلِ مسرت یہ بات ہے کہ تعمیرات کے کام میں کسی غیر ملکی کا ہاتھ نہیں ہے، بلکہ تمام کام خود ترک کر رہے ہیں، اور بہترین اصول پر ہر ایک کام کو انجام پر پہنچاتے ہیں، حالانکہ آستانہ کی تمام عمارات یہودیوں، ارمنوں اور یونانیوں نے تعمیر کی ہیں، اس امر واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ترکی قوم میں بیداری کی روح ترقی کر رہی ہے اور جدوجہد کی تحریک میں برابر اضافہ ہو رہا ہے +

اگر آج کوئی انگورہ کو جاکر دیکھے تو وہ حیرت میں رہ جائے

ان دو سال میں ترکوں نے صرف اپنی طاقت اور صرف اپنے ہاتھوں سے اتنے شاندار کام کئے ہیں، جن کی اُنسے کبھی اُمید نہیں کی جاسکتی تھی، اس وقت انگورہ یورپ کا ایک ترقی یافتہ شہر معلوم ہوتا ہے، جگہ جگہ تجارتی گودام ہیں اور شاندار منازل و قصور، اسی کا نام جدید انگورہ ہے، اور ہر ایک اعتبار سے وہ یورپ کا ہمسر ہے +

ایک انگریز خاتون کے خیالات

حال ہی میں ایک انگریز خاتون نے جدید انگورہ کا سفر کیا ہے وہ مانچسٹر گارڈین میں لکھتی ہیں:-

انقرہ ابھی چھوٹی سی بستی ہے، مگر عمارتیں ہر طرف بن رہی ہیں، اور سڑکیں پختہ کی جا رہی ہیں +

شہر کے ہر حصہ میں بس گاڑیاں چلتی ہیں یہ بس گاڑیاں فرانس اور انگلستان کی بنی ہوئی ہیں، ٹریموے سے زیادہ بس کمپنی کو فائدہ ہو رہا ہے +

دوسرے روز ہم لوگ بس میں بیٹھ کر توہان کاشہ گئے، یہ انقرہ کے مکانات میں ہے، اور یہاں غازی مصطفیٰ کمال پاشا رہتے ہیں، ہم راستہ میں جدید انقرہ سے گذرے، یہ علاقہ باغات میں چھپا ہوا ہے، جدید طرح کے مکانات بن گئے ہیں اور ہر مکان کے ساتھ ایک باغ بھی ہے، مکان جرمن قطع کے ہیں، ہم بورڈ تعلیم کے دفتر میں گئے، جہاں ایک ترکی لیڈی ڈاکٹر شعبہ حفظانِ صحت میں اعلیٰ عہدہ پر ممتاز ہے، وہ خاتون امریکن کالج استنبول کی گریجوایٹ ہے، اور جرمنی سے ڈاکٹری کی ڈگری لی ہے، اور ایک سال پیرس میں بھی تعلیم حاصل کی ہے، اس کا بیان ہے کہ اس عہدہ کی تقرری پر مجھے خوشی ہوئی کہ اس طرح انقرہ میں رہنے کا موقع ملیگا +

یوم جمہوریہ کو ہم تیاریاں دیکھنے چلے، آج ہر طرف شہر میں ایک جوش تھا، ہر عمارت پر جھنڈے آویزاں تھے،

سڑکوں پر شاندار محرابیں بنائی گئی تھیں، دُکانوں پر محبّان وطن کی تصویریں آویزاں تھیں، ہم سویرے لنچ کھاکر جلوس کا تماشا دیکھنے گئے، جس وقت ہم پہنچے نشست گاہوں پر بہت سی عورتیں پہنچ چکی تھیں، مگر ہمیں صدر کی نشست گاہ کے پیچھے نہایت عمدہ جگہ مل گئی، تین بجے کے قریب غازی مصطفیٰ کمال پاشا اپنے مکان سے برآمد ہوئے، بینڈ نے سلامی کا ترانہ بجایا، اور صدر نے فوج کے معائنہ کا قصد کیا، اس وقت جلوس میں نمایندگان دول اور ممبران مجلس تھے، بائیں طرف وزرا تھے، افسران فوج و افسران بحر تھے، غازی پاشا کے چہرہ سے متانت برس رہی تھی جسے ہم سب نے بہت پسند کیا، پورے دو گھنٹے تک افواج کا معائنہ رہا، فوجیں بوائے اسکاؤٹ، اسکول کے بچے سب قرینے سے سلامی دیتے ہوئے گذر گئے، اور صدر ہر ایک کو غور سے ملاحظہ کرتا رہا، اور کبھی کبھی اپنے اڈیکانگ سے کچھ نہ کچھ کہتے بھی جاتے تھے، ہماری نگاہیں صدر کے چہرہ پر جمی رہیں چہرہ سے جوش کا مطلق اظہار نہ تھا، صرف ایک دوبار مُسکرائے تھے، مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر بات کو بغور ملاحظہ کر رہے ہیں، کسی سپاہی کا قدم بگڑا اور اُنھوں نے دیکھ لیا، کوئی لڑکوں کی جماعت ذرا ٹیڑھی ترچھی ہوئی اور اُنھوں نے افسر بھیجکر اُنہیں درست کرادیا +

اتوار کے دن ہم لڑکوں اور لڑکیوں کے ابتدائی مدارس میں گئے۔ دو مدرسہ میں چار سو لڑکیوں کی گنجایش ہے۔ ہر درجہ میں لڑکے زیادہ ہیں، شہر میں ۵۰۶۲ تعلیمی عمر کے بچے ہیں جن میں سے تین ہزار تعلیم پا رہے ہیں، عنقریب بارہ جدید عمارتیں تیار ہوجائینگی، ایک درجہ میں ادب کی تعلیم ہو رہی تھی، دوسرے میں الجبرا کی اور مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ بہت سی لڑکیاں معماری کی تعلیم حاصل کرنے والی ہیں +

ترکی مجلس

دوشنبہ کی سہ پہر کو ہم پارلیمنٹ ہاؤس گئے، تاکہ افتتاح کی کارروائی دیکھیں، مصطفےٰ کمال پاشا نے نہایت صاف اور بلند الفاظ میں سال گذشتہ پر تبصرہ کرکے سالِ نو کے متعلق پالیسی کا اعلان کیا، اس مدبرانہ تقریر کے وقت ان کے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹی سی سیاہ نوٹ بک تھی جس وقت اُنھوں نے اس کا ذکر کیا کہ گذشتہ دوبار اُن کی جان لینے کی کوشش کی گئی تو لوگ تھرا اُٹھے، مگر خود اُن پر کوئی اثر نہ تھا مجھ پر اس کی روانی کا بہت اثر ہوا اور میں نے اب شخص کے متعلق خوبی رائے قائم کرلی جو جدید ترکی کا بانی ہے +

مسولینی

مسولینی کا اصل نام سنبیٹو ہے، یہ ۱۸۸۳ء میں اٹلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک اَن پڑھ لوہار کے ہاں پیدا ہوا تھا، سنبیٹو کو مقامی مدرسہ میں بارہ سال کی عمر تک تعلیم دی گئی، لیکن اس کے بعد بوجہ تنگدستی والدین اُس کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام نہ کر سکے، چونکہ اُس کی تعلیم ادھوری تھی اس لئے اُسے اچھی ملازمت بھی نہ مل سکی، اور بڑی محنت اور جستجو کے بعد اُسے بیس تیس روپے کی ایک مدرسی ملی، مسولینی اس ملازمت پر قانع نہیں تھا، چنانچہ اُس نے قسمت آزمائی کی غرض سے سوئٹزرلینڈ کا سفر کیا، جہاں آوارہ گردی میں اُسے قید کی سزا بھی بھگتنی پڑی، یہاں سے نجات حاصل کی تو ایک شراب فروش کے ہاں شراب پلانے پر ملازم ہوا، اوقات فرصت میں وہ سوئٹزرلینڈ کے اخبارات میں مضامین بھی لکھا کرتا تھا جن میں وہ حکومت کے افعال پر سختی سے نکتہ چینی کرتا، ان سیاسی مضامین کا نتیجہ تھا کہ وہ حکومت کے خلاف سازشیوں میں شریک ہو کر گرفتار ہوا، اور سوئٹزرلینڈ کے انقلاب پسندوں میں شہرت حاصل کر لی، حکومت سوئٹزرلینڈ نے اُسے اپنے ملک سے نکال باہر کیا، چنانچہ مسولینی اب آسٹریا چلا گیا، مضامین لکھنے اور سزا پانے کے بعد اب اُسکے لئے حصول معاش کے ذرائع وسیع تھے، اب وہ اپنے آپکو بطور ایک قوم پرست اخبار نویس کے پیش کر سکتا تھا، چنانچہ وہ آسٹریا کے ایک اخبار میں آسانی سے ملازم ہو گیا، اسی اخبار میں اُس نے آسٹریا کے خلاف ایک مضمون لکھا جسکی پاداش میں اُسے جلاوطنی نصیب ہوئی، اب اُسے وطن میں بھی جگہ مل گئی اور اٹلی کے ایک اخبار اونتی کا ایڈیٹر مقرر ہوا، یہ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے +

۱۹۱۴ء میں اُس نے اپنا ذاتی اخبار شایع کیا جس میں وہ جنگ کی حمایت میں مضامین لکھتا تھا، اور چاہتا تھا کہ اٹلی جنگ یورپ میں شریک ہو کر آسٹریا پر حملہ کر دے، تاکہ اپنے اُن صوبہ جات کو واپس لے جو اُس کے قبضہ میں ہیں، اُن دنوں یورپ میں "جنگ کا بخار" پھیلا ہوا تھا، اٹلی میں اُس کا اخبار بہت ہر دلعزیز ہوا، اور جب جنگ چھڑ گئی اور اٹلی نے بھی اعلان جنگ کر دیا تو مسولینی ایک لیڈر تسلیم کر لیا گیا، چنانچہ جنگ کے دوران میں وہ ایک افسر اور لیڈر کی حیثیت سے محاذ جنگ پر پہنچا، اور یہاں فوج اور افسروں کو اپنے قابو میں لاتا رہا، اٹلی کی پے در پے شکستوں سے وہ بد دل نہیں ہوا، اور برابر اپنے کام میں مشغول رہا، فتح کے آخری ایام میں اُس نے دیکھا کہ ملک میں بولشویکی تحریک سرعت سے پھیل رہی ہے، تو اُس نے اس کی روک تھام کی غرض سے فسطی تحریک شروع کر دی، چونکہ ملک کسی انقلاب پر آمادہ تھا، اس لئے لوگ جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگے، اور کثیر جمعیت کے ساتھ اُس نے ایوان حکومت پر قبضہ کر لیا، اب بادشاہ ملک میں برائے نام موجود ہے، حقیقی قوت مسولینی کو حاصل ہے، اٹلی میں ایک جماعت مسولینی کے خلاف بھی موجود ہے، جو تین دفعہ اُس کی جان پر حملہ کر چکے ہیں، مگر اتفاق سے وہ ہر دفعہ بچ جاتا رہا ہے +

مسولینی کی پالیسی اٹلی کو قابو میں رکھنا اور انگلستان کی امداد سے اپنی قلمرو کو وسعت دینا ہے، دول یورپ میں اس وقت اٹلی کے دوستانہ تعلقات صرف انگلستان سے ہیں، لیکن

لیکن انگلستان کی عام پبلک اور اخبارات مسولینی کی فرعونیت سے نالاں اور اُسے تہذیب جدید کے لئے ایک خطرہ سمجھکر اس کے خلاف ہیں، اور کچھ عجب نہیں کہ وزارت کی تبدیلی کے بعد انگلستان اور اٹلی کے تعلقات میں کچھ تغیر پیدا ہو، انگلستان کے علاوہ اٹلی یونان اور رومانیہ سے بھی یارانہ گانٹھ رہا ہے البانیہ پر اُس کے دانت ہیں، اور حال ہی میں اُسنے البانیہ سے ایک ایسا معاہدہ کیا ہے جس کی رو سے اُسے البانیہ میں نیم حقوق حاصل ہو گئے ہیں +

مسولینی چاہتا ہے کہ شام کی حکمداری اُس کو تفویض ہو اور اس کے لئے وہ سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہے، شام اٹلی کے لئے ایک نہایت قیمتی لقمہ ہے، اور وہ چاہتا ہے کہ شام پر قبضہ کر کے ضرورت کے وقت ترکی پر دو طرف سے حملہ کر سکے، اور اٹلی کی ان دھمکیوں کا ترکی سیاسیات خارجہ پر بہت اثر پڑ رہا ہے، اگر کبھی ان دو حکومتوں میں جنگ چھڑ گئی تو یہ دنیا کی خوفناک جنگوں میں سے ہو گی، ترک اٹلی کا سر کچلنے کے لئے ہر ممکن تیاری میں مشغول ہیں، لیکن اُنہیں جنگ سے زیادہ امن میں فائدہ ہے، اس لئے وہ جہانتک ہو سکیگا، جنگ سے پہلوتہی کرینگے، ترک سیاست داں دن رات سیاسی چالوں کے ذریعہ سے اٹلی پر ڈالتے رہتے ہیں، اور جنگ کو ناممکن بنانے میں مساعی رہتے ہیں، اور اس حکمت عملی میں وہ ابتک کامیاب ہیں +

حال ہی میں مسولینی نے اپنی بیٹی کی شادی ولیعہد اٹلی کے ساتھ کر دی ہے، اور اس طرح سے وہ شاہی خاندان سے قرابت دار بن گیا ہے، مسولینی نے جس دن فسطی تحریک شروع کی تھی، اُسی دن اُس نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا تھا کہ ایک شخص کے دل میں دو چیزیں ایک ہی وقت جگہ نہیں لے سکتیں، قوم کی محبت کے ساتھ بیوی کی محبت جمع نہیں ہو سکتی اتنے بڑے کام کے لئے یکسوئی اور کامل یکسوئی کی ضرورت ہے اتفاق کی بات ہے کہ لینن نے بھی اپنی بیوی کو علیحدہ کر دیا تھا اور اسی طرح مصطفےٰ کمال پاشا نے بھی اپنی بیوی کو علیحدہ کر دیا اور ابتک وہ تجرد کی زندگی بسر کر رہے ہیں، دنیا کے ان تین بڑے لیڈروں میں اگر کوئی اشتراک عمل پایا جاتا ہے تو وہ محض تجرد ہے + ایڈیٹر

ترکستان

وسط ایشیا کے حالات ہمیشہ پردۂ اخفا میں رہے ہیں، اگر کبھی کوئی معلومات حاصل بھی ہوئی ہیں تو مغربی سیاحین اور اخبارات کے نامہ نگاروں کے مراسلات سے، حال ہی میں مانچسٹر گارڈین نے اپنے ایک نامہ نگار کا مراسلہ شایع کیا ہے جس میں ترکستان کے تازہ ترین حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے یہ نامہ نگار اول ۱۹۲۳ء میں ترکستان میں سے گذرا تھا، دوسری بار ۱۹۲۶ء میں دوبارہ ترکستان کا سفر کیا، اس لئے وہ اُن اہم تبدیلیوں پر کماحقہ روشنی ڈال سکتا ہے جو ان تین سالوں میں وہاں ظہور پذیر ہوئی ہیں، وہ لکھتا ہے کہ تین سال قبل ترکستان کے حالات بہت یاس انگیز تھے، مگر اب ملک کی قابل تعریف اقتصادی حالت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، یہانتک کہ جمہوریتہائے سوویت کا کوئی دوسرا حصۂ ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اب ترکستان صحیح جغرافیائی حیثیت سے ترکستان ہے، کیونکہ یہ پرانی سلطنت ازبق، کرغزی، اور تاجیک

کی جمہوری ریاستوں میں بٹ گئی ہے، بخارا، خیوا، ٹرنکسٹین اور ترکمانی حکومتوں کی جگہ بھی جمہوری حکومتیں قایم ہو گئی ہیں، ابتدا ہی سے بالشویک حکومت نے مسلمانوں سے تعلقات پیدا کرنا اپنا اصول مقرر کر لیا تھا، اور اسی اصول پر کاربند ہونے کا نتیجہ تھا کہ اُس نے ترکستان کی گرہ در گرہ پیچیدگیوں کو سلجھا لیا، بخارا کی فتح کے بعد امیر بخارا (جو اب کابل میں مقیم ہیں) کی شخصی حکومت کا خاتمہ ہو گیا، اگرچہ باسمچی اب بھی کبھی کبھی قدامت پسند مُلّاؤں کی اعانت پر شیر ہو کر فتنہ و فساد برپا کرتا ہے، لیکن اب اس کا زور بہت کم ہو چکا ہے +

ترکستان بالشویک اصولوں کی اشاعت کا زبردست مرکز ہے، اوّل تو اس شورش انگیز سرزمین پر امن و امان کا دور دورہ مشرقیوں پر بہت اچھا اثر ڈال رہا ہے، دوئم نئی جمہوری سلطنتوں کا قیام شمالی افغانستان کے ازبق ترکمان اور تاجیک باشندوں کو اشتراکیت کی طرف مائل کر رہا ہے، وہ بحیثیت نسل کے افغانوں سے بالکل جدا ہیں ۱۹۲۵ء کے آخر میں ترکستان میں عارضی طور پر روسی حکومت کا قیام اسی مستقل اور موثر پروپیگنڈا کا نتیجہ تھا، اب روسی اور دیسی باشندوں میں کوئی نشانِ امتیاز نہیں، حکومت کی نظر میں سب برابر ہیں، پہلے زمانہ میں کسی دیسی کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ قہوہ خانوں میں بھی کسی روسی کے برابر بیٹھ سکے، لیکن اب انہیں روسی حجام اور روسی گاڑی بان اور خادم تک مل سکتے ہیں +

اصلاح ذرائع آبپاشی اور توسیع ریلوے سے روسی حکومت نے ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں قابل قدر مساعی کی ہیں، اس طرح عام زراعت میں عموماً اور روئی کی کاشت میں خصوصاً بہت ترقی ہوئی ہے +

کسانوں اور مزدوروں کی بہت مدد کی گئی ہے، قابلِ زراعت اراضی کو حکومت نے بلا معاوضہ آباد کیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ عام طور پر ملک نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور یہ وسط ایشیا میں بالشویکوں کے پروپیگنڈا کا زبردست مرکز ہے، جوں جوں اس کی حالت بہتر ہوتی جائے گی، لوگ اشتراکیت کی طرف راغب ہوتے جائیں گے +

مشورہ کی قیمت

کوئین وکٹوریہ کی خدمت میں کرسمس کے موقعہ پر اُن کی ایک پوتی نے چٹھی لکھی، جس میں اپنی جیب خرچ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے دادی اماں سے کرسمس کا تحفہ نقدی کی شکل میں طلب کیا تھا +

ملکہ معظمہ نے اُسے ایک نصیحت بھرا خط لکھا، جس میں کفایت شعاری کی تلقین کی گئی تھی +

اس خط کا جو جواب پوتی نے لکھا وہ قابلِ ملاحظہ ہے :-

"واجب التعظیم دادی اماں! آپ کے بزرگانہ نصائح کا شکریہ، میں نے آپ کے خط کو پانچ پونڈ میں فروخت کر لیا ہے" +

(ترجمہ)

عمر خیام اور سنیما

از بزم جہاں خوشتر از حور و جناں خوشتر
یک ہمدم فرزانہ وز بادہ دو پیمانہ

(اقبال)

انگوره

ہمارے شاعروں کی نفسیات

از جناب مولانا وحید الدین صاحب رکن اردو یونیورسٹی حیدرآباد دکن

شعر کہنے کے وقت اردو زبان کے شاعر کی نفسیات کیا ہوتی ہے، اس پر توجہ کرنے سے پہلے یہ امر واضح ہونا چاہئے کہ یورپ کی شاعری کا اقتضا اور ہے اور ہماری شاعری کا اقتضا اور، یورپ میں شاعر کے نزدیک خیال قافیہ پر مقدم ہے، برخلاف اس کے ہمارے ہاں قافیہ خیال پر مقدم ہے، اس اختلاف کے سبب یورپ کے شاعر اور ہمارے شاعر کی نفسیات میں بڑا اختلاف ہوگیا ہے، یورپ کی قدیم زبانیں یونانی اور لاطینی بہت وسیع تھیں اور ان میں قافیے کے الفاظ کثرت سے مل سکتے تھے، تاہم انہوں نے ادائے خیال میں رکاوٹ پیدا ہونے کے لحاظ سے نظم عاری کو رواج دیا تھا، یورپ کی موجودہ زبانوں میں جرمنی، فرنچ، اور انگریزی بھی وسیع ہیں، اور ان میں بھی قافیے کے الفاظ بہت موجود ہیں، تاہم وہ بھی نظم عاری لکھ جاتے ہیں، لمبی نظمیں اکثر اسی رنگ میں ہیں، وسیع زبانوں میں قافیے کے الفاظ بکثرت ملنے سے خیال کے ادا کرنے میں بہت کم دشواری پیش آسکتی ہے، تاہم مسلسل اور طویل خیالات میں ایک گونہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اس بنا پر باکمال شعرا نے ادائے خیال کو مقدم سمجھ کر ضرورت کے وقت اس رکاوٹ کو دور کردیا ہے۔ عربی زبان میں بھی الفاظ کی کثرت ہے، اور قافیے کثرت سے ملتے ہیں، یہاں تک کہ لغت نویسوں نے لغت کی ترتیب میں جہاں ابتدائی ضرورت کا خیال رکھا ہے، وہاں آخری حرف کا بھی لحاظ کیا ہے اور دنیا کی تمام ڈکشنریوں کے برخلاف عربی کی ڈکشنریوں میں آخر کار حرف باب بنایا گیا ہے اور ابتدائی حرف بطور فصل کے رکھا گیا ہے، عربی کی لغت کو ایک نظر دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس زبان میں شاعری کرنا کسقدر آسان ہے، جو قافیہ آپ اختیار کریں، اس کے ہم وزن الفاظ آپ کو آسانی سے بہت سے مل جائینگے، ایام جاہلیت کی شاعری عام طور سے قصاید کی شکل میں ہے، ہر قصیدہ میں ایک قافیہ اول سے آخر تک ہے، اور ادائے خیال میں جو روانی ان شعرا کے کلام میں ہے، اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکلتا ہے کہ ہر خیال کے ادا کرنے کے وقت مناسب قافیہ شاعر کے ذہن میں آسانی سے آجاتا ہے،

فارسی زبان میں الفاظ اس کثرت سے نہیں کہ مناسب قافیے آسانی سے ہر خیال کے ادا کرنے کے وقت مل جائیں یہ زبان بذات خود وسیع نہیں ہے، جب سے عربی زبان نے اس زبان پر اپنا اثر ڈالا ہے، اس میں الفاظ کی تعداد بڑھ گئی ہے، تاہم جس کثرت سے عربی زبان میں ہم وزن الفاظ مل جاتے ہیں، اس کثرت سے اس زبان میں نہیں ملتے، یہی وجہ ہے کہ جس طرح اہل یورپ نے لمبی داستانوں کے لئے نظم عاری کا طریقہ اختیار کیا ہے، اہل ایران نے ایسی داستانوں کو مثنوی کی شکل میں ادا کیا ہے، مثنوی میں ہر شعر کے لئے صرف دو قافیے تلاش کرنے پڑتے ہیں، جو اکثر آسانی سے مل جاتے ہیں، ہندوستان کی قدیم شاعری میں بھی لمبی داستانوں کے لئے یہی شکل اختیار کی گئی ہے، قصیدہ کی شکل میں ایسے طویل واقعات ادا نہیں ہوسکتے،

کیونکہ اس کی بنیاد ایک قافیہ پر ہوتی ہے، اور اگرچہ عربی زبان میں ہموزن الفاظ کثرت سے مل جاتے ہیں، تاہم یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایک قافیے پر ساری داستان کی بنیاد رکھی جائے، یہی سبب ہے کہ عربی زبان میں لمبی منظوم داستانیں نہیں ملتیں، مثنوی کی شکل ایرانیوں نے اختیار کی ہے، عربی میں اہل زبان نے مثنویاں نہیں لکھیں، اگر عربی زبان میں مثنوی کی شکل اختیار کی جاتی، یا نظم عاری کا طریقہ چل پڑتا، تو پھر اس زبان میں بھی الیڈ اور شاہنامہ جیسی طویل منظوم داستانیں مل سکتی تھیں، عرب کی عشقیہ شاعری بھی قصیدہ کی شکل میں ہے، اگر ایرانی بھی اس قسم کی شاعری قصیدہ کی شکل میں کرتے اور تمام نظم کی بنیاد ایک قافیہ پر رکھتے تو کام چل سکتا تھا، مگر افسوس ہے کہ انہوں نے قافیہ کے ساتھ ردیف کا دُم چھلا لگا دیا، چونکہ غزلیں اکثر گانے کے کام میں آتی ہیں، اس بنا پر ایرانیوں نے خیال کیا کہ قافیہ کے ساتھ ردیف کا التزام نظم میں زیادہ موسیقیت پیدا کرے گا اور ردیف اور قافیہ ہر شہر میں اگر سننے والوں کے کانوں میں زیادہ متوازن معلوم ہونگے، یہ لے یہانتک بڑھی کہ بغیر ردیف کی غزلیں پسند نہیں آتی تھیں، اگر فارسی زبان کے دیوان اُٹھا کر دیکھو، تو ایسی غزلیں بہت کم ملینگی جن میں قافیہ ہی قافیہ ہو اور ردیف نہ ہو، یہی باعث ہے کہ عاشقانہ خیالات کا مسلسل طور سے بیان کرنا غزل کی شکل میں مشکل ہوگیا، قافیہ اور ردیف خیال پر مقدم ہوگئے، ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر کے مضمون سے جداگانہ ہونے لگا: یعنی ایک شعر کو دوسرے شعر سے کوئی تعلق نہیں رہا، اگر ایک شعر میں محبوب کی جدائی کی شکایت ہے، تو دوسرے شعر میں وصال حاصل ہونے پر خوشی کا اظہار ہے، اگر ایک شعر میں دنیا کی مذمت بیان کی گئی ہے تو دوسرے شعر میں اُس کی تعریف ہے، نظم کی یہ ایسی عجیب شکل ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال نہیں ملیگی، اس سے تمام شعرا مجبور ہوگئے کہ مسلسل غزلیں نہ لکھیں فارسی شعرا کے دیوانوں میں مسلسل غزلیں اسقدر کم ملتی ہیں کہ انکا عدم وجود برابر ہے، ایران کی شاعری اسی حالت میں تھی کہ وہ ہندوستان میں پہنچی، اوّل یہاں کے شعرا نے خود فارسی زبان میں اسی طریقہ کی غزلیں لکھنی شروع کیں، پھر جب اُردو میں شاعری کا آغاز ہوا تو اسی طریقہ کی نقل اس زبان میں بھی کی گئی، اب تک غزل کا یہی طریقہ ہمارے ملک میں جاری ہے، اسی طریقہ کے سبب ہمارے شعرا جب غزل لکھنے بیٹھتے ہیں، تو پہلے اس غزل کے لئے بہت سے قافیے جمع کرکے ایک جگہ لکھ لیتے ہیں، پھر ایک قافیہ کو پکڑ کر اُس پر شعر تیار کرنا چاہتے ہیں، یہ قافیہ جس خیال کے ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے، اُسی خیال کو ادا کر دیتے ہیں، پھر دوسرے قافیہ کو لیتے ہیں، یہ دوسرا قافیہ بھی جس خیال کے ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے، اُسی خیال کو ظاہر کرتے ہیں، گو کہ یہ خیال پہلے خیال کے برخلاف ہو، اگر ہماری غزل کے مضامین کا ترجمہ دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان میں کیا جائے جس میں غیر مسلسل نظم کا پتہ نہیں ہے، تو اس زبان کے بولنے والے اس اختلاف خیال کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، ان کو اس بات پر اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ ایک شعر میں جو مضمون ادا کیا گیا ہے، اُس کے ٹھیک برخلاف دوسرے شعر کا مضمون ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کا اصل خیال کیا ہے، وہ پہلے خیال کو مانتا ہے، یا دوسرے خیال کو اُسکی قلبی صدا پہلے شعر میں ہے، یا دوسرے شعر میں ؟

مولانا حالی نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں خیالات شاعرانہ کے اس اختلاف و تناقض کا عذر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ: "جس طرح ایک فلسفی یا مورّخ کی تصنیف میں اختلاف

پایا جاتا اس تصنیف کو عیب لگانا ہے، اس طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا، بلکہ اس کا بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہئے، فلسفی یا مورخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قایم کرتا ہے اور اس لئے ضرور ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو۔ لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے، بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اُس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اُس کے دل کو بے چین کر دے، اُس کو اُسی طرح بیان کرے، پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو، جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو، اُس کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے، وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا، تاکہ اُس کے حقایق و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے، بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کا کبھی روکار کا اور کبھی پچھیت کا، کبھی اُس صلعے کا اور کبھی اس صلعے کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ہے، اسی طرح شاعر حقایق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے، پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے، اور بُری چیز کی تعریف، کیونکہ خیر محض کے سوا ہر چیز میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے، عقل، علم، زہد، دولت، عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے ان کی جا بجا مذمت کی ہے، اسی طرح دیوانگی، نادانی، رندی، فقر، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں، لیکن شعرا ان کے اکثر مداح رہے ہیں"+

"شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے وہ کبھی قدما کے مقابلہ میں اس لئے کہ وہ اُستاد اور موجدِ فن تھے، اپنے تئیں ناچیز اور بے حقیقت بتاتا ہے اور کبھی اس لئے کہ اُس نے اُن کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی شامل کی ہے، جو اُن کے پاس نہ تھی، اپنے تئیں اُن پر ترجیح دیتا ہے، وہ کبھی دنیا کی اس لئے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دار الغرور اور دار المحن ہے، اور کبھی اُس کی بڑائی اور عظمت اس لئے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہے، گورنمنٹ کی کبھی اُس کی خوبیوں کے سبب سے تعریف کرتا ہے، اور کبھی اُس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت"+

شاعرانہ خیالات کے اختلاف و تناقض کی اس توجیہ کو جو مولانا حالی نے بیان کی ہے، ہم ہر حالت میں صحیح خیال نہیں کرتے، یہ تو سچ ہے کہ شاعر کے سامنے ایک شے کا جو پہلو آئے، اُس کا ہُو بہو ادا کرنا اُس کا فرض ہے، مگر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اس کیفیت کے طاری ہونے سے پانچ منٹ بعد اُسی شے کا دوسرا پہلو اُس کے سامنے اس طرح آئے کہ ایک متضاد و متناقض کیفیت پیدا کر دے، اور اس کو مجبور کر دے کہ وہ فوراً دوسرا متناقض خیال اُسی زور اور اُسی جوش سے بیان کرے، جس زور اور جوش سے کہ اُس نے پہلے خیال کو بیان کیا تھا، فوٹو گرافر اپنے کیمرے کو چشم زدن میں ایک طرف سے دوسری طرف موڑ دیتا ہے اور دوسری طرف پلیٹ پر دوسرا عکس اُتار لیتا ہے، مگر ذہنِ انسانی کی یہ کیفیت نہیں ہے، اُس پر ایک واقعہ کا عکس جو سامنے سے پڑتا ہے اور اس سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، یہ کیفیت اُسکو بیتاب کرتی ہے کہ وہ اُس کے متعلق اپنے جذبے کو بیان کرے، جبتک یہ کیفیت اُس کے ذہن سے محو نہ ہو جائے اُس کے برخلاف دوسرے واقعہ سے کوئی بیچین کرنے والی کیفیت اُس کے ذہن میں پیدا نہیں ہو سکتی، ذہنی پلیٹ سے

پہلے واقعہ کا عکس یا تو مٹ جانا چاہئے، یا اس قدر دھندلا پڑ جانا چاہئے، کہ گویا وہ کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا، تب البتہ ممکن ہے کہ متضاد واقعہ اپنا عکس ڈال کر دوسری بیتابانہ کیفیت پیدا کر سکے، ایک ہی سانس میں دنیا کی مذمت اور اُس کی مدح کسی شاعر کے ذہن میں ایسے جوش کے ساتھ پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ اُس کو اظہار خیال پر مجبور کر دے، ایک ہی غزل کے ایک شعر میں دنیا کی مذمت اور دوسرے شعر میں اُسکی مدح اور اسی طرح کے متناقض و متضاد خیالات اسقدر جلد بیان کرنا شاعری کو بیشک عیب لگاتا ہے، اور اس سے صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دونوں خیال جو ایک دوسرے کے برخلاف ہیں، اُس کی ذہنی کیفیتوں کے پرتو نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک مصنوعی اظہار خیال ہے، جس پر شاعر ردیف اور قافیہ کے اقتضا سے مجبور ہوا ہے، یہ کیونکر ممکن ہے کہ شاعر ایک لمحہ میں ایک چیز کی ترغیب دلا کر دوسرے لمحہ میں اُس چیز سے نفرت دلائے، یہ انسان کی طبعی نفسیات کے برخلاف ہے، ہاں یہ بات بیشک ممکن ہے کہ ایک زمانے میں شاعر مثلاً دنیا کو رغبت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اُس کی ہر شے اُس کے دل پر ایک دلفریب عکس ڈالتی تھی، اور اسکے جذبات کو رنگین کرتی رہتی تھی، اُس زمانے میں اگر شاعر اپنی اس ذہنی کیفیت کو بیان کرتا تو اس کا بیان سرتاپا دنیا کی دلکش کیفیت کی تصویر ہوتا، اور اس سے سننے والوں کو ترغیب ہوتی کہ وہ بھی شاعر کی طرح دنیا کے دلچسپ رنگوں کا نظارہ کریں، اور اس سے پورا لطف اُٹھائیں، اگر شاعر کو پے در پے ناکامیوں سے اور دل شکن واقعات کے مسلسل پیش آنے سے دنیا کی طرف سے نفرت ہو جاتی اور بیزاری کا جذبہ اُس کے دل میں شدّ و مد سے پیدا ہو جاتا، تو اس دوسرے زمانے میں وہ اپنی اس ذہنی کیفیت کو مایوسانہ لہجہ میں بیان کر سکتا تھا، اور اس کا اثر بھی سننے والوں پر ضرور ہوتا کیونکہ شاعر کا بیان اس حالت میں بھی اُس کی ذہنی کیفیت کی سچی تصویر ہوتا، اور اس میں بھی صداقت اور جوش موجود ہوتا، پس ایک لمحہ کے بعد دوسرے لمحہ میں شاعر کے اختلافِ بیان اور تناقض خیالات سے اس کا بیساختہ پن ظاہر نہیں ہوتا اور نہ یہ شاعری کا زیور ہے، بلکہ اس سے صداقتِ شعری برطرف آتا ہے اور شاعر کے دل کی اصلی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا، اور اس کی شاعری کی مصنوعی اور غیر حقیقی ہونے کی خبر دیتا ہے، اور بتاتا ہے کہ شاعر فقط نقال ہے، اُس کی شاعری اُسکے دل کی آواز نہیں ہے، وہ مختلف خیالات کو جو شعرا نے زمانۂ سابق میں وقتاً فوقتاً بیان کئے ہیں، بغیر اس کے کہ اپنی ذہنی کیفیت کی مُہر اُن پر لگائے، محض نقل و تقلید کے انداز سے بیان کرتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ شاعری کا سخت عیب ہے، اور اس سے شاعری کی زینت نہیں ہوتی، بلکہ تخریب ہوتی ہے، یہ شاعری نہیں بلکہ قافیہ پیمائی ہے، شاعر کسی ذاتی خیال کو یا اپنی کسی ذہنی کیفیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا، بلکہ ہر قافیہ جس خیال کے اظہار پر اُس کو مجبور کرتا ہے، بے پروائی سے اُس کو باندھ جاتا ہے اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ جو خیالات وہ جلد جلد بیان کر رہا ہے، اُن میں کسقدر اختلاف و تناقض ہے، یہی مقام ہے جہاں ہمارے شاعروں کی نفسیات یورپ کے شعرا کی نفسیات سے مختلف ہو جاتی ہے، یعنی یہاں خیال پر قافیہ مقدم ہے اور وہاں خیال کو قافیہ پر مقدم سمجھتے ہیں +

یورپ اور ہندوستان کے شعرا کی عام نفسیات میں جو اختلاف ہے، اس کے علاوہ خاص خاص شعرا کی نفسیات بھی ہمارے ہاں جداگانہ ہے، اور یہ ہر ایک شاعر کے طبعی اقتضا کے موافق ہے، ایک گروہ شاعروں کا ہمارے ہاں ایسا ہے

جورات دن زبان باندھنے کے درپے رہتا ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو روزمرہ کی ترکیبوں اور زبان کے محاوروں کو روشناس کرے، یہ ترکیبیں اور محاورے ظاہر ہے کہ بجز آن عام خیالات کے جو عام لوگوں کے دلوں میں گزرتے رہتے ہیں، اور جن کے لئے وہ ترکیبیں اور محاورے وضع کئے گئے ہیں کسی نئے اور اعلیٰ خیال کو ادا نہیں کر سکتے، اس بنا پر اس گروہ کے شعرا پیش پا افتادہ خیالات کو باندھنے پر مجبور ہیں،

اس قسم کے شعرا دانستہ ایسی زمینیں غزلوں کے لئے انتخاب کرتے ہیں جس میں ردیف کوئی فعل ہو، یا فعل کے مشتقات میں سے ہو، پھر کوشش کرتے ہیں کہ اس فعل کے ساتھ مختلف لفظوں کے ملانے سے جتنے محاورات بنے ہیں، حتی الوسع ان سب کو باندھ دیں، مثلاً ایک شاعر نے غزل کی ردیف اُٹھاتے اختیار کی ہے، اُٹھانا کے ساتھ مختلف لفظوں کے ساتھ ملانے سے جو محاورے بنے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں، اور اس شاعر نے ان سب محاوروں کو اس غزل میں باندھ دیا ہے:- داغ اُٹھانا، قلقہ اُٹھانا، آنکھ اُٹھانا، سر اُٹھانا، ہاتھ اُٹھانا، بیڑا اٹھانا، نقاب اُٹھانا، ناز اُٹھانا، باگ اُٹھانا، ایذا اُٹھانا، طوفان اُٹھانا، لطف اُٹھانا، مصیبت اُٹھانا، منہ اُٹھانا +

ایک غزل کی ردیف ہے، اُڑاتے، اس میں شاعر نے حسب ذیل محاورے کھپائے ہیں:- خاک اُڑانا، لطف اُڑانا، فسانہ اُڑانا، رنگ اُڑانا، پرزے اُڑانا، چنگیوں میں اُڑانا، مزے اُڑانا، خاکا اُڑانا +

ایک غزل کی زمین ہے بگڑا، اس میں یہ محاورے لائے گئے ہیں:- کام بگڑنا، منہ بگڑنا، مزاج بگڑنا، نقشہ بگڑنا، چلن بگڑنا، بدن بگڑنا +

بگڑے کی ردیف میں ایک شاعر نے حسب ذیل محاورے خرچ کئے ہیں:- گوشہ پکڑنا، زبان پکڑنا، ہاتھ پکڑنا، سر پکڑنا، رات پکڑنا، دودن نہ پکڑنا، دل میں جگہ پکڑنا، دل پکڑنا، کان پکڑنا، بات پکڑنا، دامن پکڑنا، ضد پکڑنا +

توڑنے کی ردیف میں ایک شاعر نے ان محاوروں کو استعمال کیا ہے:- توبہ توڑنا، دل توڑنا، مگر توڑنا، ہمت توڑنا، پاؤں توڑنا، بدن توڑنا، عرش کے تارے توڑنا +

ایک غزل کی ردیف ہے کھا چکے، اس میں یہ محاورے کھپائے گئے ہیں:- شکست کھانا، دھوپ کھانا، زخم کھانا، قسم کھانا، فریب کھانا، بل کھانا، پیچ و تاب کھانا، غصہ کھانا، غوطہ کھانا، مغز کھانا، تلوار کھانا، زخم کھانا، ٹھوکر کھانا، کان کھانا، رشک کھانا، جوش کھانا +

ایک مرثیہ گو شاعر نے اپنے سلام کی ردیف کھینچے ہیں رکھی ہے، اس نے اس سلام میں ان محاوروں سے کام لیا ہے:- خنجر کھینچنا، خیمہ کھینچنا، دامن کھینچنا، ہاتھ کھینچنا، پاؤں کھینچنا، طول کھینچنا، تصویر کھینچنا، نشے میں کھینچنا، اپنے تئیں دور کھینچنا، سختیاں کھینچنا، سر کو آسمان تک کھینچنا، ایذا کھینچنا، رگ رگ سے جان کھینچنا، باگ کھینچنا، انتظار کھینچنا، نقشہ کھینچنا، دار پر کھینچنا، خجالت کھینچنا، کسی چیز پر قلم کھینچنا +

ایک غزل کی ردیف ہے نکالے، اس میں ایک شاعر نے یہ محاورے صرف کئے ہیں:- ارمان نکالنا، دل کا بخار نکالنا، منہ سے اُف نہ نکالنا، اشاروں میں کام نکالنا، وحشت میں پاؤں نکالنا، عیب نکالنا، نام نکالنا، آنکھیں نکالنا، بل نکالنا، راہ نکالنا، تدبیر نکالنا، شعر کی زمین نکالنا، دل سے کھٹکا نکالنا، کسی کا ذکر نکالنا، آرزو نکالنا، بات بات میں شر نکالنا، جوہر نکالنا، پر پرزے نکالنا، قدم نکالنا، نیا رنگ نکالنا، مطلب نکالنا، سر نکالنا +

غرضکہ اس قسم کے شعرا ہمیشہ اس بات کے درپے

رہتے ہیں کہ جہانتک ممکن ہو زبان کے محاوروں، روزمرہ کی ترکیبوں اور ضرب المثلوں کو اپنے کلام میں کھپائیں، اُن کو شاعرانہ تخیّل یا اعلیٰ خیالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، ظفر کے چاروں دیوان اسی قسم کی شاعری سے بھرے ہوئے ہیں آجکل کے بہت سے شاعر بھی جو مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں، رات دن اسی دُھن میں لگے رہتے ہیں +

برخلاف اس کے دوسری قسم کے شعرا وہ ہیں، جو باوجود ردیف قافیہ کی پابندی کے اعلیٰ خیالات اور لطیف حسّیات کے اداکرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر یاد رکھنا چاہئے کہ عام طور پر ایسے شعرا آسان ردیفیں اختیار کرتے ہیں، اور ایسے قافیے لاتے ہیں، جن میں خیالات کا ادا کرنا مشکل نہ ہو، میرؔ، دردؔ اور غالبؔ اپنی شاعری کے غالب حصّہ کے لحاظ سے اسی گروہ میں داخل ہیں، اگرچہ اپنے زمانہ کے اقتضا سے وہ کبھی کبھی دوسری قسم کی زمینیں اختیار کرنے پر مجبور ہوئے ہیں، مگر عام میلان ان کا وہی ہے، جو بیان کیا گیا +

حالیؔ کے زمانہ سے شاعری میں جو انقلاب ہوا، اُسکے اقتضا سے فطرت نگار شاعروں نے قافیہ پیمائی چھوڑدی ہے، وہ یا تو بغیر ردیف کے صرف قافیہ اپنی نظموں میں لاتے ہیں، اور قافیہ ایسا اختیار کرتے ہیں، جس کے ہموزن الفاظ کثرت سے ہوں، خشاؔر رواں، تپاں، زمیں، جبیں، دریا، صہبا + لاتا ہے، کھاتا ہے + رفتار، گفتار + کمال جمال + قلم، حرم + تحریر، تصویر + دیواں، عریاں + قسمت، قدرت + بہار، غبار + چمن، سخن + بسمل، کامل وغیرہ، یا ردیف بہت چھوٹی اختیار کرتے ہیں، جو ادائے خیال میں مخل انداز نہ ہو، مثلاً پر، میں، سے، کو، کا، کے، کی، نے، ہے، ہیں ہو، تھا، تھی، تھے، تک وغیرہ یا ترکیب بند میں ہر بند کے اشعار کی تعداد برابر نہیں رکھتے، جو خیال ایک بند کے جتنے اشعار میں ادا ہو جائے، اُتنے اشعار پر قناعت کرتے ہیں، یا مثنوی کی طرز میں ادائے خیال کی کوشش کرتے ہیں +

مثنوی کی مشہور بحریں حسب ذیل ہیں:۔

(اوّل) ہزج مسدّس مقصور جس کا وزن ہے:۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل، مفاعیل کی جگہ فعولن بھی ہو جاتا ہے، اس بحر میں جامی کی یوسف زلیخا، نظامی کی خسرو شیریں زلالی کی مثنوی، ناصر علی کی مثنوی، اور غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق لکھی گئی ہے +

(دوم) ہزج مسدّس اخرب مقبوض مکفوف جس کا وزن ہے:۔ مفعول مفاعلن مفاعیل، مفاعیل کی جگہ فعولن بھی آسکتا ہے، اس بحر میں فیضی کی مثنوی نلدمن، خاقانی کی مثنوی تحفۃالعراقین اور نظامی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی گئی ہے +

(سوم) رمل مثمن جس میں صدر اور ابتدا سالم ہیں اور حشو مخبون ہے، عروض اور ضرب مخبون و محذوف ہیں، اس کا وزن ہے:۔ فاعلاتن، فعلاتن فعلن، اس بحر میں میر نجات کی مشہور مثنوی گل کُشتی لکھی گئی ہے +

(چہارم) رمل مسدّس محذوف، جس کا وزن ہے:۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلن، آخر رکن فاعلات بھی ہو جاتا ہے، مولانا روم کی مثنوی معنوی، شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور بہاوالدین آملی کی مثنوی نان وحلوا لکھی گئی ہے +

(پنجم) بحر سریع مطوی موقوف، اس کا وزن ہے:۔ مفتعلن مفتعلن فاعلان، آخر کا رکن فاعلن بھی آسکتا ہے، اس بحر میں امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین، نظامی کی مثنوی مخزن اسرار، نیز مثنوی مطلع الانوار لکھی گئی ہے +

(ششم) بحر خفیف مسدّس جس میں صدر و ابتدا سالم اور باقی اجزا مقطوع ہیں، اس میں اگر عروض فعلن آئے اور

ضرب فعلات یا فعلان، یا اس کے برعکس عروض فعلات یا فعلان آئے اور ضرب فعلن آئے، تو دونوں صورتیں جایز ہیں اس کا وزن ہے:۔ فلاعلاتن مفاعلن فعلن، فعلن کی جگہ فعلات یا فعلان بھی آسکتا ہے، اس بحر میں مثنوی نام حق مثنوی ماتقیماں، نظامی کی مثنوی ہفت پیکر، امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت اور حکیم سنائی کی حدیقہ لکھا گیا ہے۔

(ہفتم) بحر متقارب ثمن مقصور یا محذوب، اس کا وزن ہے:۔ فعولن فعولن فعولن فعول، آخری رکن فعل بھی لایا جاسکتا ہے، فردوسی کی یوسف زلیخا، فردوسی کا شاہنامہ، سعدی کی کریما سعدی کی بوستاں، نظامی کا سکندر نامہ، اور ملا ہاتفی کا ظفر نامہ اسی بحر میں لکھا گیا ہے۔

(ہشتم) بحر متدارک ثمن مقطوع جس کا وزن ہے:۔ فعلن فعلن فعلن فعلن، اس بحر میں میر کی مثنوی جوش عشق لکھی گئی ہے، مگر اس وزن میں میر نے طرح طرح کے تغیر کئے ہیں کہیں تو بالکل یہی وزن رکھا ہے، کہیں فعلن فعلن فعل فعولن، کہیں فعل فعولن فعل فعولن، کہیں فعل فعولن فعلن فعلن، کہیں فعلن فعل فعولن فعلن، فارسی کی کوئی مثنوی اس بحر میں مشہور نہیں۔

(نہم) بحر متقارب ثمن اثلم جس کا وزن ہے:۔ فعلن فعولن فعلن فعولن، اس بحر میں مولانا حالی نے اپنی مثنوی کلمۃ الحق لکھی ہے، فارسی میں کوئی مثنوی اس بحر میں مشہور نہیں، مگر زمانۂ حال کے شاعرانہ انقلاب نے شعرا کو مثنوی کی ان بحروں پر محدود اور قانع نہیں رکھا، وہ تقریباً تمام بحروں میں مثنوی لکھتے ہیں، اس سے اظہار خیال کے لئے میدان بہت وسیع ہوگیا ہے، شاعر کو ہر شعر کے سر انجام کرنے میں وہ قافیے سوچنے پڑتے ہیں، جو موقع پر نہایت آسانی سے خیال میں آجاتے ہیں، اور خیال کے تسلسل اور روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، یہ آخری طریقہ یعنی مثنوی کے پیرایہ میں ادائے خیالات آجکل زیادہ مقبول ہوتا جاتا ہے، اور چونکہ مثنوی کی ان بحروں پر شاعروں نے ادائے خیال کو محدود نہیں رکھا جو قدیم زمانے سے مسلّمہ ہیں، اس لئے اس طریقہ میں وسعت اور گنجایش زیادہ نکل آئی ہے، مولانا حالی نے برکھا رُت نشاطِ امید، حبِ وطن، مناجات بیوہ، کلمۃ الحق وغیرہ مثنویاں چھوٹی ہی بحروں میں لکھی ہیں، مگر آجکل مثنوی کے لئے طویل بحریں اور عام بحریں اختیار کرنے کا میلان پایا جاتا ہے یہاں مثال کے طور پر دو دو شعر مثنویوں کے لکھے جاتے ہیں، جن میں مثنوی کی قدیم بحروں کی پابندی نہیں کی گئی، یہ مثالیں میں نے خود اپنے ہی کلام سے لی ہیں ؎

اُس ہال کے اندر حوض جو تھا، فوارے اُسمیں آچھلنے لگے
دھاریں جو ہوئیں پانی کی رواں، دھاروں سے راگ نکلنے لگے
پھر گھنگروؤں کی چھم چھم کی صدا، اُس ہال کے فرش سے آنے لگی
یہ ناچ کی دُھن کچھ سازوں کو بجنے کے لئے اُکسانے لگی

تارے سے ہیں چمکتے ہوئے یاسمن کے پھول
حیراں ہیں جن کو دیکھ کے سارے چمن کے پھول
ہیں لمبی لمبی ڈالیاں چھائی زمین پر
چھتری سی ہے جنھوں نے بچھائی زمین پر

بعض اُودے ہیں، مگر بعض پیلے شہتوت
کیا ہی قدرت نے بنائے یہ رسیلے شہتوت
لذتِ بادۂ کوثر ہے تو شہتوت میں ہے
شہدِ جنت کا مزا گر ہے تو شہتوت میں ہے

پیپل کے ہر درخت پہ طوطوں کے ہیں پرے

چونچیں ہیں لال لال، بدن میں ہرے ہرے
چھوٹے پھلوں کو پھینکتے ہیں وہ کُتر کُتر
مینہ سا برس رہا ہے زمیں پر پٹر پٹر

یہاں ہوا آزاد ہے، موجیں یہاں آزاد ہیں
سب پرند آزاد ہیں، سب مچھلیاں آزاد ہیں
حُسن لیتا ہے یہاں انگڑائیاں چاروں طرف
ہے خوشی چاروں طرف اور ہے ضیا چاروں طرف

میں ہوں شمعِ محفلِ زندگی، مرا نام عہدِ شباب ہے
مری سانس بادِ بہار ہے، مری چال موجِ شراب ہے
مری عمر کی ہیں جو ساعتیں ہوئیں عشرتوں میں تمام ہیں
یہی قہقہے یہی چہچہے مری زندگی کے پیام ہیں

ہے مرے دل میں یہ تمنا یونہی رہوں بے نام و نشاں
اہلِ جہاں سے دُور رہوں اور دُور رہیں مجھ سے اہلِ جہاں
کشمکشِ جذبات سے میرا دامنِ عصمت چاک نہ ہو
پاک رہوں اور پاک ہی جاؤں، گھر میں مرے گو خاک نہ ہو

اے شیکسپیئر! اے دلِ انساں کے مصوّر
فطرت کے مظاہر ترے دل پر ہوئے ظاہر
وسعت میں تری رُوحِ سمندر سے بڑی ہے
رفعت میں نظر تیری ستاروں سے لڑی ہے

ملک کا سرمایۂ بقا ہے انہیں سے
قوم کا سامانِ ارتقا ہے انہیں سے
گر ثمر شاخِ آرزو ہیں تو یہ ہیں
جوہرِ شمشیرِ آبرو ہیں تو یہ ہیں

اے آریو! آؤ قدم رکھو ان حُسن بھرے گلزاروں میں
جنّت کے مزے لوٹو گے سدا اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر شہر اپنے نئے آباد کرو
گا گا کے بھجن، کر کر کے ہون، ہو جاؤ مگن، دل شاد کرو

وہ راگ جسے ہنگامِ سحر گاتی ہے ہوا گلزاروں میں
وہ راگ جسے چشموں کی زباں کرتی ہے ادا کہساروں میں
وہ راگ جسے گا گا کے سدا آتے ہیں برسے مستی میں
وہ راگ چھپی ہے جس کی صدا ہر رینگنے والی ہستی میں

خون اُس کی نگاہوں سے ہر لحظہ ٹپکتا ہے
ہے ہاتھ میں جو چاقو بجلی سا چمکتا ہے
ہے کاٹتا اک دم وہ سرسبز نہالوں کو
رحم اُن پہ نہ کیوں آئے سب دیکھنے والوں کو

جب نیم کی شاخیں ٹھنڈی ہوا کھا کھا کے تھرکنے لگتی ہیں
پھر زرّیں کرنیں سورج کی پتّوں پہ چمکنے لگتی ہیں
پتّوں کی رگوں میں نیم کا رس ہے دوڑتا پوری سُرعت سے
یہ ریشہ دوانی دیکھ کے میں تصویر بنا ہوں حیرت سے

مرے دل میں اُٹھتے ہیں ولولے کہ ہوں کاش بادِ بہار میں
کبھی غنچہ پر ہو مرا گزر کبھی پھول سے ہوں دو چار میں
کبھی گلشنوں کو بتاؤں میں وہ جو ضابطے ہیں سنگار کے
کبھی بلبلوں کو سکھاؤں میں وہ جو نغمے ہیں بہار کے

ہے طبع رواں، دب کر جھنجھٹ میں کچل جاتی
برگد کے تلے آکر ہے گھاس بھی جل جاتی
جو ذہن کہ خلوت میں کر سکتے تھے ایجادیں
جلوت میں وہ جب پہنچے، سب بھر گئیں بنیادیں

لطفِ ہوا سے بُو پہ بُو پھیل رہی فضا میں ہے
معجزہ نوبہار کا جلوہ گر اِس ہوا میں ہے
عکس مشام پر مگر جب نہ پڑے شمیم کا
کیجئے کس سے تذکرہ تازگیٔ نسیم کا

سرہانے اک مریض کے ہے شمع زرد جل رہی
برنگِ مورِ ناتواں ہے نبض اُس کی چل رہی
یکایک اُس کے چہرہ پر جھلک سی آکے رہ گئی
جو زندگی کی موج تھی وہ تلملا کے رہ گئی

وہ گلوں کی روشنی سے نظروں کا دنگ ہونا
وہ برنگِ باغِ رضواں چمنوں کا رنگ ہونا
وہ شمیم عطرِ گل کا سرِ رہ گذر مہکنا
وہ نسیمِ مشکِ بیں کا دمِ غنچہ سے لپکنا

کس قدر بلندی پر تھا کبھی مکاں میرا
شاخِ سبزِ طوبےٰ پر تھا اک آشیاں میرا
حوریں کس مسرت سے گود میں بٹھاتی تھیں
زمزمے مرے سُن کر خود بھی سر ہلاتی تھیں

یہ زمیں یہ چمنستاں؛ وہ بلندی پر ستارے
مرے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جلوے ہیں تمہارے

کبھی خوشبو کی لہر سی پاتا ہوں فضا میں
تو سمجھتا ہوں کہ تم بال سُکھاتے ہو ہوا میں

صُبح یونہی آئے گی شام یونہی آئے گی
گردشِ لیل و نہار رنگ یونہی دکھلائے گی
زمزمے مرغِ چمن یونہی سدا گائیں گے
پھول یونہی باغ میں رنگ نیا لائیں گے

ہے حادثوں میں پنہاں حکمت کا اک اشارا
جرّاحیاں ہیں گویا قدرت کی آشکارا
نشتر سے حادثوں کے چیرے نہ گر وہ پھوڑے
فاسد مواد اُن کو زندہ کبھی نہ چھوڑے

سمندر! اے دلِ خالق کے اضطراب سمندر!
چھپے تو رکھتا ہے کیا انقلاب سینے کے اندر
غرورِ عقلِ بشر کے ڈبو چکا ہے تو لاشے
اب اور دیکھیے، کیا کیا دکھائے گا تو تماشے

جولانگہِ اظہارِ لیاقت اسے کہئے
گہوارۂ تعلیمِ فصاحت اسے کہئے
ذہنوں کی ترقی کا جو میداں ہے تو یہ ہے
آدابِ تمدّن کا دبستاں ہے تو یہ ہے

ایک ہنگامہ تھا برپا مرے ارمانوں میں
برقِ مضطر کی تڑپ تھی مرے شریانوں میں
صرصرِ رنج کے جھونکے جو گذر جاتے تھے
دفترِ قلب کے اوراق بکھر جاتے تھے

کیا برق و باد کا طوفان تھا، تھی جس سے فضا میں بڑی ہل چل
اب تو ہی نشانی ہے باقی طوفان کی اے تنہا بادل
دل تیری گرج سے دہلتے تھے لرزہ تھا پڑا جاندار و نیں
گویا تھا سمندر ٹوٹ پڑا پانی کی چمکتی دھاروں میں

اس بہشتِ زندگی سے نوجوان غافل نہ ہوں
عیش کے مشتاق ہیں، تو طیش پر مائل نہ ہوں
لذتِ اخلاقِ شیریں اُن کو چکھنی چاہیئے
من و سلوٰی کی حفاظت اُن کو رکھنی چاہیئے

وحیدالدین سلیم پانی پتی

چائے کی پیالی

حامد اور محمود کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے +

یکایک بازار میں شور و غوغا برپا ہوا، گالی گلوچ اور مار پیٹ کی آوازیں آنی شروع ہوئیں +

حامد نے کھڑکی میں سے جھانک کر کہا "لوگ کسی کو پیٹ رہے ہیں"!

محمود نے پوچھا "کوئی بدمعاش ہے کیا؟ یا کوئی جھگڑالو . . . ؟ . . . لیکن کوئی بھی ہو ہم یہ غیر قانونی حرکت نہیں ہونے دیں گے، چلو اسے چھڑائیں" +

"مگر یہ کوئی بدمعاش نہیں جسے یہ پیٹ رہے ہیں" +

"بدمعاش نہیں؟ تو پھر کوئی چور ہوگا۔ بہرحال کوئی بھی ہو، کسی طرح اُسے اس بھیڑ میں سے نکال دینا چاہیئے" +

"مگر یہ تو چور بھی نہیں ہے" +

"چور بھی نہیں؟ تو پھر کون ہے؟ کوئی مفرور خزانچی، کسی دیوالیہ بنک کا ڈائرکٹر، کوئی نادہند سرمایہ دار کوئی موکلوں کو دھوکا دینے والا وکیل، کسی فسادی اخبار کا ایڈیٹر، آخر یہ کون ہے؟ اجی کوئی بھی ہو . . . ہمیں اُس کی مدد کو ضرور پہنچنا چاہیئے" +

"اجی نہیں، وہ تو . . . . . ایک لیڈر ہے، اور لوگ اُسے پیٹ رہے ہیں" +

"لیڈر؟ تو پھر میرا خیال ہے کہ ہمیں پہلے اپنے چائے کے پیالے ختم کر لینے چاہئیں" +

بدرالدین

الف بے تے

از جناب مولوی سید محمد ممتاز علی صاحب ممبر کورٹ آف مسلم یونیورسٹی، ایجوکیشنل فیلو پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(خاص برائے نیرنگ خیال)

ہماری قوم اور قوم کی انجمنیں بڑے بڑے مدرسے اور کالج قائم کرتی اور علمی رسالے نکالتی، اور اعلیٰ تعلیم کی بہت دھوم مچاتی ہیں، مگر اصل حالت یہ ہے کہ اب تک ہماری الف بے تے تک بھی درست نہیں۔ لیکن عالی دماغ و فاضلانِ قوم کو ان کی بیش بہا علمی خدمات اتنی مہلت نہیں دیتیں، کہ وہ ایسے ادنیٰ ادنیٰ مضامین پر توجہ مبذول فرمادیں، حالانکہ خورد سال بچوں کی ابتدائی تعلیم ہی جو آئندہ تعلیمی عمارت کی بنیاد ہوتی ہے، بڑے استحکام و پختگی کی محتاج ہے، اور جن بزرگوں کو قوم کی تعلیم کی فکر ہے، انہیں اپنے فکر گرا نمایہ کا کچھ معقول حصّہ جس طرح بھی ہو، بہتری اطفال میں بھی صرف کرنا ضرور ہے۔

ہمارے طریقہ تعلیم میں بہت سے نقص ہیں، مگر جو نقص خاص بچوں کی تعلیم سے تعلق رکھتے ہیں، وہ ازبس اہم اور قابل توجہ ہیں۔ انہیں نقصوں میں سے وہ نقص ہیں، جن کا تعلق والف بے تے سے ہے، اور جو ہم بالاختصار اس آرٹیکل میں بیان کرتے ہیں۔

ہمارے الف ب ت میں کئی قسم کے نقص ہیں، کچھ حروف کے ناموں سے تعلق رکھتے ہیں، کچھ اُن کی شکلوں سے، اور کچھ طریق تعلیم سے۔ اس آرٹیکل میں ہماری غرض حروف کے ناموں پر بحث کرنے سے ہے۔

ہمارے الف بے تے عربی، فارسی، ہندی، تین زبانوں کے الف بے تے سے مرکب ہوکر بنی ہے۔ اس ترکیب میں نئے حروف اپنی اصلی شکل بلکہ ترمیم شدہ شکل سے بھی داخل نہیں ہوئے، جو کچھ ہوا ہے، وہ یہ ہے، کہ جو آوازیں عربی الف بے تے میں موجود نہیں تھیں، وہ اس میں داخل کرلی گئی ہیں، مثلاً عربی زبان میں پ، چ، گ، ژ کی آوازیں نہ تھیں، سو یہ آوازیں فارسی زبان سے لے لی گئیں۔ جب اہلِ اسلام ہندوستان میں آئے اور یہاں کی بول چال سیکھی، تو اس بولی کے لکھنے کے لئے اُس وقت کی الف بے تے میں کافی آوازیں نہ پائیں، تب ٹ، ڈ، ڑ وغیرہ حروف کی آوازیں اس الف بے تے میں اُور بڑھالیں، اور اس کو اس قابل کرلیا، کہ اس کے ذریعے سے عربی، فارسی، ہندی تینوں زبانوں کے الفاظ لکھے جاسکیں۔

ان کا یہ مقصد تو اس قسم کی ترکیب الف بے تے سے حاصل ہوگیا، لیکن اُس زمانے میں اشغال علمی کا بوجھ اتنا گراں نہ تھا، جتنا اس زمانے میں ہوگیا ہے، اور طریق تعلیم کے اصول کی بال کی کھال نکالنے کے دستور نہ نکلے تھے، اور نہ چنداں لوگوں کو اس بات کی کچھ پرواہ ہوتی تھی، کہ حرف شناسی میں بچوں کا کس قدر وقت گراں بہا ضائع ہوجاتا ہے۔ اس لئے ایسے اُمور کی طرف بالکل توجہ نہ تھی۔ جن سے بچوں کو حرف شناسی میں سہولت ہو، یا بجائے عرصہ مدید کے تھوڑے سے دنوں میں حرف شناسی کی مشق ہوجائے۔ دو چار مہینے تو کیا، کئی کئی برس کا عرصہ ابتدائی

کوششوں میں ضایع ہوجانا ایک معمولی بات تھی، جس پر کسی کو افسوس نہ آتا تھا + لیکن اس زمانے میں بڑی مشکلات پیش آرہی ہیں + اوّل تو علوم کا بوجھ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اس کو اُٹھانے میں عمر کا بہت بڑا حصّہ صرف ہوجاتا ہے، اور باوجود ہر طرح کے اختصار کے بیس برس تحصیل علم میں صرف ہوجانے ادنیٰ سی بات ہے + سب سے اوّل اپنی زبان اور اُس کے حروف اور اپنا قومی لٹریچر سیکھنا پڑتا ہے + پھر دین کی باتیں سیکھنا اور اپنے مذہبی فرائض سے واقف ہونا نہایت ضروری کام سمجھا جاتا ہے، جس کے لئے عربی نہیں تو تھوڑی بہت فارسی جاننا نہایت ضروری سمجھا جاتا ہے جس کے بغیر بول چال کی درستی اور زندگی کی معمولی سی شائستگی بھی حاصل نہیں ہوسکتی + اس کے بعد بڑا مقدم کام حصول معاش کا ہے، جو زندگی کے لئے بظاہر سب سے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے + اس کے لئے مڈل اور انٹرنس اور ایف اے اور بی اے اور ایم اے کی سندیں حاصل کرنی پڑتی ہیں + یہ سب کچھ حاصل کرکے پھر بھی یہی کہا جاتا ہے کہ اب اسقدر ملکہ علمی حاصل ہوگیا ہے، کہ حصول معاش کے لئے کوئی خاص فن سیکھا جائے، چنانچہ پھر کوئی ڈاکٹری پڑھتا ہے، کوئی انجنیری، کوئی کچھ، کوئی کچھ + ان محنتوں اور جانکاہیوں کی مشقت سے طلباء کی صحتیں بالکل برباد ہوجاتی ہیں، اور عمریں نہایت چھوٹی +

ان سب مشکلات کو سوچ کر ہر شائق تعلیم کا یہ خیال ہے، کہ جہانتک ہوسکے جو کام ایک سال کا ہے اُس کو چھ مہینے میں نکالنے کی تدبیر کی جائے + درحقیقت بہت سی اصلاحیں ایسی خیال میں آئی، جن سے تعلیم کی طوالت میں کسیقدر اختصار ہوسکتا ہے + چنانچہ ہمارے الف بے تے ہیں، کچھ ترمیم و اصلاح کرنا بھی انہیں اصلاحوں میں داخل ہے +

ہمارے الف بے تے کے حروف کے ناموں میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ بجائے مختصر سادہ اور آسان ناموں کے ان حروف کے ایسے نام تجویز کئے گئے ہیں جن سے حروف کی اصلی آوازوں کے سمجھنے میں دھوکا ہوتا ہے، مثلاً الف کے بولنے میں ایک آواز ملفوظ ہونے کی بجائے تین مختلف آوازیں تین مختلف مخارج سے ادا ہوتی ہیں، ایک خاص الف کی، دوسرے لام کی تیسری فے کی + اس لئے ان آوازوں کے سنتے ہی یقین کے ساتھ کسی بچے کا ذہن کسی خاص ایک آواز کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا + اسی طرح جیم کے تلفظ میں علاوہ خالص جیم کی آواز کے میم کی آواز بھی ملفوظ ہوتی ہے، اور دال کی آواز ادا کرنے میں لام کی آواز بھی نکلتی ہے + اس خلط ملط میں بچے کے ذہن پر کسقدر بوجھ اس بات کے فیصلے کے لئے پڑتا ہوگا، کہ اصوات ملفوظ میں کون سی اصوات مقصود ہیں، اور کونسی غیر مقصود + اگر جملہ اصوات ملفوظہ مقصود ہوں، مثلاً جب ہم ج اور دال کو ملاکر لکھیں، اور اس کے ہجے یوں کریں کہ "جیم دال زبر" تو اس ترکیب کا ماحصل جد نہیں ہونا چاہئے، بلکہ جمل ہونا چاہئے، کیونکہ جیم کے تلفظ میں میم، اور دال کے تلفظ میں لام کی آوازیں بھی شامل ہیں، اس لئے جیم دال زبر جمل ہوا، حالانکہ ہم بچوں کو جیم دال زبر جد کہنا سکھاتے ہیں +

پس بچے کا ذہن مدتوں ٹھوکریں کھا کھا کر اپنے تئیں اس اُلٹے بے قاعدہ طریق ہجا کا عادی کرتا ہے، اور اس غیر طبعی عادت کے پیدا کرنے میں اُسے کتنی صعوبت پیش آتی ہوگی۔ اس کا ہم کبھی خیال نہیں کرتے + مجھے سب سے

اوّل اس کا خیال اُس وقت آیا، جبکہ میں طالب علمی کے زمانہ میں ایک چپراسی کو قاعدہ پڑھانے لگا۔ اُس کی عمر بیس بائیس سال کی تھی۔ جب میں اُس سے پوچھتا، کہ ج ر زبر کیا ہے تو وہ کہتا جیمر۔ جب میں پوچھتا لام ت زیر؟ وہ کہتا لمت تب میں نے سوچا، کہ اُفّو، بچّوں کو ہماری اس بے قاعدگی سے کتنی تکلیف پہنچتی ہوگی۔ کیا یہ تکلیفیں ایسی ہیں، کہ ان کا علاج ممکن نہیں؟ یا بچّوں کی یہ تکلیفیں رحم کے قابل نہیں ہیں؟ یا بچّوں کا زمانہ طفولیت زیادہ قدر کے قابل نہیں؟

نہیں، ان میں سے کوئی سی بات بھی نہیں۔ ان خرابیوں کا علاج ممکن ہے، اور وہ بہت مشکل بھی نہیں، البتہ قوم کو ذرا توجہ کرنے اور اپنے مجموعی اتحاد کے ذریعے اسے عوام میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔

ہماری ہندوستانی الف بے تے میں جتنے حروف ہیں، ان کے نام وہ اصلی نام نہیں ہیں، جو درحقیقت عربی زبان میں ہیں، بلکہ ہم نے ان کو کسی قدر بدل کر ہندی کر دیا ہے مثلاً عربی فارسی میں بے، تے، ٹے، رے، زے، فے، ہے، یے کی بجائے با، تا، ثا، را، زا، فا، ہا، یا کہتے ہیں، اور الف، جیم، دال، سین وغیرہ حروف جب اشکال اُقلیدس یا دیگر اشکال ریاضیہ یا جبر و مقابلہ میں واقع ہوتے تو ہمارے عربی خواں طلبا انہیں الف، جیم، دال، سین وغیرہ نہیں کہتے بلکہ آ، جا، دا، سا تلفظ کرتے ہیں، پس جب ضرورت کے لئے ہماری قوم کے علماء نے پہلے ہی حروف کے ناموں میں ترخیم جائز رکھی ہے، تو اگر ہم اپنی الف بے تے کے کُل حرف تھوڑا سا بدل کر آسان کر لیں، تو اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔ میرے خیال میں اس کو بدلنے کے تین طریقے ہوسکتے ہیں:-

اوّل یہ کہ سب حروف کے نام ب، پ، ت کے وزن پر تجویز کر لئے جائیں، موجودہ حروف تہجی میں نصف تختی کے قریب اب بھی اس وزن کے نام ہیں یعنی ب، پ، ت، ٹ، ث، ج، ح، خ، ر، ڑ، ز، ژ، ف، ھ، ی کے نام تو پہلے ہی ٹھیک ہیں، اور ان کے تلفظ میں صرف ایک ہی حرف صحیح کی آواز ملفوظ ہوتی ہے، باقی حروف کے نام یوں بدلنے پڑیں گے:-

اے، جے، دے، ڈے، ذے، سے، شے، صے، ضے، طے، ظے، عے، غے، قے، کے، گے، لے، مے، نے گویا اس تبدیلی میں ہمیں انہیں حروف کے نام بدلنے پڑیں گے۔

دوّم طریق یہ ہوسکتا ہے کہ ب، پ، ت کو یائے مجہول کی بجائے الف کے ساتھ ملا کر با، پا، تا وغیرہ نام رکھے جائیں، اس میں یہ فائدہ ہوگا کہ دال، ڈال، ذال، صاد، ضاد، قاف، کاف، گاف، لام کے ناموں کو ترخیم کر کے بھی اسی زمرے میں ملا سکیں گے، گویا پوری تختی میں سے حروف ذیل اس زمرہ میں داخل ہو جائیں گے، ان کے نام یوں بولے جائیں گے:-

با، پا، تا، ٹا، ثا، جا، حا، خا، دا، ڈا، ذا، را، ڑا، زا، صا، ضا، طا، ظا، فا، قا، کا، گا، لا، ہا، یا اس تبدیلی میں صرف یہ آٹھ حروف بدلنے پڑیں گے:-

جیم، سین، شین، عین، غین، میم، نون، واؤ۔

ان کی اگر ترخیم کی جائے، تو یہ جی، سی، شی وغیرہ بن جائیں گے با، پا، تا کی طرح جا، سا نہ ہوں گے، نہ ب، پ کی طرح جے، سے، شے ہوں گے۔ البتہ اس بنا پر کہ عربی خواں طلبہ اشکال میں ان کو جا، سا، شا کہتے ہیں، ان کو اس طریق دوم کے حروف میں داخل کر سکتے ہیں۔

طریق سوم یہ ہے، کہ اس تبدیلی میں دونوں طریقوں کو

جمع کر دیا جائے، اس صورت میں پوری الف بے تے یوں ہوگی
آ، بے، پے، تے، ٹے، ثے، جی، چے، حے، خے، دا، ڈا،
ذا، رے، ڑے، زے، ژے، سی، شی، صا، ضا، طوئے،
ظوئے، عے، غے، فے، قا، کا، گا، لا، می، نو، دا، ہے، یے،

اس الف بے تے میں سب حروف کی آوازوں کو نہیں بدلا گیا ہے، صرف اُن حروف کی آوازوں کو بدلا ہے، جن میں بجائے ایک حرف صحیح کے دو حروف صحیح ملفوظ ہوتے ہیں، اور ان کو بھی اس طرح بدلا ہے، کہ آواز ترمیم شدہ آواز موجودہ کے قریب قریب رہے، مثلاً جی کی آواز جیم کی آواز کے بہت قریب ہے، جا کی آواز بھی اگرچہ جی کی طرح مختصر اور سادہ ہے، مگر جیم سے زیادہ مختلف ہے، مختصراً یہ سمجھو، کہ قدیم ناموں میں ترخیم کر لی گئی ہے +

اگرچہ بعض حروف کے نام الف کے ساتھ، اور بعض کے یے کے ساتھ تجویز کرنا ایک گونہ بے قاعدگی سی معلوم ہوگی، مگر نہیں، اس میں ایک فائدہ بھی ہے، وہ یہ کہ ث، س، ص قریب المخرج ہیں، اگر ان کو ثا، سا، صا کہا جاتا، تو آواز کے لحاظ سے تین حروف کا ایک ہی نام ہو جاتا، اور سُننے میں موجبِ التباس ہوتا، اب ث کا نام ثے ہوگا، س کا سی ہوگا، ص کا صا ہوگا، اسی طرح باقی متشابہ قریب المخارج حروف میں بھی تمیز قایم رہے گی +

اتنی ترمیم سے ہماری الف بے تے کا بھاری نقص دُور ہو سکتا ہے، اور بچّوں کی مشکلات میں کمی ہو سکتی ہے، اُمید ہے کہ جو علم دوست بزرگ تعلیم اطفال کا خصوصیت سے خیال رکھتے ہیں خصوصاً معلمین نارمل سکول اور افسرانِ سررشتہ تعلیم اس مضمون پر پوری توجہ فرمائیں گے، اگر اس پر پوری توجہ کی گئی، تو ہم اس باب میں چند اشارات مزید لکھیں گے +

سیّد ممتاز علی

زمزمۂ تغزّل

(از جناب سیّد عابد علی صاحب بی اے ال ال بی پلیڈر)

وہ جنّتِ حُسن سامنے ہو تو عمر کا اعتبار کیا ہے؟
صنمکدے جس جگہ ہوں روشن وہاں نمودِ شرار کیا ہے؟

بجائے پھولوں کے داغ پائے ہیں، مینے گلزار عاشقی سے
جو حاصلِ روزگار یہ ہے تو حاصلِ روزگار کیا ہے؟

مری نگاہیں تو کھو گئی ہیں کوئی انہیں آئینہ دکھا دے
وہ بن سنور کے یہ پوچھتے ہیں "فروغِ رنگِ بہار کیا ہے؟

کبھی اُفق پہ بہار انجم کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں
یہ منظرِ سحر کار کیا ہے یہ دامنِ زرنگار کیا ہے؟

فسانۂ عشق پر ترا ساز خود بخود تھرتھرا اُٹھا ہے
کوئی تجھے بھی خبر ہے مطرب یہ لرزشِ بیقرار کیا ہے؟

ابھی تو وہ برسرِ کرم ہیں، ابھی مجھے کچھ خبر نہیں ہے
کہ سینۂ داغدار کیا ہے مصیبتِ انتظار کیا ہے

(غیر مطبوعہ)

عابد علی عابدؔ

حقیقتِ دُنیا

(از جناب محترمہ خدیجہ بیگم صاحبہ بی اے آنرز۔ ایم۔ اے۔ ایم۔ او ایل پی ای ایس پروفیسر گورنمنٹ کالج فار وومن لاہور)

(خاص برائے نیرنگ خیال)

اکثر سُننے میں آتا ہے کہ لطائف و حظائظِ دنیا سے جسقدر لطف اندوز ہونا ممکن ہو غنیمت سمجھنا چاہئے، کیونکہ کیونکہ یہاں بار بار تھوڑا ہی آنا ہے ؟ سودا کہتے ہیں ؎

رخصت اے باغباں کہ ذرا دیکھ لیں چمن
جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائیگا

اور کسی ایسی ہی گھڑی میں بابرنے بھی کہدیا ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اور بالفعل تو یہ کیفیت ہے کہ صبح سے شام تک دل میں ایک تگ و دَو لگی ہوئی ہے جس کا مدعا تنعم دنیوی، عیش و آرام، تنعمِ تن، شہرت و نام آوری سبھی کچھ ہے، ہاں اگر کوئی چیز عنقا ہے تو وہ صحیح معیارِ زندگی، مقصودِ آفرنیش اور دنیا میں آنے کی غرض و غایت پر غور و خوض +

حقیقت سے بدنصیب سرگشتگانِ بادیۂ جہالت شاید یہ سمجھتے ہوں کہ دنیا محض لہو و لعب کے لئے پیدا کی گئی ہے اور انسان کا کام صرف یہی ہے کہ شب و روز ماکولات اور مشروبات پر حلاوت سے شادکام ہو، یا اطلس و زربفت میں ملبوس سرسبز و شاداب چمنوں کی روشوں پر مصروفِ گلگشت ہو، نسیم عنبر شمیم اُس کے دل و دماغ کو شگفتہ کر دے یا ساحلِ دریا پر ماہِ تاباں کی دلفریب چاندنی میں رقصاں موجیں اُس کے قلبِ حزیں کو سکون بخشیں، اگرچہ دقیقہ رس طبیعتیں سمجھتی ہیں کہ یہ سب تماشا کسی خاص غرض کو مدِ نظر رکھ کر دکھلایا گیا ہے +

سالکانِ مسلکِ دین کے لئے یہ دنیا ایک عارضی قیام گاہ اور مسافرانِ عالمِ علوی کے لئے راہ گذر ہے، یا اس سے بڑھ کر یہ دقِ جنگل میں ایک پُر رونق بازار ہے جہاں سے دور اندیش رہرو اپنے لئے زادِ راہِ آخرت مہیا کر سکتے ہیں، جرعہ نوشانِ جامِ الست بخوبی واقف ہیں کہ دنیا اور عقبیٰ محض دو مختلف حالتوں کے نام ہیں، اوّل الذکر سے مراد وہ کیفیت ہے جس میں روح جسمِ عنصری سے مربوط ہے، اور اس ربط کے ٹوٹ جانے پر مادی انسان کا انجام اور حقیقی انسان کے لئے (مرتبے کے مطابق) ایک نئی حالت کا آغاز ہے، جس کو عام اصطلاح میں عاقبت کے عنوان سے معنون کیا جاتا ہے، پس دنیا ایک درسگاہ ہے جہاں انسانِ ضعیف البنیان اپنی اس خصوصیت کو جس نے اسے دیگر مخلوق پر فضیلت دیکر اشرف المخلوقات کے اعلیٰ لقب سے ملقب کیا ہے، اپنے فہم و ذکا کی استعانت سے ایسی اکملیت کے درجے پر پہنچائے کہ شائستۂ حضرتِ الٰہیت بن سکے، یہی اس کا جنّت الماوٰی اور تمام سعادتوں کا سدرۃ المنتہا ہے +

شائستۂ حضرتِ الٰہیت سے مراد ہے کہ وہ جمالِ حضرت سے شرفیاب ہو، لیکن اس جمال سے وہ اُس وقت بہرہ ور ہو سکتا ہے، جب وہ اپنے تئیں اس قابل بنائے کہ اُس کا ادراک کر سکے، اور یہ درجہ عرفان و یقین کا نتیجہ ہے، یہ مدارج ایک دوسرے سے اس طرح منضبط ہیں کہ

جبتک زینے کی اوّلین سیڑھی کو تلاش کر کے مستعدی سے قدم نہ رکھا جائے انتہائی چوٹی تک رسائی امر معلوم ہے، یہ تو بتایا جا چکا ہے کہ جمالِ الٰہیت قوتِ ادراک، اور ادراک عرفان و یقین کا ماحصل ہے، اب یہ دیکھنا ہے کہ خود عرفان کیونکر نصیب ہو، عرفان یعنی اپنے معبودِ حقیقی کو پہچاننے کے لئے سب سے بہتر طریقہ اُس کی صنعت و قدرت کی شگوفہ کاریوں کو عین الیقین سے بغور مشاہدہ کرنا ہے، اور اس مطالعہ و مشاہدہ کی کُنجی حواسِ انسانی کے ہاتھ ہے جن کا دارومدار کلیتہً قوائے جسمانی کے قیام پر ہے، یہاں انحطاط کے حساب سے زیریں اور بحساب ارتقا اوّلین زینہ پر پہنچکر ہم ازروئے منطق یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ معرفتِ ذاتِ حق سبحانہٗ کے لئے انسان کو اپنی ہستی کو جاننا یعنی اُس کی ابتدا و انتہا اور مقاصد کا مطالعہ ازبس لازمی ہے +

بشر کے دنیا میں آنے کی یہی اہم غرض ہے کہ وہ اُس خالقِ دوجہان جو اُس کا مبداء ہے امرِ مجبوری سے نہیں بلکہ قوتِ ادراک سے پہچانے اور اُس تک پہنچنے کی سعیِ بلیغ کرے، بلااشتباہ یہ بڑی کٹھن منزل اور کڑی مسافت ہے جیسا کہ نظیری نیشاپوری کہتے ہیں ؎

بزحمت اتصال افتد جو پیوندے بُریدا زہم
بفرصت قطرہ دریا میشود چو قطرہ شود دریا

لیکن سختیاں جھیل کر دریا تک پہنچ جانے اور مصائب کے اختتام پہ آزادی اور نجات کی لذّت کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو اس میدان میں گامزن ہو چکے ہیں، اور جیسا کہ سطورِ بالا میں بوضاحت بیان کیا گیا ہے، اس درس کے لئے انسان کا مدرسۂ دنیا میں آنا ضروری تھا، لیکن یہ بھی مطمحِ نظر ہو کہ اس کو ہمیشہ کے لئے اپنا گھر سمجھنا، لہو و لعب میں مافیہا سے بے نیاز ہو جانا اور مقصودِ زندگی کی تحصیل میں تغافل برتنا ایک اہم غلطی کا ارتکاب ہے، انسان کو دُنیا سے فقط اس قدر علاقہ رکھنے کی اجازت ہے جتنا اس کے نیل مرام میں معاون ہو، پس ظاہر ہے کہ یہ تعلّق محدود ہے احتیاج تک جو دو اقسام پر منقسم ہے :-

اوّل یہ کہ دل کو ہلاکت سے بچائے اور اس کے لئے غذا مہیا کرے، مگر دل سے مراد وہ مضغۂ گوشت نہیں جو بائیں پہلو میں ہے، کیونکہ وہ تو حیوانوں اور مُردوں میں بھی موجود ہے اور آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے، بلکہ اسکا مطلب وہ باطن اور گوہرِ نفیس رُوح ہے جو انسانیت کی اصلیت اور حقیقت ہے جس کا منبع و مرجع حضرتِ الٰہیت ہے اور جس کا دُنیا میں آنا اُس سوداگر کی حیثیت سے ہے جو تزایدِ ثروت کے ممالک و بلادِ مختلفہ میں سفر کرتا ہے +

اس دل یا بالفاظِ دیگر رُوح کی نشو و نما کے لئے غذائے عشقِ حقیقی درکار ہے، کیونکہ ہر چیز کی خوراک با قتضائے طبع ہے، ایک روحانی اور ابدی شے کی غذا مادی اور فانی کیونکر ہو سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ماسوائے کی محبت دل کے لئے باعثِ ہلاکت ہے، یہ درست ہے کہ بہ تقاضائے ملت جسمانی ضروریات کا تہیہ جزوِ فریضہ ہے، مگر یہ تعہدِ تن بحق گوہرِ بے بہائے رُوح کی امداد کے لئے ہونا چاہئے، اور اس حد سے تجاوز کی مثال یوں سمجھئے کہ جسم مانند مرکب اور دل بجائے راکب کے ہے، طے منازل کے لئے مرکب کی غور و پرداخت واجب ہے لیکن اگر سوار ہمہ تن حیوانِ سواری کی خبرداری میں لگا رہے تو ضرور اُسکی منزل کھوٹی ہوگی۔ بعینہٖ اگر انسان تمام عمر تن پروری میں محو رہے اور حقیقی گوہر کو جلا دینے میں پہلو تہی کرے تو سعادت و فلاحِ دارین سے محرومی اس کا حصہ ہوگی، کیونکہ اس نے فانی کو ابدی پر ترجیح دی اور ملمع کو زرِ خالص سے

بہتر سمجھا، ایسے خسارے کے سودے کا نتیجہ ذلت و نکبت اُخروی کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے، حیف ہے حیف کہ جس مکان میں انسان بطور مہمان کے داخل ہو، وہاں گر پڑ جائے اور ایسی میٹھی نیند سوئے کہ ادائیگی فریضہ کا اس میں شعور تک باقی نہ رہے، اور طلبی کے پیام پر وہ روح جس کو وہ منوّر و مطہر مثل گوہر آبدار لیکر دنیا میں آیا تھا ملوث اور گناہوں سے سیاہ کرکے اپنے آقائے حقیقی کے حضور میں بصد ندامت لیجائے +

دنیا کی جو حقیقت اوپر بتائی گئی ہے، اس سے یہ بھی نہ خیال کر لینا چاہئے کہ اس کی ہر چیز مذموم ہے، بیشک اس میں کانٹے ہیں، مگر ان کے زیر نگرانی خوشنما خوش رنگ و بو شگفتہ پھول ہیں، جن کو دیکھ کر خدا کی خدائی یاد آتی ہے، اور بے اختیار اس صانع لطیف کی، جس نے فرش کائنات پر الوان نعمت کا دسترخوان بچھا دیا، ثنا کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں، یہانتک کہ منکر بھی "سبحان ربنا" پکار اُٹھنے پر مجبور ہو جاتا ہے، یہ دنیا ایسی عجائبات سے بھی مملو و مشحون ہے جو باوجود اس میں نشو و نما پانے کے دنیوی آلائشوں سے منزّہ ہے، تمثیلاً علم و عمل، کیونکہ یہ دونوں نہ صرف عالم سفلی میں شانِ بشریت کو دوبالا کرتے ہیں، بلکہ منازلِ آخرت میں بھی ساتھ دیتے ہیں، علم تو بجنسہ رفاقت کرتا ہے، لیکن اعمال صرف اپنا اثر باقی چھوڑتے ہیں جو دیرپا کا ہے +

اوّل پاکیزگیٔ دل جو ترکِ معاصی سے مل سکتی ہے اور دوم اُس ذات تقدّس مآب حق سبحانہ جو مواظبتِ عبادت کا ثمر فوری ہے، اور یہی بہترین اثر ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالْباقِیَاتِ الصّٰلِحٰتِ........ جسکے معنے ہیں بھاتا ہے تیرے رب کو تجھ سے آثارِ خیریہ کا باقی رہنا، اس اُنس کے زیر عنوان جہاں لذتِ علم و لذتِ مناجات ہے وہاں لذائذ دنیوی بھی شامل ہیں، جو فانی ضرور ہیں، مگر انسانی زندگی میں اُن کا وہ حصہ ہے جو امتحان کے پرچوں میں کاغذ اور سیاہی کا ہے، امیدوار طلبا کی تمام جد و جہد جوابات کی تیاری میں صرف ہوتی ہے، اور قلم قرطاس و مرکّب کی خوبی کی طرف ان کی توجہ صرف اسقدر مبذول ہوتی ہے، جہاں تک ان کی تحریر کی خوبصورتی او بدنمائی کا تعلق ہے، عین اسی طرح انسان سے تعہدِ تن صرف اسیقدر توجہ کا مستحق ہے، مگر افسوس حالت کچھ دگرگوں ہے، اور ہوتی جارہی ہے، اور پھر ایسے طبقے میں جہاں اس تغافل کی بہت کم توقع تھی +

خدیجہ بیگم

اشعارِ عید

از جناب خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

ہے آج عجب نور فشاں جلوہ اثر عید
عالم میں جدھر دیکھئے روشن ہے اُدھر عید

پھل پاتے ہیں دیندار ریاضت کے چمن کا
روزے شجرِ گلشنِ جنّت تھے ثمر عید

طاعت سے مسلمانوں کی اللہ بھی خوش ہے
مسجد میں نمازیں ہیں کہ اللہ کے گھر عید

عید نمبر کے بے مثل و لاجواب افسانے

صحرا کا لڑکا

جاہلیت عرب کی ایک داستان

مشہور افسانہ نگار سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے کے قلم سے

(خاص برائے نیرنگ خیال)

بنی اسلحق کے امیر زہیر کی منشا سے اُس کی لڑکی جدہ لڑکوں کی طرح پروان چڑھائی گئی تھی، اور سورج کی روشنی تک کو معلوم نہ ہو سکا تھا کہ نوجوان وحسین غیاور کے لباس میں کیسا دلاویز راز پوشیدہ ہے +

اُس نے اپنی بیٹی کو دُنیا پر بیٹا ظاہر کرنے کا فیصلہ کیونکر کیا، یہ کبھی واضح طور پر خود اُسے بھی معلوم نہ ہونے پایا تھا۔ اُسے صرف اتنا یاد تھا۔ کہ پہلی مرتبہ جب اُس کے کانوں میں یہ اطلاع پہنچی، کہ وہ ایک لڑکی کا باپ بن گیا ہے، تو اس خیال سے اُسکے دل میں نشتر سا چبھا تھا، کہ آخر ایک بات میں خالد کے باپ محارب کو اُس کی کم نصیبی پر مسکرانے کا موقع مل گیا + اور پھر رات کی طویل گھڑیاں ایک مبہم غلش کی بے چینی میں بسر کرنے کے بعد اُس وقت جب صبح کا تارا صحرا کے آسمان پر ڈلکنا شروع ہوا تھا، کوئی طاقت اُسے بے بس کر کے خیمے کے پچھلے حصے میں لے گئی، جہاں اُس کی بیوی تسکین کی گہری نیند میں مسکرا رہی تھی، اور اُس نے عورت کا شانہ جھنجھوڑ کر کہا تھا "جدہ لڑکوں کی طرح پروان چڑھیگی، اور تو جس نے مجھے خالد کے باپ محارب کے سامنے منفعل ہونے کو ایک لڑکی کا باپ بنا دیا ہے، دنیا کے ہر گوشۂ چشم سے اس راز کو محفوظ رکھنے کی ذمہ دار ہوگی" +

خالد کا باپ محارب اور جدہ کا باپ زہیر قبیلۂ بنی اُمیّہ کے اُن امرا میں سے تھے، جن کو فخر تھا، کہ اُن کے چولھوں کی آگ کبھی ٹھنڈی نہیں پڑی، اور کوئی ایسی اندھیری رات نہیں گذرنے پائی، کہ مہمانوں کی آمد کا اعلان کرنے کیلئے اُنھوں نے کتوں کو اپنے خیمے کے چوبوں سے نہ باندھا ہو +

محارب اور زہیر دونوں بھائی تھے، محارب بڑا تھا، اور بڑے بھائی باپ کے جانشین سمجھے جاتے ہیں، زہیر چھوٹا تھا، اور چھوٹے بھائیوں کا مرتبہ ملازموں میں سب سے بلند ہوتا ہے

پس محارب حکم دیتا، اور زہیر بلا پس و پیش اُس کی تعمیل کیا کرتا، اور یہ دونوں کی خوش نصیبی تھی، کہ اُنہیں ایک مدت تک ایک دوسرے سے شکایت پیدا نہ ہوئی +

لیکن آخر ایک روز ایسا آیا، کہ محارب کے حلق میں زہیر کو ایک کانٹا سا چبھا، اور پھر جیسے کسی معجزے سے اُس کی زبان نے وہ تمام زہریلے الفاظ دُہرانے شروع کر دیئے، جنہیں اپنی بیوی کی زبان سے سُن کر اُس کے ماتھے پر بل پڑ جایا کرتے تھے + محارب نے جواب میں وہ شکوے کرنے چاہے، جن کا اس وقت سے پیشتر اُس کو کبھی خیال نہ آیا تھا، اور جب اُن میں حقیقت کا جوش پیدا نہ کر سکا، تو اُس نے اُس دلیل سے کام لینا چاہا، جو لاجواب اور کھسیانے بزرگوں کا آخری حربہ ہوتی ہے + اور زہیر خونِ دل لے کر اپنے خیمے میں چلا آیا +

بیوی نے شوہر کو برافروختہ دیکھا، اور اس واقعے کا حال سُنا، تو وہ بولی "تو کہ شجاعوں کا شجاع اور متقی اور قوی ہے کیوں زبان کے وار سہے؟ خرمے ہر جگہ بافراط پیدا ہوتے ہیں لیکن جس مرد کے بازو قوی ہیں اُس کی عزت ہر کہیں غیر محفوظ نہیں ہے" +

زہیر کو بیوی کے الفاظ کبھی اسقدر مُدلل نہ معلوم ہوئے تھے، وہ اپنا تمام اثاثہ ساتھ لے کر اس مقام سے ہجرت کر جانے پر آمادہ ہو گیا، اور جب ساربان نے سفید پتے ہوئے اُفق پر نظریں ڈال کر اُس کے ناقہ کی مہار ہلائی تو اُس نے باآواز بلند کہا:-

"میں تم سے ایک ہزار سال کی مسافت پر جا کر رہونگا، اور ہر سال ہزار میل کے سفر کے برابر ہوگا، اور اب اگر تم مجھے یہاں ٹھہرانے کے معاوضہ میں ایک ہزار ایسے مصر پیش کرو، جس کو ہزار نیل سیراب کرتے ہوں، پھر بھی اے احسان فراموش بستی اور اُس کے امیر! تیری جانب میری پیٹھ ہی رہے گی +

زہیر ہجرت کر کے بن اسحٰق کے قبیلے میں چلا گیا اُس کی شہرت اُس سے برسوں بیشتر وہاں پہنچ چکی تھی، چنانچہ بنی اسحٰق نے گرمجوشی سے اُس کا استقبال کیا: اور اُسے اپنا میر منتخب کر لیا + زہیر کو یہ مرتبہ حاصل کر کے اسقدر خوشی حاصل نہ ہوئی تھی، جسقدر یہ خیال اُس کے لئے سرور بخش تھا کہ محارب اُس کی بلند اختری پر اپنی ڈاڑھی کے بال نوچ رہا ہوگا +

بس یہی واقعہ تھا، جس نے جدہ کی زندگی کی رو بدل ڈالی تھی + اسی عناد کی بنا پر اُس نے لڑکے کے رُوپ میں اور غیادر کے نام سے بچپن اور لڑکپن کا زمانہ گذار کر شباب کے مراحل میں قدم رکھا تھا +

وہ جانتی تھی، وہ لڑکی ہے، اور مرد کی جنس سے مختلف ہے، لیکن اس سے بھی زیادہ واضح طور پر اُس کو یہ معلوم تھا، کہ اُس کے باپ کی آبرو اُس کے بھیس سے وابستہ ہے اور وہ زندگی میں اُسی وقت تک غرور سے اپنا سر اُٹھا سکتا، اور ناز سے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر سکتا ہے، جبتک دُنیا کو اور صحرا کے لڑکے کو یہ حقیقت معلوم نہیں ہوتی، کہ اُس کا لڑکا اصل میں لڑکی ہے +

بچپن کی لوریوں اور کہانیوں میں ماں باپ کے گرم سانس نے اُس کے دماغ پر اس بات کی جلتی ہوئی مُہر ثبت کر دی تھی، کہ صحرا میں ایک لڑکا ہے، جو تیرا ابن عم ہے، اور وہ کہتا ہے، کہ شجاعت میں وہ یکتا ہے، اور اُس جیسا کسی باپ کا بیٹا نہیں ہو سکتا، اور لڑکیاں ادنیٰ چیز ہیں، اس لئے وہ کبھی کسی لڑکی سے قوت آزمائی نہ کریگا، اور انہیں اس قابل بھی نہ سمجھیگا، کہ وہ اُس کے اونٹ کی مہار تھام سکیں، اور اسی لئے وہ کہیگا کہ زہیر بھی ادنیٰ ہے کیونکہ وہ ایک لڑکی کا باپ ہے، اور وہ اُس کے باپ سے آنکھیں چار نہیں کر سکتا +

ان باتوں سے جدہ کا نازک دماغ تپ اُٹھتا اور رگوں میں خون دوڑنے لگتا، اُس کے لئے تمام دنیا معدوم ہوجاتی، اور اُس میں صرف ایک ارمان کا شعلہ بھڑکتا رہ جاتا، کہ کاش کسی دن وہ اُس لڑکے سے نبرد آزما ہو اور اُس کے گھمنڈ کو خاک میں ملا سکے +

اور اس مقصد کے لئے وہ اس بات کی اہمیت کو سمجھ چکی تھی، کہ اُس کا سب کے سامنے لڑکا بن کر رہنا ضروری ہے، کیونکہ اگر صحرا کے لڑکے کو کسی طرح معلوم ہوگیا، کہ وہ لڑکی ہے، تو وہ اُس سے قوت آزمائی کرنا اپنی کسر شان سمجھے گا، اور دوسرے لوگ بھی اُس کے اس خیال کو جائز قرار دینگے اور پھر صحرا کا لڑکا اور بھی زیادہ ہنسے گا، اور اور بھی زور سے کہیگا، کہ وہ شجاعت میں یکتا ہے، اور اُس جیسا کسی باپ کا بیٹا نہیں ہوسکتا +

اس طرح وہ انتقام اور خون اور قوت اور جنون کی دُنیا میں سانس لے لے کر جوان ہوئی تھی، اور اُسے کبھی معلوم نہ ہوسکا تھا، کہ اُس کے متناسب اور بھرے بھرے جسم کی دلفریبیاں ریشم کے رنگین اور باریک پیرہن میں کیسا عالم افروز شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں، اور معطر بستر پر صرف اپنی دوشیزگی کی سوچ میں نیم دراز ہو جانے اور سیاہ اور رقیق آنکھوں کو جھکا لینے سے کیسی قیامتیں برپا کرسکتی ہے اُس کو جھجکنے اور شرما جانے مان لینے اور پسینہ پسینہ ہوجانے کی تعلیم نہ دی گئی تھی + اُس کے باپ نے اُس کے شباب کو لوہے اور شعلوں میں ڈھالا تھا، اور کچل دینے اور مسل ڈالنے کا سبق اُس کو پڑھایا تھا، صحرا کے وسیع میدانوں میں اُس کا بیقرار گھوڑا ہنہناتا اور قبیلہ کے شمشیر آزماؤں کی تلواروں پر اُس کی تلوار سے چنگاریاں جھڑتیں، اور ہر روز جب وہ اپنے کارناموں میں کسی تازہ فتح کا اضافہ کرکے گھر لوٹتی، تو اُس کا باپ ایک فخریہ تبسم سے خود اُس کو گھوڑے پر سے اُتارتا اور مسکرا کر اُس کے کان میں کہتا "صحرا کا لڑکا اب چپ رہتا ہے اور غیادر کا نام سُن کر اس کی زبان اپنے الفاظ بھول جاتی ہے" +

اور پھر اُس کی خون آلود تلوار اُس سے لے لیتا، اور خود اُس پر سے خون پونچھا کرتا، اور اُسے اتنا چمکا دیتا کہ اُس کے دانتوں کا عکس اُس میں نظر آنے لگتا +

لیکن رفتہ رفتہ جب برس گذرتے گئے، اور کوئی ایسا عظیم نتیجہ نکلنے کا سامان نہ ہوا، جو زہیر کی محنت اور خرم و احتیاط کا کافی صلہ سمجھا جاسکتا، تو وہ تلوار پر سے خون پونچھتے پونچھتے کچھ سوچا کرتا اور سوچتے سوچتے آہیں بھرنے لگتا، اور اُس کے مضمحل ہاتھوں میں تلوار خون آلود ہی رہ جاتی +

بلاشبہ اُس کی بیٹی کا نام سموم کی طرح صحرا کے ہر حصے میں جا پہنچا ہے، غیادر کو شمشیر بکف دیکھ کر جری سے جری نوجوان کو اپنے بازو کمزور معلوم ہوتے ہیں، اور بزرگ، بے باک نوجوانوں کو سمجھایا کرتے ہیں، کہ دیکھنا غیادر کے قبیلے میں سنبھلکر قدم رکھنا، لیکن آخر یہ سب کیوں؟ محارب کے بیٹے خالد کی شجاعت و تہوّری غیادر کے سامنے ماند پڑ چکی ہے، اور زہیر کے خون نے اپنے آپ کو تمام دنیا کی نظروں میں افضل ثابت کردیا ہے، لیکن ایک لڑکی کے شباب کو مسخ کر ڈالنے کی کیا یہ کافی قیمت ہے؟ بھائیوں کے نفاق نے اتنی خطرناک صورت اختیار نہ کی تھی، کہ دونوں کے درمیان ایک ہی ماں کا جو دودھ لہریں مار رہا تھا، وہ سوکھ جاتا، اور غیادر کے کانوں میں انتقام کا پگھلا ہوا لوہا ڈال دیا جاتا + اتنے اہم نتیجہ کی اُمید شاید زہیر کو متفکر نہ کرسکتی، لیکن محض خالد کے مقابلے میں باپ کا سر اونچا رکھنا! خالد کے باپ کو یہ کہنے کا موقع نہ دینا کہ تو لڑکا پیدا نہ کرسکا، اس لئے تو کمتر ہے، کیا اتنی سی بات کے لئے

جس بیدردی سے بچپن کی شگفتگی کو جھلسا اور جوان نسوانیت کی باہیں مروڑی تھیں، وہ جائز اور مناسب تھی؟ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ جدّہ کی پیدائش محارب کے نزدیک کبھی سامانِ تضحیک نہ ہوتی، یا کیا یہ بات زیادہ قابلِ قدر نہ سمجھی جاتی، کہ وہ لڑکی ہی کے طور پر پروان چڑھتی، اور ایک لڑکی کے نام سے شجاعانِ عرب کا زہرہ آب ہوتا +

ابھی تک پھیکے اور بے رنگ اور ویران برس زہیر کے سینے میں آہیں ہی پیدا کر سکے تھے، لیکن جدّہ کے عین شباب میں جب ایک قاصد نے اُسے محارب کے انتقال کی خبر سنائی تو اُس کو اپنی حماقت کا احساس آنسوؤں کے ساتھ ہوا +

اب کسی اور زہیر کی نگاہیں گذشتہ افسوسناک مناقشے پر متاسف ہوئیں + محارب بھائی تھا اور دُنیا ناپائیدار تھی اور باہمی نفاق نیلے آسمان پر ایک گذرتے ہوئے بادل سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا، اور اتنی سی بات کے لئے یہ سب کچھ! وہ سمجھ نہ سکتا تھا، وہ کونسا زہیر تھا جو بھائی سے لڑ کر اُسے چھوڑ بیٹھا تھا، اور بھائی کے مقابلے میں اپنی ناک اونچی رکھنا چاہتا تھا +

وہ اُس پُرانے زہیر سے پوچھتا تھا، کہ اب اپنی بیٹی کو کیا کرے، جو نفاق کے اس خوابِ پریشان کو ایک زندہ حقیقت بنا کر اُس کے سامنے لاتی رہتی ہے، کیا جنونی زہیر کا نسیان متاسف زہیر کے لئے ہمیشہ جیتی جاگتی لعنت بنا رہیگا؟ اتنی جرأت نہ پڑتی تھی، کہ جدّہ کو بتا دے، صحرا کا لڑکا صرف بے درد باپ کا ایک قابلِ نفریں مذاق تھا، حمیت کو گوارا نہ تھا، کہ اس نوجوان کو جو کل تک مردوں کے ساتھ چشموں میں گُتھا رہتا، اور اپنے اعضا کی قوت سے اُن کے جسم کی تمتماہٹ کو کھینچ لیا کرتا تھا، یکلخت چلمن کے پیچھے بٹھا کر اعلان کر دے کہ وہ اُس کی بیٹی ہے +

راتوں کو شکن آلود بستر پر داڑھی کے بال نوچ نوچ کر اور خیمے کی تاریکی میں سے صحرا کی گھٹاٹوپ تاریکی کو گھور گھور کر وہ اِس کے سوا کچھ فیصلہ نہ کر سکا کہ کشتی کو صحرا میں چھوڑ دیا جائے، کہ وہ خود کسی معجزے سے پانی تک پہنچ جائے، یا پانی اُس تک آ جائے، اور اُس کی ہستی میں معنی پڑ جائیں +

اور عشق کے سوا دنیا میں اور کون سا معجزہ ہے، جو زندگیوں میں معنی ڈال سکے +

(۲)

محارب کے انتقال کے بعد جب خالد امیر قبیلہ بنا، اور اُسے اپنے باپ کی تعزیت میں زہیر کے آنسو بھی پونچھے، تو اپنے شہرۂ آفاق ابن عم عیادر کو دیکھنے کی آرزو اُس سے اَور ضبط نہ ہو سکی اور اُس نے اپنی ماں سے صلاح مشورہ کیا +

ماں نے کہا "زہیر چھوٹا تھا، مگر اُسے یہ سعادت نصیب نہ ہوئی، کہ بزرگ بھائی کی خاطر اپنی آن کو سلام کہہ دے اور آخر تیرا باپ اُس کے دیکھنے کی آرزو اپنے ساتھ لے گیا، زہیر تیرا بزرگ ہے، اور تیرے باپ کی روح خوش ہو گی، اگر تو اپنے بزرگوں سے وہی سلوک کرے، جس کا تیرا باپ اپنے چھوٹوں سے آرزومند تھا" +

چنانچہ خالد زرنگار اونٹوں پر سونا اور جواہرات اور ریشم اور شرابیں اور طرح طرح کے تحائف لاد کر قبیلہ بنی اسحٰق کی جانب چل کھڑا ہوا + اور اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لئے ایک قاصد کو پہلے سے روانہ کر دیا + جدّہ نے سُنا، کہ صحرا کا لڑکا اُس کے باپ سے ملنے آ رہا ہے، اور وہ اُچھل پڑی!

آخر کار اُس شخص کو دیکھنے کا موقع مل گیا، جس کے لمبے لمبے ناخنوں والے پنجے ہوش سنبھالنے پر اُس نے اپنے دماغ میں گڑے ہوئے پائے تھے، جس نے ان برسوں کی مدت میں اپنی گُتھلیاں کبھی اُس کے دل میں سے نہیں نکالی تھیں،

اور جو رات کے اندھیرے میں اپنی کرنجی آنکھوں سے اسکو گھورتا، اور اپنے موٹے موٹے ہونٹوں میں سے زرد دانت باہر نکال کر اُس پر ہنستا، اور رفتہ رفتہ اُس کے قریب آتا، اور پھر کبھی اُس کے اِس کان میں اور کبھی اُس کان میں متعفن سانس سے سرگوشیاں کیا کرتا تھا، اور کہتا تھا "تو لباس کے اندر لڑکی ہے، اور اگر تو مغلوب نہ ہوسکی، تو میں چلا چلا کر سب سے کہہ دونگا، اور تیرا پیرہن پھاڑ ڈالونگا"+

برسوں سے صحرا کا لڑکا سوتے جاگتے اُس کی توہین کر رہا تھا اور جدّہ خون کے گھونٹ پی پی کر خاموش رہ جاتی تھی، اور ہمیشہ اِس سے کہتی آئی تھی "تو ایک مرتبہ گوشت پوست میں میرے سامنے آجا!"

اور آخر آج اُس نے دعوتِ مقابلہ منظور کر لی تھی، اور اُس کے قبیلے میں آ رہا تھا۔ غصے سے اس کا چہرہ تمتما اُٹھا اور آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں، اور وہ اپنے باپ کے خیمہ کا پردہ پھاڑ کر اندر چلی گئی، اور بولی "مناۃ کی قسم! صحرا کا لڑکا میرے ہاتھ سے زندہ بچ کر نہ جانے پائیگا"۔

زہیر نے مجرم کی نظروں سے اپنی دختر کو دیکھا، اور آہستہ سے کہا "وہ ہمارا مہمان بن کر آرہا ہے"+

جدّہ نے گرج کر جواب دیا "خواہ مناۃ کے ٹیلے نار العذر سے جل کر راکھ ہوجائیں، اور زائر میرے عذر کی داستان سے آسمان کے گنبد میں سوراخ کرڈالیں، لیکن وہ یہاں سے اپنا سر اپنے کندھوں پر نہ لے جانے پائیگا"+

زہیر نے اپنی فکرمند نظریں اُٹھائیں اور بولا "غیادر کی شہرت اُسے یہاں کھینچکر لارہی ہے، اور وہ اُس کی قوّت کا اعتراف کرنے کو آرہا ہے"+

جدّہ نے ایک بے رس اور بھیانک قہقہہ لگایا اور باہر چلی گئی +

دوسرے دن خالد کا قافلہ تزک و احتشام سے قبیلۂ بنی اسحٰق کے قریب آن پہنچا، اور زہیر اپنے مرحوم بھائی کی نشانی کے استقبال کے لئے بستی سے باہر نکلا۔ مدّت کے بچھڑے چچا بھتیجے بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوئے۔ زہیر کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کے بھائی کی رُوح حسین ترین صورت اختیار کر کے اپنی محبّت کا حق طلب کرنے آئی ہے، اور خالد کو یہ معلوم ہوا کہ اُس کے باپ کی رُوح نے چچا کے جسم میں آکر اُس کے جھلسے ہوئے دل پر اپنا ٹھنڈا سایہ ڈال دیا ہے +

اور جب زہیر خالد کو لئے لئے اپنے خیمے کے قریب پہنچا، تو اُس نے دیکھا، کہ جدّہ مجروح خیرنی کی طرح غضبناک خیمے کے دروازے پر کھڑی ہے، اور اُس کے گلے میں آسیبوں پر فتحیاب ہونے کے منکوں کی مالا ہے، اور منکوں کا رنگ اُس کے چہرہ کی طرح سرخ ہے، اور وہ نہ اس کو تک رہی ہے اور نہ خالد کو بلکہ اُس کی نظریں اُن کے پیچھے انبوہ میں کسی کو ڈھونڈ رہی ہیں +

زہیر نے اُس کو دیکھا، اور ذرا سی دیر کو اُسے ایسا معلوم ہوا، جیسے وہ کسی اور کی بیٹی ہے، اور پھر اُس نے بڑھ کر جدّہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا "غیادر، اپنے ابن عم خالد سے ملاقات کر!" جدّہ نے چونک کر خالد کی طرف دیکھا، اور کچھ نہ دیکھ سکی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور پھر بھی نہ دیکھ سکی، اُس کے کانوں میں کسی چیز کے تڑخنے اور ٹوٹنے کی آوازیں آرہی تھیں، اور اُس کی آنکھوں میں صرف صحرا کے لڑکے کا بھوت تھا، جو قد میں بڑھ رہا تھا، اور پھیل رہا تھا، اور تمام دنیا کو اپنے آپ سے بھرے دیتا تھا +

جدّہ نے کہیں سے زہیر کو کہتے سُنا "تیری وجہ سے وہ آج اپنے مرحوم چچا کی آنکھیں روشن کر رہا ہے"+

اور پھر یک لخت وہ عظیم بھوت دنیا کی برداشت سے

باہر ہو کر پھٹ پڑا، اور اُس کی کرنجی آنکھیں اور زرد دانت بڑے بڑے لال ہونٹ، اور سانپ سی زبان اور بل کھائی انتڑیاں ایک خون آلود تاریک فضا میں بکھر گئیں، اور ایک نامعلوم تہ کی طرف چل دیں +

اور پھر اُسے زہیر کی آواز سنائی دی "دیکھ وہ تجھے کیسی احترام کی نظروں سے تک رہا ہے" +

اور اب تاریک فضا میں روشنی پھوٹ پڑی، اور ایک سفید براق چادر نے دنیا کو ڈھانپ لیا، اور اُس میں صرف وہ ملائم نظریں رہ گئیں، جو خالد کی آنکھوں کو روشن کر رہی تھیں، اور وہ مبہوت ہو کر اُس کو تکتی رہی اور تکتی رہی، اور بے حس و حرکت کھڑی رہی + زہیر خالد کو لیکر خیمے میں چلا گیا اور جدّہ کے کانوں میں ایک اُداس سائیں سائیں رہ گئی +

زہیر نے اپنے بھتیجے پر عنایات و توجہات کی بارش کر دی + اتنے اونٹ قربان کئے گئے کہ صحرا کی ریت پر خون کی کیچڑ ہو گئی، شراب کے خم کے خم خالی ہو گئے، علیحدگی کے گئے گذرے سالوں کا ردِّ عمل ہو رہا تھا، بھائی سے بھائی کے خلاف جو سلوک کیا تھا، اُس کے کفارہ کے طور پر اُس کی رُوح چاہتی تھی، کہ بھتیجے کے قدموں کی خاک بن کر رہ جائے، وہ ہر وقت اُسے اپنے پہلو میں رکھتا، بات بات پر سینے سے لگاتا، اور اُس کی پیشانی چوم لیتا تھا +

جدّہ خیمے کے پردے سرکا سرکا کر اندر جھانکتی، اور خالد کو اپنے باپ کے قریب ادب سے دوزانو بیٹھا ہوا دیکھتی، اُس کی باتوں پر کان لگاتی، اور اُسے یہ بیان کرتا ہوا سنتی، کہ گئے گذرے سالوں میں وہ اپنے عم اور ابن عم کو دیکھنے کیلئے کسقدر بیقرار رہا تھا + وہ گزشتہ مناقشہ پر مغموم اور موجودہ ملاقات پر خوش نظر آتا، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی آسکتے تھے اور اُس کے ہونٹوں پر تبسم بھی کھیل سکتا تھا! جدّہ نہ سمجھ سکتی تھی، کہ کس معجزہ نے اُسے بدل دیا، اتنا دردمند اور ایسا دلکش بنا ڈالا ہے +

صحرا کا لڑکا جدّہ کی راتوں میں سے نکل گیا تھا + وہ اب شاید ایک آسیب تھا، جو خالد کی کسی نیکی پر برافروختہ ہو کر اُس کے جسم میں حلول کر گیا تھا، اور اُس کی زبان سے اپنے ہذیانات کہلواتا تھا + وہ شاید زہیر کی بیٹی کے انتقام سے ڈر کر خالد کو مخلصی دے گیا تھا، اور اب لوٹ کر نہ آسکتا تھا، کیونکہ اس کے منتشر اعضا طبقاتِ زمین میں بڑے سڑ رہے تھے + اور اب اس کے تمام ہونے سے خالد پھر سب کو پاک اور شریف اور خوبصورت نظر آئے گا + اب جدّہ کی نیند سے بوجھل پلکوں پر روشن اور حسین خواب کا بنتے اور وہ اپنے دورانِ خون میں ایک گیت سنتی ہوئی میٹھی نیند سو جاتی +

جدّہ اپنے ابن عم سے بڑے تپاک سے ملاقات کرنے لگی + اُس کے مقابل بیٹھ کر اُس کو تکتی رہتی اور سوچتی، کہ جب صحرا کا لڑکا اس پر مسلط تھا، تو کیا تب بھی اس کی مسکراہٹ اتنی دلکش، اس کی آنکھیں اتنی روشن اور اس کی آواز ایسی شیریں تھی؟ اور کہیں اب تو اس کے دل میں یہ خیال چھپا چھپا موجود نہیں، کہ وہ شجاعت میں یکتا ہے، اور اُس جیسا کسی باپ کا بیٹا نہیں ہو سکتا، اور لڑکیاں تو اس قابل بھی نہیں، کہ اُسکے اونٹ کی مہار تھام سکیں + وہ چاہتی کہ اُس سے پوچھے، مگر اس ڈر سے نہ پوچھتی، کہ اگر یوں ہی ہوا تو؟ اُس نے اب تک جتنے نوجوان دیکھے تھے، خالد ان میں سب سے زیادہ پُراسرار معلوم ہوتا تھا، اور رہ رہ کر اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوتی کہ اُسے زیادہ تفصیل سے جان سکے، اُس کے دل کے راز سُن سکے، کسی طرح جھانک کر اُس کے دل کی گہرائیوں کو دیکھ لے +

چند دن کے بعد جب دونوں نوجوان گھوڑوں پر سوار ہو کر شکار کے لئے نکلے، تو اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی +

دونوں کو اس آرزو نے بے تاب کر رکھا تھا، کہ اپنے کمالات دوسرے کو دکھائیں، اور اُن کی داد دوسرے کی زبان سے سُنیں + اس جوشِ آرزو میں اُن کے چہرے گلابی تھے، اور جو کوئی اُنہیں دیکھتا تھا، اُس کی آنکھوں میں شفقتِ پدری کا سا اوج جھلکنے لگتا تھا +

چند ہی دن کے سیر شکار اور کھیل تماشوں کی شرکت نے اُنہیں ایک دوسرے کے کمالات کا قائل کر دیا، باہمی محبت سردیوں کی دھوپ بن کر اُن کے سینوں میں چلی گئی جس سے اُن کے دل روشن ہو گئے، اور وہ یہ سوچ سوچ کر حیران ہونے لگے، کہ وہ اب تک کیوں نہ سمجھ سکتے تھے کہ برادرانہ تعلقات اسقدر شیریں ہوتے ہیں + خالد بار بار کہتا، "مجھے ایسا بہادر اور شجاع ابن عم ملا ہے، کہ میں تمام عمر اُس کی صحبت میں بسر کر سکوں، تو اپنی قسمت کے ستارے کی سعادت سمجھوں" اور غیاد کہتا "میرا ابن عم ایسا ہے، کہ اُسکی غلامی پر ہر جری فخر کر سکتا ہے" +

اور پھر ایک دن ایسا آیا، کہ محبت کے ان باہمی تعلقات میں کسی سحر نے ایک انوکھا انقلاب پیدا کر دیا +

(۳)

ایک روز جب ضیافت کے بعد قبیلے کے بہادر اپنے اپنے زور بازو کے کمالات سے مہمانوں کو محظوظ کر رہے تھے، تو ایک بزرگ نے فرمائش کی، کہ صحرا کے دونوں عدیم المثال نوجوان اپنے کارناموں کی داستانوں کو اِن کے روبرو زندہ کر کے دکھائیں +

تجویز ہوتے ہی ہر طرف سے اصرار کا غُل اتنا بلند ہوا، کہ کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ خالد نے جدّہ کو دیکھا اور جدّہ نے خالد کو اور دونوں مُسکرا پڑے، اور یوں ایک دوستانہ مجادلہ پر اپنی آمادگی ظاہر کر دی +

خم دار تلواریں سونت کر وہ میدان میں اُتر آئے، اور ذرا سی دیر میں بجلی کے دو ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اپنی تابانی و درخشانی سے تماشائیوں کی آنکھیں خیرہ کرنے کو ایک دوسرے سے اُلجھ گئے، ان کی حرکت نظروں سے تیز تھی، ہر وار جانستاں سمجھا جاتا تھا، اور اُس کے نتیجے کے طور پر سہمی ہوئی نظریں جسموں پر ایک لال لکیر کو ڈھونڈنے لگتی تھیں، اور جب وہ نظر نہ آتی تھی، تو ہر طرف سے حیرت کے اظہار میں نعرے بلند ہوتے تھے +

تھوڑی دیر کے بعد حریفوں نے تلواریں پھینک دیں اور کشتی لڑنے کے لئے ہاتھ بڑھائے + اُن کی اُبھری ہوئی رگوں میں جاگتا ہوا خون اور پھولی ہوئی مچھلیوں میں دوڑتی ہوئی قوت نظر آ رہی تھی + بہت دیر تک ہاتھوں اور بازوؤں کی زور آزمائی کرتے اور مناسب داؤں کی تلاش کے بعد وہ یکلخت بڑھے اور اُنہوں نے ایک دوسرے کی گردن پر ہاتھ ڈال دئے + ان کے پاؤں زمین میں یوں گڑے ہوئے تھے، گویا انسانی طاقت کے اختیار میں نہیں، کہ انہیں اپنی جگہ سے ہلا سکے + بےبسی کے احساس سے غضبناک ہو کر اور یہ بھول کر کہ یہ دوستانہ مجادلہ ہے، جدّہ یکلخت خالد پر پل پڑی، اپنے ہاتھ اس کی کمر میں ڈال دیئے، اور اپنی انتہائی قوت اس کوشش میں صرف کرنے لگی، کہ اُس کی کمر کو جھکا کر اسے چاروں شانے چت گرا دے + خالد اُس کے اِس فوری جوش کی تاب نہ لا سکا، بہت کشمکش کی، کہ جدّہ کو جو ایک چڑھتے ہوئے دریا کی طرح اس پر چھائی جا رہی تھی، اپنے اوپر سے ہٹا دے، لیکن کامیاب نہ ہو سکا +

اور جب اِس کی کمر جھک کر جواب دینے کو تھی، تو اسے یکلخت یہ معلوم ہوا، کہ اُس کے حریف کے لوہے جیسے ہاتھ نرم پڑے جا رہے ہیں، اور اُس کی گردن پر آگ سا گرم سانس لگ رہا ہے + مُہلت ملتے ہی وہ سنبھل گیا، اور اُس نے جدّہ کے

چہرے پر نظر ڈالی، اُس کی سُرخ آنکھوں میں اُسے ایک ایسی حیرت انگیز روشنی نظر آئی، جسے وہ سمجھ نہ سکا، کہ کیا تھی + دوستی اور دشمنی اور پیار اور حیرت اپنی انتہائی پیچیدگی میں ایک سحر بن کر اُس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی + وہ کچھ نہ کر سکا، اُسکے بازو زور آزمائی کے ڈھنگ سے ایک بہت مختلف طریق پر اس سے چمٹ گئے +

اور لوگوں نے خوشی کا ایک نعرہ بلند کیا، اُن کے نزدیک دونوں بہادر کسی ناقابل فہم داؤں کے پڑنے سے ایک دوسرے کے قائل ہو کر بغلگیر ہو گئے تھے۔ ایسے حیرت انگیز مجادلہ کا اس سے زیادہ حیرت انگیز انجام اُنکے نزدیک اور کیا ہو سکتا تھا +

لیکن کُشتی کے بعد جدّہ جیسے ایک لذیذ جنون میں کھوئی گئی + نہ جانتی تھی، کہ روح کی گہرائیوں میں کونسا عظیم راز آنکھیں کھول رہا ہے، سیماب کی طرح بیقرار تھی، اور سمجھ نہ سکتی تھی کہ تسکین کیونکر پا سکتی ہے + لیٹ جاتی، اُٹھ بیٹھتی ٹہلتی، بھاگتی، مگر سکون کسی طرح نصیب نہ ہوتا + گھوڑے پر سوار ہوتی اور اُسے دوڑا کر سموم کے شعلوں میں گھس جاتی، بار بار اُسے مہمیز کرتی اور چیخ چیخ کر اُسے تیز کرنا چاہتی، گھوڑے کے پہلوؤں میں سے خون ٹپکنے لگتا اور وہ بیقرار ہو کر ہنہناتا + اس دکھ کی ہنہناہٹ میں اُسے ایک لوری سی سنائی دیتی، وہ اُسے اور ایذا پہنچاتی اور چاہتی کہ کرب کی ایک فلک شگاف ہنہناہٹ کے ساتھ وہ اُچھل کر ہوا پر دوڑنے لگے +

خون خون گھوڑا اصطبل میں جان توڑ رہا تھا، لیکن جدّہ اپنی تسکین سے بہت دُور تھی +

ماں کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتی، اور چاہتی کہ وہ اُس خوش آئند راز کو جو تمام کائنات میں دھڑک رہا تھا، چپکے سے اُس کے کان میں کہہ ڈالے +

خود پوچھنا چاہتی، پر نہ پوچھ سکتی اور چُپ چاپ اپنی گرم آنکھیں کھولتی اور بند کرتی رہتی +

اسلحہ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے اُس کو گھِن سی آتی تھی، سیر و شکار کے خیال سے دل زہر سا چھوڑنے لگتا، ملنے ملانے اور کسی سے گفتگو کرنے کے خیال سے بھی طبیعت کھیانی ہو جاتی، چُپ چاپ کسی کو کچھ کہے بغیر جلتی دوپہر میں نکلتا نکلا کے کسی تنہا اور ٹھنڈے کُنج میں چلی جاتی، وہاں کھجوروں کے سائے میں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیتی، اور اپنے حواس کو مہمل خیالات کی مبہم سی گونج میں گم کر دیتی + یوں ہی بیٹھی بیٹھی ایک طرف کو گر پڑتی، اپنے لباس کا بوطام کھول دیتی، اپنے تپتے ہوئے سینے اور جلتے ہوئے رخساروں کو ٹھنڈی ریت سے لگا دیتی، اور آنکھیں میچ لیتی +

اور ان عارضی استراحت کے لمحوں میں تخیّل کے پرّوں پر سوار ہو کر خالد اُس کی بند آنکھوں میں چلا آتا، اور نہ جانے اُس سے کیا چاہتا +

کُشتی کے زور سے وہ جدّہ کی نظروں میں جادوگر بن گیا تھا، اُس کی باہوں میں قوّت کے علاوہ ایک سحر تھا، جس سے انسان کی ہستی کی بنیادیں لرز سکتی ہیں، اُس کے سینے میں ایک جادو کا شعلہ تھا، جس کی لپٹ روئیں روئیں میں دیوانی تمناؤں کی آگ بھڑکا سکتی ہے + صحرا کا لڑکا نہ جانے اُس کو کیا چیز بنا کر چھوڑ گیا تھا +

خالد تمام دن اُسے تلاش کرتا، اور لوگوں سے پوچھتا کہ وہ کہاں ہے، اور پھر جہاں کا پتہ ملتا، وہاں جا کر اُسے ڈھونڈتا لیکن سراب کی طرح کہیں دُور ہی دُور اُس کا سراغ ملتا رہتا اور وہ اُس تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکتا + اس بے سود تعاقب

دُکھتے ہوئے جسم کو لیکر وہ تنہائی میں چُپ چاپ بیٹھ رہتا، اور خیالات میں غرق ہوجاتا، اور پھر ذراسی دیر بعد خیمے کے سرسراتے ہوئے پردوں میں سے وہ نظریں اس کو جھانکنے لگتیں جن سے کُشتی کے دوران میں جذّہ نے اپنے لوہے سے جسم کو پھول بناکر اس کو تکا تھا۔ وہ اپنے تخیّل کو انتہا تک پھیلاکر اُنکو سمجھنے اور معنی پہنانے کی کوشش کرتا، لیکن معنی جب ایک شکل اختیار کرنے کے قریب ہوتے تو بکھر جاتے جیسے اس کی مٹھی میں آجاتے اور جب وہ مٹھی کھول کر اُنہیں دیکھنا چاہتا، تو غائب پاتا تھا۔

اور جب وہ ان نظروں کو سمجھنے سے عاجز آجاتا، تو اس سرور میں کھویا جاتا جو کُشتی کے زور سے پہلے اس دنیا میں کبھی نہ آتا تھا۔ اُس روز غیادر کی باہوں میں کوئی ربانی شراب اُس کے ہونٹوں سے آلگی تھی، اور جب اسے پینے کی آرزو میں اُس نے مُنہ کھولا تھا، تو ہٹالی گئی تھی، اب اُس کے ایک گھونٹ کی پیاس میں وہ تڑپ رہا تھا، اور نہ جانتا تھا کہ کہاں سے پائے؟ اُسے یقین نہ تھا، کہ وہ غیادر کے پاس ہے، لیکن اگر غیادر کے سوا کسی اور کے پاس تھی، تو بے رنگ اور پھیکا پانی تھی۔

اور پھر وہ غیادر کی ضرورت محسوس کرتا، اور اُسے نہ پاتا تو اُس کے متعلق عجیب وغریب اور پُراسرار آرزوئیں اُس کے دل میں پھیلنے لگتیں، وہ ملے، تو یک لخت اُسے گود میں اُٹھالے وہ بیہوش ہوجائے، اور اُس کے سرو جسم کو اُٹھاکر بھاگ جائے اور ویران صحرا میں سے بھاگتا بھاگتا اُفق کے اُس پار سناٹے کی دنیا میں لے جائے، اور وہاں کسی تصویر سے نخلستان میں جہاں کھجور کے پتّوں میں سے چاند فطرت کی آنسو بھری آنکھ نظر آرہا ہو، اور چشمے کا پانی کسی سوچ میں تھم گیا ہو، اسے ریت پر رکھدے، اور جی بھر کے تکے اور لپٹ لپٹ کر اُس کے جسم کو گرمی پہنچائے، اور اسے ہوش میں لائے، اور جب وہ بیاختہ اپنی آنکھیں کھول دے تو اُس دھڑکتے ہوئے لمحے میں اُس کے دل کے راز کو سمجھ لے، اور ایک ناتواں بچّے کی طرح اُسکو اپنی گود میں بٹھاکر اُس کے کسی درد پر آہیں بھرے، یا ایک بے بس چیز کی طرح اپنے آپ کو اُس کی گود میں چھوڑ دے، اور اُسے اپنے اُوپر آنسو بہاتا ہوا دیکھے۔

اور اسی طرح جب وہ پُراسرار غیادر میں گم ہو چکا تھا، تو یکلخت اُس کی ماں کا پیغام آیا، کہ بعض قبائل کے حملہ آور ہونے کا ڈر ہے اور اس کی واپسی بہت ضروری ہے۔

بنی اسحٰق کے قبیلے میں خالد اپنی آخری رات بسر کر رہا تھا، تو جذہ کی آنکھوں سے نیند کھوئی گئی، اور کوئی طاقت اُسے خیمے سے باہر چاندنی رات کے سکوت میں کھینچ لائی۔ خالد کی رخصت ایک عجیب طرح اس کو متاثر کر رہی تھی، اب تک گمان بھی نہ گذرا تھا، کہ وہ ایک روز وہاں سے رخصت ہو جائے گا۔

وہ مبہم تمنائیں جو کسی طرح آپ سے آپ خالد کے دم سے وابستہ ہوگئی تھیں، ایک طوفان کی طرح اُمنڈ کر دل پر چھاگئیں، یہ معلوم ہونے لگا، کہ خالد کے ساتھ ہی دنیا کی روشنی اور زندگی کا رس بھی ہمیشہ کے لئے کھویا جا رہا ہے، چاہنے لگی، کہ جاکر خالد سے لپٹ جائے، اور اُس کو اپنی باہوں میں جکڑلے، اور پھر جُدا نہ ہو، اور صحرا کا لڑکا جو جادو اس کے سینے میں چھوڑ گیا ہے اس پر مٹ کر رہ جائے۔

وہ دوڑتی ہوئی خالد کے خیمے کے قریب آئی، مگر اُس کے دروازہ پر پہنچکر جیسے کسی ناقابل فہم خوف سے اُس کے پاؤں زمین میں گڑگئے، شاید صحرا کے لڑکے نے طبقات زمین میں سے اپنی باہوں کے پنجر بڑھاکر اُس کے پیروں میں بیڑیاں ڈالدی تھیں۔ بس وہ کھڑی رہ گئی، اور ہانپتی رہی، اور اپنے دل کی دھڑکن کو سُنتی رہی۔

نیند خالد کی آنکھوں سے بہت دور تھی وہ اپنے بستر پر

چُپ چاپ مٹیھارات کے ایک ایک لمحے کو اپنے خون میں سرکتا ہوا محسوس کر رہا تھا کہ اُسے باہر اُجلی ریت پر ایک سایہ نظر آیا، اور کسی کے ہانپنے کی آواز سُنائی دی + کسی غیبی طاقت نے اُس سے کہا، کہ باہر غیادر کھڑا ہے، اور سکرات کے عالم میں ہے۔ ایسا معلوم ہوا کہ عیسیٰ مل گیا، وہ لپک کر خیمے کے باہر نکل آیا +

چاندنی رات میں غیادر سر جھکائے کھڑا تھا +

خالد نے اُسے دیکھا اور بیتاب ہو کر اُس کے قریب جا پہنچا، لیکن نہ جدّہ نے سر اُٹھایا، اور نہ خالد اُس سے کچھ کہہ سکا، جو کچھ دل میں تھا، وہ اس نقرئی سکوت میں بھی تھا اتنا محترم تھا، کہ الفاظ کی تاب نہ لا سکتا تھا + خالد نے چُپ چاپ اپنے ہاتھ غیادر کے کندھے پر رکھ دیئے +

حدّہ لرز اُٹھی، اور پھر کسی معجزے نے اُس کا اِقبال اُتار کر پھینک دیا، اور اُس کے پیرہن کے بوطام کھول ڈالے +

خالد کو ایسا معلوم ہوا، جیسے اِس کے پاؤں کسی بلند پہاڑی پر سے یکلخت پھسل گئے ہوں، اور وہ بے اختیار ہو کر نیچے گرا جا رہا ہو، اور کسی چیز کا سہارا اُس کی پہنچ میں نہ ہو + اور جدّہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے دیکھ رہی تھی +

وہ چاندنی رات میں ایک نوشگفتہ کلی نظر آ رہی تھی، لیکن وہ کون تھی! اُس کا محبوب ابن عم غیادر اسے فریب دے کر یک لخت کہاں چلا گیا تھا! وہ نوجوان کہاں تھا، جو دُنیا کی تمام پیچیدہ اور پُر لطف اور اُجلی آرزوؤں کو اُس کے دل میں پیدا کر سکتا تھا، اور جس کے ساتھ رہنے سے وہ گہری نیند کا سا میٹھا اور پاک لطف حاصل کرتا تھا جس کے متعلق وہ اتنا کچھ سوچتا اور حیران ہوتا، اور جس سے بہت کچھ سوچنے کی آرزو رکھتا تھا وہ کیا ہے؟ اس سے مختلف ہستی اور دوسری جنس کی چیز ہے؟ اس کی شہ زوری میں بے بسی اور قوت میں نزاکت کیا صرف نسوانیت ہی کی خصوصیات تھیں، وہ محض عورت ہے؟

اس نے مایوسی سے "غیادر! غیادر!" پکارا! اپنی بانہہ آنکھوں پر رکھ لی، اور خیمے میں لوٹ گیا +

جدّہ نے اُس کی پیٹھ دیکھی تو چیخ مار کر کہا "صحرا کا لڑکا! صحرا کا لڑکا!

اور سیمیں صحرا پر اپنا شباب ڈھانپتی ہوئی دیوانوں کی طرح ایک طرف نکل گئی +

سیّد امتیاز علی تاج

شہیدِ جفا

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

(از جناب ایم اسلم صاحب)

(خاص برائے نیرنگ خیال)

پٹھان کوٹ سے کئی میل کی مسافت پر وہ خوبصورت پہاڑ ہے جسے "چمبہ" کہتے ہیں۔ "چمبہ" سے بیس پچیس میل کے فاصلہ پر ایک کوہستانی علاقہ ہے۔ اس کا نام "ٹیسہ" ہے۔ "ٹیسہ" ایک بہت سرد جگہ ہے لیکن اس سے بھی سرد کوہستان "پانگی" ہے اور یہی "پانگی" اس داستان کی جائے وقوع ہے۔

"ٹیسہ" سے آگے "پانگی" کا راستہ نکلتا ہے۔ راستہ بہت دشوار گذار ہے۔ اور اس کی آخری منزل تو خاص کر بہت کٹھن ہے۔ فلک نما سنگلاخ پہاڑوں کے درمیان ایک چھوٹی سی گھاٹی ہے۔ یہ گھاٹی ہر موسم میں برف کا ایک خوبصورت لیکن خوفناک طور پر پھیلنے والا تختہ بنی رہتی ہے۔ اس گھاٹی کے دامن میں دہقانوں کی چند ایک جھونپڑیاں ہیں۔ جب کوئی مسافر "پانگی" میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ تو یہ لوگ زور زور سے ایک نقارہ بجاتے ہیں۔ اس کی آواز سے برفانی راستہ کے دوسری جانب رہنے والے کوہستانیوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی مسافر اوپر آنا چاہتا ہے۔

اوپر والے گھاس پھوس کی بنی ہوئی چوکی جس کے دونوں سروں پر مضبوط رسے بندھے ہوتے ہیں نیچے لٹکا دیتے ہیں۔ مسافر جب اس چوکی پر بیٹھ جاتا ہے۔ تو اس کو ایک بہت ترش پھل منہ میں رکھنے کے لئے دیدیا جاتا ہے۔ یہ احتیاط اس لئے کی جاتی ہے۔ کہ اس برفانی راستہ کے درمیان ایک خاص قسم کی خوشبو ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جس کے اثر سے اوپر جانے والے پر غنودگی سے طاری ہو جاتی ہے لیکن اس ترش پھل کے اثر سے وہ اس غنودگی یا مدہوشی سے محفوظ رہتا ہے۔

مسافر کے "ٹوکرے" میں بیٹھ جانے کے بعد پھر ایک بار نقارہ پر چوب پڑتی ہے اور اوپر والے اسے کھینچ لیتے ہیں۔ "پانگی" میں داخل ہو کر قدرت کے کھیل نظر آتے ہیں اِدھر اُدھر "ابرق" کے پہاڑ ہیں۔ اور انکی دراڑوں سے پانی کے قطرے موتیوں کی طرح لڑھک لڑھک کر نیچے گرتے رہتے ہیں۔ یہ پانی صحت کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ ہر گھاٹی اور ہر وادی رشکِ گلزار نظر آتی ہے۔ اور ؎

جس شجر کو دیکھئے تنتا ہے اپنے حسن پر
پھول جو دیکھو جوانی پر ہے اترایا ہوا

نسیم عطر بیز کے جھونکے ہر وقت اور ہر گھڑی مشامِ جان کو تازہ کرتے ہیں جا بجا بیٹھنے کے لئے مرمری اور سرمگیں رنگ کے صاف اور ستھرے پتھر موجود ہیں۔ انہی رنگ برنگ پتھروں کے دامن میں صاف اور میٹھے سرد پانی کے چشمے سیماب اگلتے نظر آتے ہیں۔ آبشاروں کا سرور ایک حالت وجدانی پیدا کرتا ہے۔ بڑے بڑے اشجار جب قدرت کی اعجاز نمائی پر جھوم جھوم کر صاد کرتے ہیں تو پتوں کی آواز ایسا دلکش زیر و بم پیدا کرتی ہے کہ انسان ایک عجیب مسرت محسوس کرتا ہے۔

"کوہستان پانگی" میں یہاں وہاں دہقانوں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں ہیں یا ننھی ننھی کھیتیاں جو پہاڑوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھلوانوں کو سنگ و خشت سے صاف کر کے بنائی گئیں ہیں۔ دہقان تو ٹھگنے قد کے بہ وضع ہیں لیکن دہقان زادیاں بلا مبالغہ کسی پرستان کی پریاں معلوم ہوتی ہیں۔ انسان جب انکے حسن کی دل آویزی۔ نرگسی آنکھیں۔ گفتار کا ترنم اور محشر خیز رفتار کو دیکھتا ہے۔ تو دل ہزار تمناؤں کا آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ان غزالوں کو دیکھ دیکھ کر نہ آنکھیں سیر ہوتی ہیں اور نہ جی بھرتا ہے۔

سن ۱۸۹۰ء کا ذکر ہے کہ "شاہد" نام ایک بانکا ترچھا جوان۔ جو اُس وادی میں پلکر جوان ہوا تھا۔ جسے پانچ دریاؤں کا پانی سیراب کرتا ہے۔ اپنے معزز عمدہ کی معرفت سے اکتا کر چند ماہ کی رخصت لے کر "چمبہ" کی سیر کرتا ہوا کوہستان "پانگی" میں آنکلا۔ وہ حسبِ دستور ایک دہقان کا مہمان ہوا۔ یہاں

کی مہماں نوازی اور میزبانی میں ہمارے ہاں کے تکلفات کا دخل نہیں۔ مہمان جب تک چاہے میزبان کے پاس قیام رکھ سکتا ہے۔ اسے صرف اپنے خورد و نوش کے اخراجات ادا کرنے ہوتے ہیں اور رخصت کے وقت اپنے میزبان کو تھوڑی سی نقدی بطور یادگار نذر کرنی ہوتی ہے۔

"شاہد" ایک تعلیمیافتہ اور روشن دماغ آدمی تھا۔ ایسی رومان خیز فضا میں اس کے دل میں ہر گھڑی نئی تمنائیں۔ نئے جذبات اور نئی امنگیں پیدا ہوتی تھیں۔ قدرتی مناظر اور حسن کی دلفریبیاں اس جذبہ میں اور بھی حرارت پیدا کرتی تھیں۔

لیکن کساں کی کٹیا میں آتے ہی اس کی تمام مسکراہٹ کافور ہو جاتی یہاں کا سحر فریب نظارہ "شاہد" کو کسی دوسرے عالم میں پہنچا دیتا تھا۔ وہ ایک آہ سرد بھر کر سر جھکا لیتا اور خاموش ہو جاتا۔

"شاہد" کے میزباں کی بیٹی "رتنا" اپنے حسن و جمال کی وجہ سے تمام کوہستان میں مشہور تھی۔ حسن جہانسوز ماہتاب کو شرماتا تھا۔ وہ کوہستان کی وادیوں میں ادھر ادھر پھولوں میں چلتی پھرتی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ گویا حور جنت اس پرستان کی سیر کو آسمان سے اُتر آئی ہے۔ "رتنا" ہر روز رات کے وقت اپنے گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر کسی کھلی جگہ میں جھومر ڈالتی اور اس وقت وہ ایسی دلفریب معلوم ہوتی جیسے تاروں بھری رات میں چاند۔

"شاہد" "رتنا" کو اور "رتنا" "شاہد" کو دیکھا کرتی تھی گو "رتنا" یوں تو کام کاج میں "شاہد" کا ہاتھ بٹاتی۔ لیکن اگر تنہائی میں سامنا ہو جاتا تو دونوں کے لب پر مہر سکوت لگ جاتی۔

"یاں دل میں خیال اور وہاں مدِ نظر اور"

کا معاملہ تھا۔

آخر ایک روز یہ مہر سکوت ٹوٹ کر رہی۔ "شاہد" یا تو سارا سارا دن کمرہ کے اندر ہی پڑا رہتا تھا۔ یا اس چشمہ کے پاس جا بیٹھتا جہاں "رتنا" عموماً پانی بھرنے جایا کرتی تھی۔

ایک روز "رتنا" چشمہ پر گاگر صاف کر رہی تھی اور "شاہد" پاس ہی ایک چٹان پر بیٹھا ہوا خیالات میں غرق تھا۔

"آج باہر نہیں گئے"؟ "رتنا" نے گاگر صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ آج تو نہیں گیا" "شاہد" نے "رتنا" کی طرف دیکھ کر کہا "کوئی ساتھی ہو تو سیر کا لطف بھی آئے"۔

"آج تو گرد ھی میں میلا ہے"

"تم جاؤ گی"

"ہاں میں تو جاؤں گی" "رتنا" نے پانی بھرتے ہوئے کہا "تم بھی چلو گے"؟

"کیوں نہیں۔ اگر تم ساتھ لے چلو"

"رتنا" مسکراتی ہوئی گاگر سر پر اٹھائے گھر کی طرف روانہ ہوئی تو "شاہد" بھی ساتھ ہو لیا۔

یہ کوہستانی دوشیزہ پہلے ہی "شاہد" کو دل نذر کر چکی تھی لیکن اظہار عشق کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ مگر آج بیاض حسن کے قرطاس پر پہلی بار مہر محبت چسپاں کر دی گئی۔ اب دونوں ایک دوسرے کی الفت میں سرشار نظر آتے تھے۔ "شاہد" جسم تھا تو "رتنا" جان تھی۔ "شاہد" پھول تھا تو "رتنا" بو تھی۔

طویل تعطیلات کا زمانہ اب اختتام کو آ پہنچا تھا لیکن "شاہد" نے کبھی واپس جانے کا "رتنا" سے ذکر نہ کیا۔ آخر جب گنتی کے دن باقی رہ گئے۔ تو وہ ایک روز "رتنا" سے بولا:۔

"رتنا! میری رخصت ختم ہونے کو ہے.... جدائی کی گھڑی سر پر منڈلا رہی ہے"

"تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو نا!" "رتنا" نے بھولے پن سے کہا۔

"تمہیں بھی ساتھ لے چلوں"؟ "شاہد" نے حیران ہو کر "رتنا" کی طرف دیکھا۔

"ہاں مجھے بھی ساتھ لے چلو.... کیوں مجھے ساتھ لے چلنے میں کچھ ہرج ہے"؟

"نہیں نہیں۔ ہرج تو کچھ نہیں۔ لیکن "رتنا" تم سرد ملک کی رہنے والی ہو۔ میرے وطن کی گرمی کی تاب نہ لا سکو گی یہ پھول جیسا پیارا مکھڑا دو دن میں کملا جائے گا"۔

"بلا سے" "رتنا" نے "شاہد" کا ہاتھ دبا کر کہا "اگر تم گرمی برداشت کر سکتے ہو تو میں کیا مر جاؤں گی۔ جہاں تم وہاں تمہاری "رتنا"۔

"شاہد یہ سنکر خاموش ہوگیا اور پھر بولا:۔
"رتنا" دل تو نہیں چاہتا کہ تمہیں چھوڑ کر جاؤں لیکن اس وقت واقعات ہی کچھ ایسے ہیں"۔
"تم مجھے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔ شاید تمہاری بیوی ہوگی"۔ رتنا نے یہ الفاظ بھرائی ہوئی آواز سے کہے
"مگر دوسرے سال میں بہت جلد ہی آجاؤں گا۔۔۔
پھر میں ہوں گا اور میری "رتنا" ہوگی"۔ رتنا کے بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے۔
"اور تم کو ساتھ لے چلنے کا بندوبست بھی کرتا آؤں گا۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ میری تبدیلی کسی سرد مقام پر ہوجائے۔۔۔۔۔ اور گرمیوں کے موسم میں تو ہم یہاں ہی آجایا کریں گے"۔
"تو کیا اس الفت۔ اس پیار۔۔۔۔۔ کا یہی انجام تھا کیا تمہاری سب باتیں۔۔۔۔"
رتنا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔
"سچ جانو رتنا تمہاری جدائی میرے لئے بہت شاق ہوگی۔ تمہاری یاد مجھے ایک پل بھی چین نہ لینے دیگی"
"تو پھر مجھے ساتھ ہی لے چلو۔ دیکھو میں لونڈی بنکر تمہاری خدمت کروں گی۔۔۔۔"
"نہیں اس وقت نہیں رتنا"

آخر واپسی کا دن آپہنچا۔ سفر کا سامان سب تیار ہوچکا تھا شاہد اپنے میزباں سے رخصت ہوکر برفانی راستہ کی طرف جب چلا تو رتنا الوداع کہنے ساتھ آئی۔ اس جگہ پہنچکر پہلے شاہد کا اسباب نیچے پہنچادیا گیا۔ اب شاہد کی باری تھی۔ رخصت اور جدائی کی گھڑی "رتنا" کے لئے قیامت سے کم نہ تھی۔ اس حسینہ کی آنکھیں روتے روتے سوج گئیں تھیں۔ شاہد راستہ کے پاس ہی ایک پتھر پر کھڑا تھا اور "رتنا" ایک چٹان پر بیٹھی رو رہی تھی
"رتنا" میں پھر تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد واپس آؤں گا۔ اور اگر خیال کرو تو چھ سات ماہ ہیں کس گنتی کے۔ جس طرح میں یہ قلیل وقت تمہیں پھر ایک بار دیکھنے کی تمنا میں بسر کر دوں گا تو کیا تم مجھے ملنے کی آرزو میں بسر نہ کروگی۔۔۔۔
دیکھو ذرا میری جانب دیکھو تو۔۔۔!

لیکن "رتنا" کا یہ حال تھا کہ آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔
"رتنا۔ رتنا۔ تم اس طرح روتے روتے مرجاؤگی"
"اور میرا خون تمہارے سر ہوگا"
"لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ضرور اگلے سال واپس آوں گا۔ رتنا میری طرف دیکھو اور بتلاؤ کیا تم مجھ کو فریبی اور مکار سمجھتی ہو۔ بولو۔ رتنا بولو"۔
"اچھا قول دیتے ہو؟" رتنا نے دوپٹہ سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔
"ہاں قول دیتا ہوں۔۔۔ قسم کھاتا ہوں"
"اچھا۔۔۔۔ اچھا۔۔۔"
شاہد۔ "تو خدا کے حوالے"
اور پھر چوکی پر جھکی ایک رسی رتنا نے پکڑلی تھی۔ بیٹھ کر اور مسکراکر۔
"دیکھو مجھے بھول نہ جانا"
رتنا۔ "جانے تو ہو مگر سن لو کہ اگر تم حسب وعدہ واپس نہ آئے تو رتنا کو زندہ نہ پاؤگے"۔۔۔۔۔ رسی کو ایک دو بار ہلا کر "جاؤ بھگوان کو سونپا" اور پھر رسی ہاتھ سے چھوڑدی۔

شاہد کے چلے جانے بعد غریب "رتنا" سخت پریشان اور اداس رہنے لگی۔ اسے شاہد کی ہر ایک چیز سے محبت تھی۔ جس کمرہ میں شاہد رہتا تھا۔ وہ پہروں اس کمرے میں بیٹھی شاہد کے تصور سے محبت اور پیار کرتی۔ جن چٹانوں اور پتھروں پر بیٹھ کر وہ "شاہد" کی باتیں سنا کرتی تھی۔ اس کے چلے جانے بعد وہ ہر روز انہی پتھروں اور چٹانوں کے پاس جاکر اپنے "شاہد" کی باتیں کیا کرتی۔ اور چشموں اور آبشاروں کے کنارے بیٹھ کر شاہد کی یاد میں آنسو بہاتی۔
چشموں کی شورشوں میں اسے شاہد کی آواز کا ترنم سنائی دیتا تھا۔
سردی کا موسم ختم ہوگیا اور موسم بہار کی تروتازگی ہر چیز سے نمودار ہونے لگی۔ اب "رتنا" کی ڈھارس بندھنے لگی۔ وہ بڑی بیتابی کے ساتھ شگوفوں کے ختم ہونے کے وقت کا انتظار کرنے لگی۔ وہ ہر روز صبح ہوتے ہی اس برفانی راستہ پر جاکر کھڑی ہوجاتی اور ہر روز بے نیل و مرام واپس لوٹتی۔

اسی بیم و یاس کی حالت میں وہ پیارا موسم بھی آ پہنچا جب اس کا "شاہد" کوہستان پانگی میں آیا تھا۔ "رتنا" کو "شاہد" سے ملنے کی ہمت آس تھی۔ لیکن اس کا گل مراد کبھی شگفتہ نہ ہوا۔ اب وہ سارا سارا دن اس برفانی راستہ پر بیٹھی رہتی۔ اور گاہے گاہے بڑی سوز بھری آواز میں۔ ع

"پیا کے ملنے کی آس ری سکھی"

آہستہ آہستہ گاتی رہتی۔

آخر وہ تمام موسم جس میں لوگ کوہستانوں کی سیر و سیاحت سے آتے ہیں "رتنا" نے اسی طرح گذار دیا۔ بہت آئے اور سیر و سیاحت کے بعد واپس چلے گئے۔ لیکن "شاہد" نہ آیا۔

موسم کے ختم ہوتے ہی "رتنا" مایوس ہو گئی اور اس کی صحت بگڑنے لگی۔ وہ گھر میں بیٹھی بیٹھی خون دل پیتی اور لخت جگر کھاتی۔ آخر وہ تپ جدائی میں گھل گھل کر بہت کمزور ہو گئی سارا سارا دن چارپائی پر پڑی رویا کرتی۔ گاہے گاہے ہمت کر کے اٹھتی تو اسی راستہ پر جدھر سے "شاہد" کے آنے کی امید تھی جا بیٹھتی۔

گھر والے اسے دیوانی سمجھتے تھے اور اسی لئے روک ٹوک نہ کرتے۔

سردی جوبن پر تھی۔ اور "رتنا" کو اب بخار آنے لگا تھا ایک روز کچھ رات گئی وہ چپ چاپ گھر سے نکلی۔ چاندنی رات تھی اور ہوا بالکل بند تھی۔ کئی دنوں سے برف بھی نہیں پڑی تھی "رتنا" پتھروں اور چٹانوں کا آسرا لیتی ہوئی برفانی راستہ کی طرف چلی۔ ضعف اور کمزوری کے باعث وہ دو چار قدم چل کر ستانے کے لئے بیٹھ جاتی۔ اسی طرح گرتی پڑتی بصد ہزار مصیبت منزل مقصود پر جا پہنچی۔ ستارے جھلملا رہے تھے۔ مطلع بالکل صاف تھا اور مہتابی کرنوں والا چاند برفانی چوٹیوں کے اوپر بیٹھا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔

"رتنا" نے دونوں ہاتھ ٹیک کر اس جگہ کو جہاں جانے سے پیشتر شاہد کھڑا تھا بھک کر کئی بار چوما۔ اس طرح بھی جب طبیعت کو قرار حاصل نہ ہوا۔ تو پھر کمزور اور ناتواں "رتنا" اس زمین پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھی رو رو کر جی کی بھڑاس نکالنے لگی۔

برفباری شروع ہو چکی تھی۔ لیکن "رتنا" خیال "شاہد" میں دنیا و مافیہا سے بے خبر بیٹھی تھی۔ وہ ہمت کر کے پھر ایک بار اٹھی اور برفانی راستہ کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔ وہ ایک بار اپنے محبوب کا نام لے کر مسکرائی۔ اور پھر ایک پتھر سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر لیں برف روئی کے پیہم پیہم گالوں کی طرح پڑنے لگی لیکن "رتنا" نے ایک بار بھی جنبش نہ کی۔ آخر اسی طرح بیٹھے بیٹھے وہ برف کی آغوش میں ہمیشہ کے لئے سو گئی۔

ایم اسلم

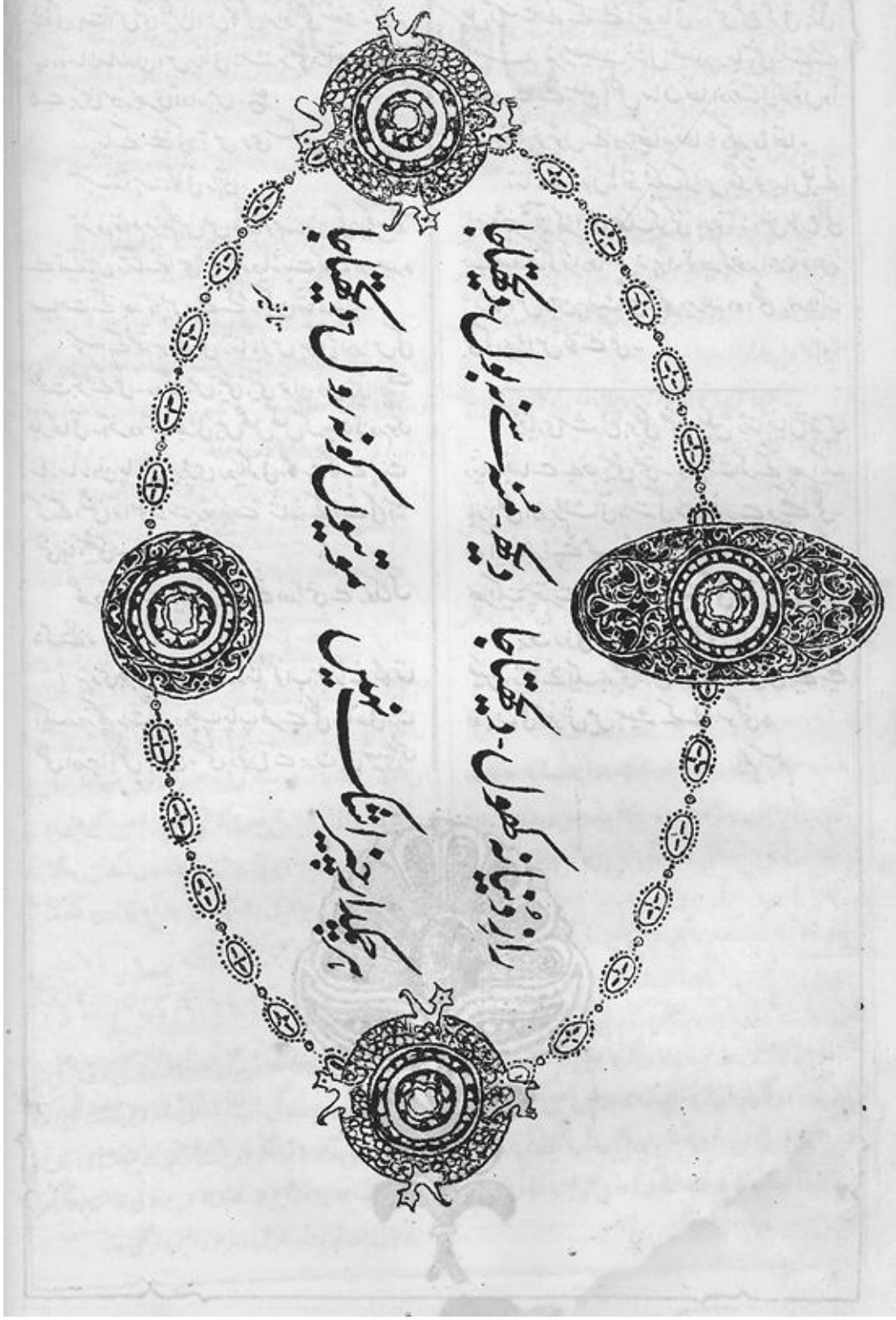

رازِ دُنیا نہ کھول۔ دیکھتا جا دیکھ۔ مُنہ سے نہ بول۔ دیکھتا جا

ہر چمکدار چیز اشک نہیں موتیوں کو نہ رول۔ دیکھتا جا

تاثیر

اکسیر گر کا کمال

(افسانہ)

ایڈیٹر کے قلم سے

پرانے زمانہ کی بات ہے، اُس پرانے زمانہ کی جب نوجوان تیرِ نظر کے گھائل ہوتے۔ تو، کپڑے پھاڑ کر دیوانہ وار تلاش محبوب میں گھر سے نکل جاتے تھے، اُسی عہد کا ایک واقعہ ہے۔ شاید ڈیڑھ دوسو سال کا عرصہ گذرا ہوگا، مراقش کے ایک سر برآوردہ قبیلہ کے امیر کا بیٹا ایک ہسپانوی خاتون کے عشق میں بےچین و مضطرب ہو کر بے برگ و گیاہ پہاڑیوں چٹیل میدانوں، اور تپتے ہوئے ریگستانوں میں سرگرداں تھا صبح سے لے کر شام تک منہ اٹھائے جدھر چاہتا نکل جاتا، تمازت آفتاب سے ریت انگاروں کی طرح دہکنے لگتی، تو کسی ٹنڈ منڈ درخت کے تلے کھڑا ہو کر سستانے لگتا اُس وقت ریت کے ذرّوں میں اُسے پیاری ایلی نورا کا سفید چہرہ ناچتا ہوا دکھائی دیتا، اُس پر از سر نو وحشت طاری ہو جاتی اور اُفتاں و خیزاں کسی دوسری سمت روانہ ہو جاتا، کبھی لق و دق صحرا کے وسط میں کوئی نخلستان نظر پڑتا تو پانی کے ٹھنڈے چشموں کے کنارے بیٹھ کر اُس کی یاد میں آہیں بھرتا، رات کو پشت کے بل لیٹ کر اختر شماری کرتا، کبھی کسی چھوٹے سے گاؤں میں جا نکلتا جہاں کے لوگ اُسے مسافر سمجھ کر کچھ کھلا پلا دیتے یا خود رو جھاڑیوں کے بیر قوتِ لا یموت کا ذریعہ بنتے، الغرض اس آوارہ گردی اور صحرا نوردی میں اُسے کسی پہلو چین نہ تھا +

اس نوجوان کا نام قاسم تھا، ۲۰ سال کی عمر ہوگی، جوان اُمنگوں بھرا دل، بلند قامت، چوڑا چکلا سینہ، کشادہ پیشانی، خط و خال مصوّری کا انتہائی کمال، لیکن رنگت ایل بسیاہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کے اس بہترین مجسمہ پر کسی نے سیاہ کھال چپکا دی ہو، یا روغن قاز مل دیا ہو، لیکن شمالی افریقہ میں وہ پھر بھی بہت حسین تھا۔ ایک قبیلہ کے امیر کا اکلوتا بیٹا، لیکن حضرتِ عشق کے ہاتھوں نالاں و پریشان +

ایک شام آندھی زور شور سے چل رہی تھی، ایسی آندھی جو شمالی افریقہ میں مرگ و ہلاکت پھیلاتی ہے، کالی کالی پہاڑیوں پر گرد و غبار کے سیاہ سیاہ بادل اُمڈے چلے آتے تھے، ریت کے ٹیلے کسی آسمانی جادوگر کے حکم سے زمین سے لیکر آسمان تک ٹھوس پہاڑ بن گئے تھے۔ قاسم اُس وقت ایک غار میں بیٹھا ایلی نورا کے تصوّر میں غرق تھا، سائیں سائیں کی آواز کے سوا اور کچھ سنائی نہ دیتا تھا، ایسا معلوم ہوتا کہ غار کے ساتھ پتھر ٹکرا رہے ہیں، تھوڑی دیر بعد قاسم نے اپنی پشت پر آگ کے شعلے محسوس ہوئے اُس نے پھر کر دیکھا تو اُسے آگ جلتی دکھائی دی، وہ فوراً اُس کی طرف لپکا، پندرہ بیس گز اندر جانے کے بعد وہ غار کی آرائش دیکھ کر سخت متعجب ہوا، پہاڑ کی دیوار کاٹ کاٹ کر کئی کمرے بنائے گئے تھے یہ کمرے ہر قسم کے ضروری سامان سے مزیّن تھے، ایک کمرہ میں صرف دواؤں کی شیشیاں، اور دیگر آلات کیمیاوی رکھے تھے، بڑے کمرہ کے وسط میں آگ جل رہی تھی، جس پر کوئی دوا برتن میں رکھی تھی، جس سے ایک شیشہ کی نالی دوسرے برتن سے وصل تھی، عرق کے سفید سفید قطرے شیشے کی نالی

سے اُمڈے چلے آتے تھے +

قاسم نے اِدھر اُدھر دیکھا، مگر کوئی متنفس نظر نہ آیا، اُس نے زور زور سے آواز دی، لیکن آندھی کے شور میں صدائے بازگشت کے سوا اور کچھ نہ تھا +

بالآخر وہ اطمینان کے ساتھ دوا کے پاس بیٹھ گیا، اور جب بڑی بڑی لکڑیاں جو خدا جانے کتنے گھنٹوں سے جل رہی تھیں بجھنے لگیں تو اُس نے اور موٹی موٹی لکڑیاں چُن دیں، اور آگ کی اُس تیزی کو جاری رکھا جس سے عرق ٹپک رہا تھا، قاسم کا خیال تھا کہ اس غار کا مالک کسی ضرورت کی وجہ سے باہر گیا ہوگا، اور آندھی کے طوفان میں پھنسکر کسی محفوظ جگہ میں بیٹھا مطلع صاف ہونے کا انتظار کر رہا ہوگا، اُس نے محض دل بہلانے کے لئے آگ جلانے کے شغل کو جاری رکھا +

دو تین گھنٹے اور گذر گئے لیکن کوئی شخص نہ آیا، اور نہ آندھی کا طوفان ختم ہوا، البتہ رات کے بارہ ایک بجے کے قریب یہ طوفان تھما تو قاسم نے غار سے باہر نکلکر دیکھا مطلع صاف تھا، اور آسمان از سرِ نو مدھم ستاروں کی جھلاہٹ سے زندہ معلوم ہو رہا تھا، وہ اندر واپس جانے ہی کو تھا کہ اُس نے ایک شخص کو غار کی طرف آتے دیکھا، جب وہ قریب پہنچا تو اُس کی کمر کی خمیدگی، چہرے کی جھرّیوں اور بالوں کی سفیدی سے قاسم نے اندازہ لگالیا کہ اس غار کا مالک یقیناً یہی بزرگ ہے +

بوڑھا بہت ہی تھکا ماندہ معلوم ہوتا تھا، اُس کا عصا پتھریلی چٹانوں پر بہک بہک کر پڑ رہا تھا، وہ مایوسی اور بے بسی کا مرقع بنا ہوا تھا +

قاسم نے دوڑکر اُس بزرگ کے قدموں کو بوسہ دیا بوڑھا گھبراکر پیچھے ہٹ گیا، اُس نے جلدی سے پوچھا:-

تم کون ہو! غار میں تھے!! اور میری دوا!!!

قاسم نے کہا، ہاں میں غار میں تھا، اس خوفناک طوفان میں اس سے بہتر محفوظ جگہ اور کہاں مل سکتی تھی +

بوڑھے نے پھر چلّا کر کہا اور میری دوا!

قاسم نے کہا وہ آگ پر پک رہی ہے، اور اُس میں سے شبنم کے سے پانی کے قطرے نکل رہے ہیں +

بوڑھے نے اُس کے کندھے کو زور سے دباکر کہا۔

ہاں وہی، وہی +

قاسم نے کہا میں آگ جلاتا رہا ہوں اور عرق نکل رہا ہے،

بوڑھا جوشِ مسرّت سے ناچنے لگا، اُس نے تشکر و اطمینان بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا، اُس نے قاسم کو گلے لگالیا اور اُس کی پیشانی پر بوسوں کا تار باندھ دیا، لیکن مسرّت شک و شبہ کے احساس نے کمدّر کر دی، وہ قاسم کو چھوڑ کر جلدی جلدی دوا کی طرف لپکا اور جب اُس نے دیکھا کہ آگ جل رہی ہے اور عرق موتیوں کی مالا کی طرح لڑھکتا ہوا آبگینہ میں جمع ہو رہا ہے تو وہ اظہارِ تشکّر میں سربسجود ہوگیا +

بوڑھا حکیم اب قاسم کی خاطر مدارات میں ایک مسرّت محسوس کر رہا تھا، لیکن قاسم اب پھر ایلی نورا کے تصوّر میں سب باتیں فراموش کر چکا تھا، اُسے آگ کے شعلوں، عرق کے قطروں، اور آبگینہ میں روپہلے عرق کی غلطانیوں میں ایلی نورا اور صرف ایلی نورا ہی نظر آرہی تھی، اُس نے کئی بار جگر دوز آہ بھری، بوڑھے نے سر اُٹھاکر اُس کی طرف بغور دیکھا، قاسم کے رخساروں پر آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے روحِ غم بن کر لڑھک رہے تھے، بوڑھا آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھا، شفقت اور محبت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا، تسلّی و تشفّی بھرے کلمات کہے اور اپنی حکمت عملی سے قاسم کو تمام داستان کہہ سنانے پر آمادہ کر لیا +

قاسم نے کہا "میں عبدالعزیز بن عبداللہ والئے دمشق کا اکلوتا فرزند ہوں، گذشتہ فتح کے دوران میں ایک ہسپانوی حسینہ ایلی نورا بھی مالِ غنیمت کے ساتھ لائی گئی، یہ عورت بلا کی حسین اور حورِ جنت معلوم ہوتی تھی، اُسے دیکھتے ہی میں پہلی نظر میں گھائل ہو گیا"

مال غنیمت کی تقسیم پر وہ سپہ سالار فوج کے حصہ میں آئی، مگر میں نے منہ مانگی قیمت دے کر اُس حور ارضی کو خرید لیا، لیکن آہ ایلی نورا، اُس نے مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا، وہ خوبصورت تھی، گوری چٹی، اور میں کالا کلوٹا تھا، میری رنگت اُس کے دل میں میری طرف سے نفرت کا بیج بوتی تھی، وہ میرے عقد میں آنے پر موت کو ترجیح دیتی تھی، اور میں زبردستی بھی اُسے اپنی بیوی بنا لیتا، لیکن میرے والد نے مجھے اس سے روک دیا، اور کہا کہ تم نے سپہ سالار سے محض میرے بیٹے ہونے کی وجہ سے یہ عورت چھین لی ہے، ورنہ وہ ہرگز تمہیں نہ دیتا، اب جبتک وہ رضامند نہ ہو، وہ تمہارے قبضہ میں نہیں دی جا سکتی، بس میرے جابر والد نے ایلی نورا کو شاہی محلات میں نظر بند کر دیا، اور میں دیوانوں کی طرح سے جنگلوں اور پہاڑوں میں مارا مارا پھرتا ہوں، کاش کہ میری رنگت سفید ہوتی اور میں اُسے شادی پر آمادہ کر سکتا"

بوڑھے حکیم نے مسکرا کر کہا، "اور میں تمہاری رنگت ضرور سفید بنا دوں گا"

قاسم خوف اور دہشت سے اُس کی طرف دیکھنے لگا

لیکن بوڑھے نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا "دوست ڈرو، میں تمہیں ضرور سفید بنا دونگا، میں کوئی جادوگر نہیں مگر یقین رکھو کہ جو دوا میں نے پانچ سال کی محنت سے تیار کی تھی وہ تمہیں سفید بنا دیگی، میرا نام حارث حسان ہے، میں بارہ سال سے اس پہاڑ کی کھوہ میں رہتا ہوں، اور ایک ایسی اکسیر کی تیاری میں مشغول تھا جس سے بڑھاپے کی لعنت دُور کر سکوں، اب خدا کے فضل سے میں اُس کی تیاری میں کامیاب ہو گیا ہوں، اس کی تکمیل محض تمہارے ہاتھوں ہوئی ہے، تم ایک غیبی مددگار یا فرشتہ کی طرح سے نازل ہوئے ورنہ آگ بجھ جاتی اور میری سالہا سال کی محنت اکارت جاتی، مجھے از سر نو عمل کی تیاری میں مشغول ہونا پڑتا، تمہارا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا، اور اس کے صلہ میں تمہیں ضرور سفید بنا دونگا"

یہ کہہ کر حارث حسان اُٹھا، اُس نے الماری کھول کر ایک شیشی نکالی، وہ کہنے لگا، یہ وہ عرق ہے جو تین سال کی محنت سے تیار ہوا تھا، اور یہ بھی اسی اکسیر جات بنانے کے سلسلے میں حاصل ہوا تھا، یہ بڑھاپے کی فرسودگی کو تو دور نہیں کر سکتی، لیکن صرف پندرہ بوند پینے سے تمہاری رنگت ضرور سفید کر دیگی

قاسم دیوانوں کی طرح اُس کی طرف دیکھ رہا تھا، بوڑھے حکیم نے پیالی میں دوا کی پندرہ بوندیں ڈالیں اور قاسم کے منہ میں اُنڈیل دیں، دوا کے حلق سے نیچے اُترتے ہی قاسم نے محسوس کیا کہ کوئی تیزاب کی قسم کی چیز اُس کے حلق وسینہ کو چیرتی ہوئی معدہ تک چلی گئی ہے، پانچ منٹ بعد اُس پر غنودگی اور غشی طاری ہونے لگی اور حارث حسان نے اُسے اُٹھا کر چٹان پر لٹا دیا

صبح جب آنکھ کھلی تو سورج کی شعاعیں پہاڑ کی غار میں بھی روشنی پہنچا رہی تھیں، حارث حسان ابھی تک صبح کے وظیفہ میں مشغول تھا، قاسم نے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا، تو وہ یکسر سفید تھے، وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور اپنے تمام جسم کو بغور دیکھنے لگا، اُس نے دیوار پر لٹکتے ہوئے آئینہ میں اپنا خوبصورت

چہرہ دیکھا تو جوشِ مسرت سے اُس کے مُنہ سے چیخ نکل گئی وہ حارث حسان کے قدموں پر گر کر خوشی کے آنسو بہانے لگا حارث نے اُسے تسلی دی، اور اکسیر کی شیشی اُسے دیکر کہا، جاؤ، اور ہر نئے چاند پر اسیقدر خوراک پی لیا کرنا، زیادہ نہ پینا ورنہ بُرا اثر ہوگا +

جب قاسم تاشق پہنچا تو لوگوں نے اُسے فرنگی سمجھا، عورتیں اور بچے اُسے اجنبی سمجھ کر بھاگے، مگر وہ لوگوں کی نظروں سے بچتا ہوا سیدھا اپنے والد حاکم تاشق کے مکان پر پہنچا، پہرہ داروں نے اُسے اندر جانے سے روک دیا، قاسم نے کہا کہ میں "قاسم" ہوں صرف میری رنگت سفید ہوگئی ہے، بعض لوگوں نے اُسے آواز سے شناخت بھی کیا، لیکن پھر بھی اُسے اندر جانے سے روک دیا، جب حاکم تاشق کو اس امر کی اطلاع پہنچی تو اُس نے قاسم کو اندر بُلایا، اُس کے خط و خال، آواز اور چند راز کی باتیں پوچھنے کے بعد حاکم تاشق کا اطمینان ہوگیا کہ یہ اُس کا اکلوتا بیٹا قاسم ہی ہے +

اب ایلی نورا اور قاسم کی شادی میں کوئی امر مانع نہ تھا، قاسم بہترین تناسب اعضا کا نمونہ تھا، اُس کے خط و خال پہلے بھی فرنگیوں سے بہتر تھے اور اب اُس کی رنگت بھی سفید تھی، اس لئے ایلی نورا کے دل میں اُس کے لئے ایک کشش و جذب پیدا ہو چکا تھا +

ایلی نورا اور قاسم اتفاق و محبت کے زندہ نمونہ تھے، دن عید اور رات شب برات تھی، حرم کے اندر باغات، فوارے، تالاب، چشمے، پھل اور پھول غرض سب کچھ مہیا تھا، کھلے آسمان کی چھت کے تلے چاندنی راتوں میں دونوں عشق و محبت کے افسانے دُہراتے، قاسم اپنی رشت نوردیاں اور مصائب کے واقعات سناتا، ایلی نورا ہسپانیہ کی دلکشیاں اور جنگ و جدل کی کہانیاں بیان کرتی، اسی طرح سے ۹۰ راتیں عیش و مسرت میں گذر گئیں +

ایک رات ایلی نورا نے دیکھا کہ قاسم نہایت احتیاط کے ساتھ بستر سے اُٹھ کر آہستہ آہستہ اُس صندوقچہ کے پاس پہنچا جو ایک طاقچہ میں رکھا ہوا تھا، اُس نے اپنے کمربند سے ایک چابی نکال کر اُسے کھولا، اور ایک شیشی میں سے چند قطرے دوا کے ایک پیالی میں ڈالکر پی گیا، اور اس کے بعد اُس پر گہری غفلت سی چھا گئی +

صبح قاسم پہلے سے بھی حسین تھا، اُس کے حسن کو شباب پر دیکھ کر ایلی نورا کے دل میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ قاسم کا حسن محض اس جادو بھرے عرق کی بدولت ہے، اگر وہ خود اس عرق کو پی لے تو ضرور پہلے سے بھی زیادہ حسین بن جائیگی، آہ، افسوس وہ نہ جانتی تھی کہ اس کا اثر کیا ہوگا، لالچ انسان کو تباہ کر دیتا ہے اور پھر حُسن کا لالچ، عورت حسین ہے اور وہ زیادہ حسین بننے کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہوتی ہے، اب وہ ہر روز کمربند سے چابی حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی، ایک روز جب قاسم غسل میں مشغول تھا تو ایلی نورا نے چابی لے کر دوا کی شیشی نکال کر ایک پیالی میں اُنڈیل لی اور تمام کی تمام پی گئی +

دو منٹ بعد ہی اُسے چکر سا آیا، اُس نے محسوس کیا کہ کسی تیز دوا سے اُس کا حلق، دل، جگر اور معدہ چھلنی ہو گیا ہے، اُس کے دماغ پر کسی آہنی پنجہ نے گرفت ڈال دی ہے، وہ گھبرائی اور چارپائی پر گر پڑی +

ایلی نورا تین چار روز تک برابر بیہوش پڑی رہی، قاسم اُس کی حالت سے باخبر ہو چکا تھا، اُس کو ہوش میں لانے کی بہت ترکیبیں کرتا، مگر کامیاب نہ ہوتا، بڑی کوشش سے مُنہ کھول کر پانی یا دودھ کے چند قطرے اُس کے حلق میں

ٹپکائے جاتے تھے، قاسم سمجھتا تھا کہ جب دو قطروں سے دو تین گھنٹے غشی طاری رہتی ہے تو سوڈیڑھ سو قطروں سے کتنی دیر غفلت طاری رہیگی، مگر سب سے زیادہ فکر اُسے اپنی رنگت کی ہورہی تھی، اس مہینے اُسے دوا نہیں ملی تھی، اور بار بار یہ وہم اُس پر چھائے جاتا تھا کہ وہ کہیں پھر سیاہ نہ ہوجائے +

اسی تگ و دو میں پانچ دن گذر گئے، تیمار دار، عورتیں اور محلات کی لونڈیاں ہر وقت ایلی نورا کے سرہانے منتظر کھڑی رہتی تھیں، تاشق کے تمام حکیم اُس کو ہوش میں لانے کی تدابیر میں مشغول تھے، مگر ابھی تک کوئی صورت کامیابی کی پیدا نہ ہوئی تھی +

چھٹے دن جب قاسم صبح بیدار ہوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھوں پر سیاہ سیاہ دھبے ظاہر ہورہے ہیں، خوف و ہراس سے اُس کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی، اُسے اپنے جسم سے آپ ہی خوف محسوس ہونے لگا اُس نے آنکھیں بند کرلیں، کیونکہ سفید سفید جلد پر سیاہ سیاہ دھبے دیکھنے سے اُس کی روح پر لرزہ طاری ہوجاتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ اپنی جلد نوچ کر پھینکدے، وہ ناخنوں سے جلد کو کریدنے لگا یہانتک کہ وہ زخمی ہوگیا، اُس نے تیز دھار کے خنجر سے اپنے جسم کو اچھی طرح سے دیکھا، لیکن یہ خواب و خیال نہ تھا، بلکہ ایک حقیقت تھی، کہ جسم کے کئی حصوں سے سیاہ جلد نکل رہی تھی، اُس کا دل بیٹھ گیا، وہ مایوس ہوگیا، وہ سمجھ گیا کہ دوا کا اثر مٹ رہا ہے، اور اب کچھ عرصہ بعد وہ بالکل کالا ہوجائیگا، ایسا کالا جسے پیاری ایلی نورا پھر نفرت و حقارت سے ٹھکرادیگی، وہ اپنی اس مایوس کن حالت کا علاج سوائے خودکشی کے اور کچھ نہ سمجھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ تیز تیز خنجر کو اپنے سینہ میں بھونک لے، یکایک اُس کے کانوں میں شور و غل کی آواز آئی، وہ دروازہ کی طرف لپکا، مگر ایک غلام نے جلدی سے اندر آکر کہا کہ ایلی نورا کو ہوش آگیا ہے، اور وہ آپ کو بلا رہی ہے +

"مجھے بلا رہی ہے" قاسم کی رنگت زرد ہوگئی، اُسکی آنکھیں جھک گئیں، اُس کے ہونٹ ناقابلِ اظہار جذبہ سے پھڑپھڑانے لگے، اُس کا دل سینہ میں اس زور سے دھڑک رہا تھا کہ سامنے کھڑا غلام سینہ کے اُتار چڑھاؤ کو محسوس کررہا تھا، قاسم اپنے دونوں ہاتھ اپنی پُشت پر چھپائے کھڑا تھا، اُسے ایلی نورا کے سامنے جاتے ہوئے خوف و ندامت محسوس ہوتی تھی، وہ دروازہ کے سہارے کھڑا تھا، مگر عرصۂ حیات اُس پر تنگ تھا +

اتنے میں ایک لونڈی دوڑی ہوئی آئی، اُس نے کہا، ایلی نورا آپ کو بلارہی ہے، وہ اب ہوش میں ہے، لیکن ——————

قاسم، لیکن —— کہو —— وہ کیا کہتی ہے؟ کیا وہ میری تباہی کا باعث نہیں بنی، کیا وہ معافی مانگنا چاہتی ہے!

لونڈی، لیکن، اُس کا رنگ بالکل سیاہ ہوگیا ہے +

قاسم، چونک کر، سیاہ ہوگیا! وہ دہشت سے کانپ اُٹھا +

مگر یکایک فتحمندی کے احساس سے قہقہہ مار کر ہنسا، وہ کمرہ میں جوشِ مسرّت سے دوڑنے لگا، وہ خوش تھا کہ ایلی نورا سیاہ ہوگئی ہے، اور اب اُس کی سیاہی پر ناک بھوں نہیں چڑھائیگی، وہ دلیرانہ اُس کے کمرہ کی طرف بڑھا، اور یہ دیکھ کر کہ اُس کے تمام چہرے پر گندم کی رنگت چھاگئی ہے اُس نے اطمینان بھرا سانس لیا، ایلی نورا نے روتے ہوئے اور ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کیا، اُس نے کہا کہ اُس کے غلط اقدام کا نتیجہ اُسے مل گیا ہے اور اُس کی تمام خوبصورتی زائل ہوگئی ہے، لیکن قاسم نے اپنے

دونوں ہاتھ جن پر سیاہ داغ نمایاں ہو رہے تھے اُس کے ہاتھوں میں دِے لئے اور کہا ، اب ہم دونوں ایک ہی رنگ میں رنگے گئے ہیں، اب کالے اور گورے کا امتیاز مٹ جائیگا +

ایک مہینہ کے اندر اندر قاسم کی رنگت بھی گندمی ہوگئی ، اب نہ ایلی نورا سفید تھی اور نہ قاسم ہی سیاہ فام تھا +

قاسم سے ایلی نورانے حارث حسان کے تمام حالات از سرِ نو تفصیل سے پوچھے ، اُس نے بتایا کہ یہ عرق پینے سے سفید بال سیاہ ہو جاتے ہیں ، مگر جلد بھی سیاہ ہو جاتی ہے یہی نقص تھا ، اور جس طرح سے ایک زہریلی دوا قلیل مقدار میں ایک مرض کو شفا دیتی ہے ، وہی دوا بہت زیادہ مقدار میں وہی مرض پیدا کرتی بلکہ مہلک ہوتی ہے ، قاسم نے کہا کہ آؤ حارث حسان کے پاس پھر چلیں ، شاید ہمیں وہ از سرِ نو سفید بنا سکے ، لیکن ایلی نورا نے قاسم کو روک دیا ، اور کہا کہ جلد سفید ہو یا سیاہ اِس سے اُس محبت میں اب فرق پیدا نہیں ہو سکتا ، جو تمہارے اور میرے درمیان پیدا ہو چکی ہے ، اب میں سفید بننا نہیں چاہتی اب میں تمہاری ہوں اور تمہاری ہی رہوں گی +

(تاثرات آوری سیلو)

(غیر مطبوعہ)

ایڈیٹر

حِسیات

اے مہِ حُسن ذرا اُٹھ سرِ لبِ بام ابھی
تیرے سائل ہیں ترے در پہ تہی جام ابھی

قیس و فرہاد نے پا بھی لیا مقصودِ حیات
ہم اُسی منزلِ اوّل میں ہیں ناکام ابھی

تابِ جنبش نہیں اے شورِ قیامت نہ اُٹھا
بعد مدّت کے ملا ہے مجھے آرام ابھی

عشق بے پردہ بھی گر ہو تو نہیں ہے رسوا
سات پردوں میں بھی ہے حُسن تو ہے عام ابھی

(ق)
پردے پردے میں تری دونوں جہاں میں شُہرت ،
جستجو ہی میں تری گم ہے مرا نام ابھی

اے فلک تجھ سے مجھے مِہر کی اُمید ہو کیا
تیری محفل میں مِرا تو ہے تہی جام ابھی

پختہ ہے ساغرِ دل گرچہ ازل سے ہی نظیرؔ
آتشِ غم سے ہے بیگانہ تو ہے خام ابھی

اصغر حسین خاں نظیرؔ لودھیانہ

"ناگوں کا دیوتا"

(افسانہ)

[مشہور افسانہ نگار تہذیب فاطمہ عباسی کے قلم سے]

(خاص برائے نیرنگ خیال)

گنگا پار کا ایک جوگی نیپال کے ایک شہزادے سکھ درسن کمار کو چرا لایا تھا۔ یہ جوگی سانپوں کو پکڑتا تھا، اس نے سکھ درسن کمار کو بھی اسی فن کی تعلیم کی، جوگی مر گیا۔ مگر سکھ درسن ایک بن باسی کی حیثیت سے اپنی جھونپڑی میں رہتا تھا، اب یہ شہزادہ ایک بہترین بین بجانے والا سپیرا تھا، یہ سانپوں کا بہت بڑا عامل اکثر جنگلوں کے باہر آبادی میں بھی بین بجانے جایا کرتا تھا، اس کی بادامی وضع کی آنکھیں اس کے استغنا کی مظہر تھیں، اور وہ اپنی اس حالت میں بے انتہا خوش نظر آتا تھا۔

دوپہر قریب تھی۔ "راج محل" کی چوکھٹ پر ایک نوعمر سپیرا سفید کفنی پہنے، گلے میں مالا ڈالے بین بجا رہا تھا، مہاراجہ کا لاڈلا بیٹا سندر بابو "راج محل" کی کھڑکی سے بین سن رہا تھا، اس نے حکم دیا "سپیرے سے کہو ہم کو ناگ جی دکھائے" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا "راج کمار سے کہدو سب جوان اور نئے سانپ ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پر حملہ کر بیٹھیں سپیرا انہیں نکالنا نہیں چاہتا"۔

سندر بابو نے پھر کہا "اچھا اس سے کہو وہ اپنا پنجرا کھول دے ہم اسی سے سیر کر لینگے"۔

سپیرے نے پھر کہا "راجکمار سے کہدو بالک ہٹ چھوڑ دیں، میرے ناگ اس وقت بہت غصہ میں ہیں"۔

سندر بابو کو غصہ آ گیا اور تحکمانہ لہجہ سے کہا "بس اس سے کہو کہ حکم کی تعمیل کرے"۔

سپیرے نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ڈھکنا کھولدیا اور بدستور بین بجانے لگا۔

پٹاری میں کالے کالے ناگ چمکیلے دیدہ پھاڑے ہوئے بل مار رہے تھے، ایک چھوٹا سا سبزی مائل سانپ پنجرے سے نکل کر بھاگا، سپیرا دوڑا کہ اسے پکڑ لے، لیکن سندر بابو نے بڑے اطمینان سے کہا "جانے دو اپنا کام کرے، سانپ کو ادھر آنے دے"۔

اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور پھر بین کو منہ سے لگا لیا، سانپ غصہ سے پھنکار رہا تھا، راجکمار کے ساتھی خوف سے کانپنے لگے، سانپ مچلتا ہوا کمرے میں پہنچ گیا، راجکمار کھڑا ہو گیا، اور اپنی تلوار لیکر اس کی طرف لپکا، سپیرا دور ہی سے چلایا "راجکمار! ناگ جی کو مارنا تمہارا دھرم نہیں ہے" مگر ضدی راجکمار اپنا پہلا وار ختم کر چکا تھا، سانپ زخمی ہو کر زور سے تڑپا اور لپک کر راجکمار کی انگلی منہ میں لے لی۔ . . . . . اس کے بعد لوگوں نے دیکھا کہ راجکمار بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا ہے!!!

سانپ باہر نکلتے ہی درختوں میں غائب ہو گیا پہرہ داروں نے سپیرے کو گرفتار کر لیا۔

محل میں کہرام پڑ گیا، راج کمار کا پلنگ باغ میں بچھا دیا گیا

رانی کمالا اس کے سرہانے کھڑی ہوئی آنسوؤں کی لڑیاں پرو رہی تھی، لجالی راج کمار کی اکلوتی بہن اُس کی مکھیاں جھل رہی تھی، اور سردار ناتھ راجہ کی روتے روتے آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں +

چاروں طرف آدمی دوڑائے گئے، جھاڑنے والوں کی آمد شروع ہوگئی، بڑے بڑے عامل بلائے گئے، سب نے باری باری سے عمل پڑھے، بین بجائی، تھالیاں پھینکیں، لیکن راجکمار پر کوئی اثر نہ ہوا، نوعمر سپیرا ابتک محل میں بیٹھا تھا، اُس نے بار بار کہا "اس سانپ کی جھاڑ کسی کے پاس نہیں ہے، مہاراج سے کہو مجھ کو حکم دیں، دو گھڑیوں میں اچھا کردونگا"، مگر کسی نے شنوائی نہ کی، سب یہ کہہ کر نکل گئے "جب بڑے بڑے عامل ہارے جاتے ہیں تو تیرا کیا تذکرہ ہے، ٹکے کا سپیرا اور راجکمار کو جلانے کا دعویٰ"!!!

تین دن گذر گئے پر کسی کی آنکھ سے آنکھ نہ جھپکی، جھاڑنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، مگر سب کی کوششیں ہار گئی تھیں، اور مولائے فن بھی تھک گئے تھے، سب نے راجہ کو راجکمار کی زندگی سے مایوسی دلادی، راجہ کو صبر آگیا، ارتھی کی تیاریاں ہونے لگیں +

نوعمر سپیرے نے پھر خوشامد کی کہ "کوئی مجھے راجہ تک پہنچادو"، فہیم کو ترس آگیا، راجہ جی کے پاس جاکر کہا "مہاراج! ایک سپیرا آنے کی اجازت چاہتا ہے" مایوس راجہ نے کہا "بلاؤ" تھوڑی ہی دیر بعد ایک زرد رو جوگی کاندھے پر جھولی ڈالے بین لیکر سامنے جھک گیا، راجہ نے کہا کیا چاہتا ہے؟ جوگی نے ہاتھ جوڑ کر کہا "مہاراج! ایک آخری کوشش کر دیکھئے، میں راجکمار کو جلانے کا وعدہ کرتا ہوں" راجہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا "تو؟" اُس نے کہا "ہاں" اور پیروں پر جھک گیا" +

سردار ناتھ راجہ کے دل میں اُمید کا دیا چمک اُٹھا، رانی کے چہرہ پر خوشی دوڑ گئی، لجالی کے دل میں بھی آس نے چٹکیاں لیں، وہ اپنے بیہوش بھائی کی لاش اور سپیرے کے عمل منتر کی طرف اُمید و اشتیاق بھری نگاہوں سے دیکھنے لگی

نوعمر سپیرا مسکرایا اور کہنے لگا "بھگوان کی دیا سے بڑا آسرا ہے" اور بین بجانا شروع کردی، اس کو عمل پڑھتے ہوئے رات گذر گئی، صبح کو جب چڑیاں چہک رہی تھیں، مردہ راج کمار کو حرکت ہوئی، رفتہ رفتہ اُس نے آنکھیں کھولدیں سب کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں، ماں باپ تو قریب قریب شادیٔ مرگ ہوگئے، لجالی نے بین کی طرف احسانمندانہ نظروں سے دیکھا......... اُس بین کی طرف، جس کے حیات بخش راگوں کے اثر نے اُس کے پیارے بھائی کو زندہ کردیا تھا، لیکن سپیرے نے بین نہیں بند کی +

تین دن اور گذر گئے، چوتھے روز راج کمار سندر بابو انگڑائی لیکر اُٹھ بیٹھا، سپیرا مسکرایا اور آگے بڑھ کر کہنے لگا "راجکمار! بالک ہٹ کا نتیجہ دیکھا؟ چھ دن موکر جاگے ہو اب تو ناگ جی دیکھنے کی فرمایش نہ کروگے"!!!

راجکمار کو صحیح سلامت دیکھ کر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے، کمالا اُس کی بلائیں لے رہی تھی اور لجالی اس کے قریب کھڑی ہوئی مسکرا رہی تھی، راجہ سردار ناتھ کے حکم سے انعامات کا سلسلہ جاری ہوگیا، خزانہ کا مُنہ کھولا ہوا تھا اور غریبوں کو فیض بٹ رہا تھا، مگر بھوکا پیاسا سپیرا "راج محل" چھوڑنے کے لئے صرف راجہ کی اجازت کا منتظر تھا +

راجہ نے سپیرے کو بلایا وہ سر جھکائے ہوئے راجہ کے قریب کھڑا ہوگیا، راجہ نے پوچھا "تیرا کیا نام ہے؟ وہ کہنے لگا

میرا نام سکھ درسن ہے، میں سانپوں کا عامل ہوں"۔

راجہ نے کہا "تو نٹ بنا کیوں پھرتا ہے؟ تیری شکل تو شاہزادوں کی سی ہے"۔

نیپال کا ایک بڈھا قاصد جو سردارناتھ راجہ کے پاس آیا ہوا تھا، سپیرے کو پہچانتے ہی حیران ہو کر دوڑا "ہائیں سکھ درسن، سکھ درسن .... ارے یہ تو نیپال کا چھوٹا شہزادہ ہے، جب یہ بہت چھوٹا تھا تب کھو گیا تھا"۔ بڈھے نے گمان کرتے ہوئے کہا۔

سکھ درسن جوگی جھکا اور آہستہ سے کہنے لگا "ہاں مجھے سب یاد ہے، چپ رہو، میں اپنی اس حالت میں بہت خوش ہوں، اب راج محل جا کے کیا کرونگا؟ خبردار اب کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا"۔

بوڑھے نے کہا "بھلا!" کیونکہ وہاں کی ریاست میں بہت جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں، مگر اسے اس انکار پر تعجب تھا۔

راجہ نے حکم دیا "جوگی کو خلعت ومال سے مالا مال کرو"۔ جوگی بولا "مہاراج! مجھے خلعت ومال کچھ نہیں چاہئے، حضور کی مہربانی میرے لئے بڑی مایا ہے"۔

سردارناتھ راجہ نے خیال کیا کہ "یہ اس انعام کو کافی نہیں سمجھتا ہے" انہوں نے کہا "اس کے نام پر ایک جاگیر لکھ دینا چاہئے" وہ بول اٹھا "مہاراج! معاوضہ کی ضرورت نہیں ہے، میں نے تو اپنی خوشی سے راجکمار کا کام کیا ہے"۔ راجہ نے بہت اصرار کیا، لیکن سادہ دل وسادہ مزاج جوگی برابر انکار ہی کرتا رہا۔

راجہ نے کہا "تو میرے محل میں رہ کر تجھے یہاں سارے سنسار کا عیش میسر ہوگا"۔

نوعمر جوگی مسکرایا اور کہنے لگا "مہاراج! ہم جھاڑ نے والوں کو مایا اور عیش سے کیا کام ہے؟ میں پیسہ اور آرام پر نیت نہیں ڈالتا، بس میرا کام تو جنگل جنگل گھومنا ہے، مجھے اپنے صحت یاب سے ایک کوڑی بھی لینا حرام ہے اب تو میں اس راجدھانی کا پانی بھی نہیں پی سکتا"۔

راجہ نے کہا "اے سپیرے میں تیری خدمت کے لئے ایک غلام دینا چاہتا ہوں"۔

جوگی نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "مہاراج بس شرمیان چاہتا ہوں، غلام لینا میرے منتر میں منع نہیں، مگر ہم بن باسی لوگ غلاموں کو کس لئے لے جائیں؟ ہمارا کام دوسروں کی خدمت ہے، ہم اپنی خدمت کس سے لیں"؟

راجہ سردارناتھ تھک گئے، وہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئے کہ "اس کو کیا دوں"؟ انہوں نے کملا سے کہا، وہ کہنے لگی "ہمارے بچے کی جان بچ گئی اسے جو دیدو وہ تھوڑا ہے، مہاراج! یہ تو بالکل راجکمار کا بھائی معلوم ہوتا ہے"۔

راجہ نے جواب دیا "یہ راز آج کھلا کہ یہ نیپال کا چھوٹا شہزادہ ہے جو بچپن میں چوری گیا تھا، دیکھو وہ صورت ہی سے شریف ذات معلوم ہوتا ہے"۔

کملا نے راجہ کی طرف دیکھ کر کہا "راجہ پھر کیا اسے اپنی بیٹی دینا برا ہے"؟ اور وہ راجہ کا منہ دیکھنے لگی، راجہ نے کہا "ہاں کوئی بات نہیں مگر کیا راجکماری ایک جوگی کی استری خوشی سے بن جائے گی؟ کملا نے کہا "لجالی کہاں ہے"؟

لجالی سامنے آکر کھڑی ہو گئی، کملا نے اس کی ٹھوڑی میں ہاتھ ڈال کر کہا "لجالی! اگر کوئی شخص تیرے بھائی پر احسان کرے تو تو اسے کیا سمجھتی ہے"؟ وہ کہنے لگی "ماتا دہ ہمارا محسن ہے"۔ کملا نے اس کی طرف دیکھ کر کہا "لجالی! کیا تو اپنے پتا کی مرضی پر چلے گی"؟

وہ کہنے لگی "ماتا! اپنے ماتا پتا کی ہر بات ماننا میرا دھرم ہے"۔

کمالا نے کہا "سُن! سکھ درسن جوگی نے تیرے بھائی کو زندگی دی ہے تو اُسے اپنا محسن سمجھتی ہے، پھر کیا تو اُس کو اپنا "سوامی" قبول کریگی"؟

اس کے جواب میں لجالی گھٹنوں کے بل اپنے پتا کے پیروں پر جھک گئی........

کچھ دیر خاموشی کے بعد سردار ناتھ راجہ نے سپیرے سے کہا "بن باسی! میں تجھے کچھ نہیں دونگا، بس تیرے ساتھ "راج کماری" کا بیاہ کردونگا"+

اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور "مہاراج" کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دئے!!!

راجہ نے "راج کماری" اور "سکھ درسن جوگی" کو بیاہ دیا

صبح ہو گئی تھی اور ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت آمیز ہوا چل رہی تھی، اس وقت لجالی کی سکھیوں نے اس کو دُلہن بنایا، وہ سب اُسے گھیرے ہوئے کھڑی تھیں، اُسے ایک بنارسی ساڑھی پہنادی گئی تھی، اور اُس کے چمکدار زیورات کو دیکھکر لوگوں کی نگاہ جھپکی جاتی تھی +

لجالی لجالی کے پھولوں کی طرح نازک تھی، اسکی لچک دیکھ کر آکاس کی بیل بھی شرما جاتی، جب لجالی "راج محل" کی کھڑکی سے دیکھنے لگتی تو چاند درختوں کے پیچھے چھپ چھپکر اُسے دیکھتا، صبح کو جب لجالی مسکراتی تو ایک دم باغ کے پھول کھل جاتے، اور جب لجالی باغ کی ندی میں اپنا عکس دیکھتی تو اُس کی لہریں مچل مچل کر اُس کے نازک سائے پر نثار ہوتیں +

وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ زنانہ محل سے باہر نکل آئی "سکھ درسن جوگی" نے کئی رات کی جاگی ہوئی خمار آلود آنکھوں سے "راجکماری کی طرف دیکھا، اور اُس کے چمکیلے زیور و بہاری ساڑھی کو دیکھکر حقارت سے مُنہ پھیرلیا، راج کماری نے اس کو محسوس کیا اُس کا دل چاہنے لگا کہ وہ اس زیبائش کو نوچ کر پھینکدے"، مگر وہ دُلہن تھی اور ابھی "راج محل" میں تھی!!!

سردار ناتھ راجہ نے راج کا ایک حصہ سکھ درسن جوگی کو دینا چاہا، اُس نے کہا "مہاراج! میں پھر کہتا ہوں، میں کوڑی نہیں لونگا"! راجہ نے جواب دیا "سکھ درسن! یہ راجکماری کا جہیز ہے"، وہ کہنے لگا "مہاراج! سکھ درسن کی داسی راجدھانی کیا کریگی"؟ لجالی آگے بڑھی اور آہستہ سے کہنے لگی "پتاجی! مجھے جہیز نہیں چاہئے. میں "راجکماری" بنکے نہیں جاتی "جوگن" بنکر رہونگی"+

راجکماری کی سکھیوں نے اس کو سسکیاں بھرتے ہوئے علیحدہ کیا، کمالا نے اُس کو پیار کیا، سُندر بابو راجکمار نے روتے ہوئے اُسے الوداع کہی، سردار ناتھ راجہ نے لجالی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا اور اُسے رخصت کردیا..........

سکھ درسن جوگی نے اُس کی طرف دیکھا، وہ روتی ہوئی اُٹھ کر کھڑی ہوئی، اور پیادہ پا ایک جوگی کے پیچھے، جنگل کی طرف چلی گئی!!!!!

ایک ہفتہ بعد نوعمر بن باسی ایک بن باسنی کو ساتھ لئے ہوئے جھونپڑی میں داخل ہوا، اُس نے پنجرے کا منہ کھولدیا چھ دن کے قیدی بلبلا کر باہر نکلے، ناگوں نے اپنے چوڑے چوڑے پھن پھیلا کر جنگل کی طرف دیکھا، راجکماری پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اُس کی طرف لپکے، نازک بدن لجالی سکھ درسن کے قدموں کی طرف سمٹنے لگی وہ کھڑا ہو گیا اور ناگوں کی طرف دیکھ کر بولا "خبردار سکھ درسن کی دیبی سے سرکشی نہ کرنا"! ناگوں نے اپنی مالکہ کو پہچان لیا، اور اُس کے قدموں........ کی طرف جھک گئے، سکھ درسن نے اُسے

ہراساں دیکھ کر کہا "میری داسی! ان سے خوف نہ کھاؤ، یہ تم سے مانوس ہو جائینگے!!!

بندھیاچل پہاڑ کے نیچے جنگل کی ایک پُرفضا وادی میں ہرے بھرے درختوں سے ڈھکی ہوئی ایک سپیرے کی کٹی تھی، اکاس کی بیل اس کٹی پر چھائی ہوئی تھی، اور ہرے ہرے درختوں کی جھلاری پتیاں اس جھونپڑے کے دروازہ کو گھونگھٹ کی طرح چھپائے تھیں +

کٹی کے سامنے، نمناک زمین پر تلسی کے پیڑ کے نیچے زاہد فریب جوگن، صندلی ریشمی ساڑھی پہنے، پھولوں کے زیور سے لدی ہوئی بینا بجارہی تھی، "شام کلیان" راگ بینا سے نکلکر جنگل میں گونجا ہوا تھا، اس کے سیاہ سیاہ بال پیٹھ اور بازوؤں پر بکھرے ہوئے تھے +

"نینوا" ندی جنگل کے دوسروں پر پڑی بل کھا رہی تھی، آکاس کے نیلے منڈل پر تاروں کی کیاریاں چمک رہی تھیں، سنہرا چاند طلائی بندیا کی طرح آکاس پر جڑا ہوا جھمک رہا تھا، اس سے نور کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر جنگل کی طرف اُتر رہی تھیں، روشن نگار تاروں کے انعکاس سے نیلے پانی نے، دوگنے لعلِ بدخشاں اُگل دئے تھے، چاندنی میں ایک سنجیدگی پھیلی پڑی تھی اور نورس مہتاب کی نوریں روشنی کی طرح، جوگن کے مکھڑے پر بھی شانتی کا مقدس نور پھیرا ہوا تھا +

بینا کی سحر طراز آواز ہوا میں اُڑی جارہی تھی، مہ صورت جوگن دونا نو مٹھی ہوئی بینا بجارہی تھی، بینا بجانے والی کے سامنے، کالے کالے ناگ پھن اُٹھائے جھوم رہے تھے، چندرمان کی روشنی میں ان کے سُرخ سُرخ دیدہ چمک رہے تھے، اتنے میں ندی سے "کوڑیالا ناگ" سرسر کرتا ہوا باہر آیا اور بن باسنی کی گود میں لیٹ گیا، تمام سانپوں پر اس وقت بیخودی چھائی ہوئی تھی، اور ناگوں کی سحر کیش دیوی، آنکھیں بند کئے، ایک جاں گسل راگ الاپ رہی تھی، پنجڑے کا منہ کھلا ہوا تھا اور اس میں قسم قسم کی خوبصورت ناگنیں بینا کی اُڑتی ہوئی آواز میں غائب ہو گئی تھیں +

دفعتاً جوگن ایک آواز سے چونک پڑی "ٹھیرو پیاری جوگن! ٹھیرو" اس نے آنکھیں کھول دیں، شبنو کا درخت اُسے دیکھ کر جھجھک گیا اور اُس کی شاخوں نے نیچی ہوکر جوگن سے "پالاگن" کیا +

وہ بے تابانہ کھڑی ہو گئی، ناگوں کا دیوتا سکھ درسن سفید کفنی پہنے، جھولی ڈالے، بین ہاتھ میں لئے اس کی طرف آرہا تھا، ناگنوں کی دیوی تجالی، مسکراتی ہوئی آگے بڑھی چندرمان کی روشنی ان دونوں کے چہرے پر پڑ رہی تھی بن باسی شہزادے نے جوگن کا ہاتھ پکڑ کر کہا "جوگن! اب تو جوگی کی داسی معلوم ہوتی ہے"!!! وہ ہنسی اور کہنے لگی "ناتھ! راج کماری کا گھمنڈ میرے دل سے جب ہی نکل گیا تھا، مگر ناگنوں کی دیوی اب ہوئی ہوں" +

چنبیلی کی جھاڑیوں میں چھوٹے چھوٹے سانپ لٹکے ہوئے مچل رہے تھے، وہ آہستہ سے اُترے اور اپنے دیوتا کے پیروں پر لوٹ گئے، سپیرے کی بیوی نے بین اُٹھالی اور بولی "میرے سوامی! اپنی بن باسنی کی بات سنو، تمہارے بالتو قدموں پر لوٹ رہے ہیں، ذرا انھیں ایک راگ سنا دو" +

سپیرے اور اُسکی داسی نے بین بجانا شروع کی.... آہ کیا لوشتا راگ تھا، ناگ جی خود فراموش تھے، جنگل میں بینا کی دلکش آواز رقص کر رہی تھی، جوان اپنے کاموں سے باز آگئے تھے، اور رس میں ڈوبے ہوئے ناگوں کا دیوتا اور دیبی دونو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے راگ میں خود ہی اُڑے جارہے ہیں +

خاک نشین تہذیب فاطمہ عباسی

نغمۂ روح

(افسانہ)

[منشی پریم چند کے قلم سے]

(۱)

آدھی رات، ندی کا کنارہ، آسمان کے ستارے ساکن تھے، ندی کے ستارے لہروں کے ساتھ رواں، ایک نغمۂ فردوس کی دلکش، روح پرور، مستانہ صدائیں اس خاموش اور تاریک منظر پر اس طرح چھا رہی تھیں جیسے دل پر اُمیدیں چھائی رہتی ہیں، یا چہرہ پر غم +

رانی منورما نے آج گرد و کیشالی تھی، سارے دن دان اور برت میں مصروف رہنے کے بعد ابھی نیند کی گود میں سو رہی تھی، دفعتہً آنکھیں کھلیں، اور یہ دلکش صدائیں کانوں میں پہنچیں، بیقرار ہوگئی، جیسے پروانہ شمع کو دیکھ کر، صبر کی تاب نہ رہی، جیسے چیونٹی شکر کی بُو پاتے ہی بیتاب ہو جاتی ہے، اُٹھی اور دربانوں، چوکیداروں کی نگاہیں بچاتی ہوئی راج محل سے باہر نکل آئی، جیسے نالۂ درد سُنکر آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں +

ساحل پر خاردار جھاڑیاں تھیں، اونچے کگار تھے، خوفناک جانور تھے، اُن کی ہیبتناک صدائیں تھیں، لاشیں تھیں اور اُن سے زیادہ ڈراؤنا اُن کا خیال تھا، منورما نازو نزاکت کی پُتلی تھی، پر نغمۂ شیریں کی کشش اُسے ایک عالمِ محویت میں کھینچے لئے جاتی تھی، خطروں سے بے خبر، وہ گھنٹوں سرگرم رفتار رہی، یہانتک کہ ندی راستہ میں حائل ہوگئی +

(۲)

منورما نے بے بسی کے ساتھ اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، کنارے پر ایک کشتی نظر آئی، قریب جاکر بولی مانجھی! میں اُس پار جاؤنگی، اس دلکش راگ نے مجھے بیتاب کردیا ہے +

مانجھی، رات کو ناؤ نہیں کھول سکتا، ہوا تیز ہے، لہریں ڈراؤنی، جان جوکھم ہے +

منورما، میں رانی منورما ہوں، ناؤ کھول دے، مُنہ مانگی مزدوری دونگی +

مانجھی، تب تو ناؤ کسی طرح نہیں کھول سکتا، رانیوں کا اس ندی میں گذارہ نہیں +

منورما، چودھری، تیرے پاؤں پڑتی ہوں، جلد ناؤ کھول دے، میری روح اُس طرف کھنچی چلی جاتی ہے +

مانجھی، کیا انعام ملیگا؟

منورما، جو تو مانگے +

مانجھی، آپ ہی کہدیں، میں گنوار کیا جانوں رانیوں سے کیا چیز مانگنی چاہئے، کہیں کوئی ایسی چیز نہ مانگ بیٹھوں جو آپ کی شان کے خلاف ہو +

منورما، میرا یہ ہار نہایت بیش قیمت ہے، میں اسے کھیوے میں دیتی ہوں +

منورما نے گلے سے ہار نکالا، اُس کی ضیا سے مانجھی کا چہرہ روشن ہوگیا، تند اور کرخت جس پر ایک مدت دراز کی

ستیا جی نے جُھرّیاں ڈالدی تھیں +

دفعتہً منورما کو ایسا معلوم ہوا کہ نغمہ کی صدا قریب تر ہوگئی، شاید کوئی عارف اپنی خودمستی کے عروج میں اُس ساحل پر بیٹھا ہوا فرضِ تاریک کو مترنم کر رہا ہے، رانی کا سینہ اُچھلنے لگا، آہ! کتنا دلسوز نغمہ تھا، اُس نے بے صبر ہوکر کہا، "مانجھی اب دیر نہ کر، ناؤ کھول، میں ایک لمحہ بھی صبر نہیں کرسکتی" +

مانجھی، اس ہار کو لے کر میں کیا کرونگا ؟

منورما، سچے موتی ہیں +

مانجھی، اور بھی مصیبت، مانجھن گلے میں ڈالکر پڑوسیوں کو دکھائیگی، وہ سب ڈاہ سے جلینگی، اُسے گالیاں دینگی کوئی چور دیکھیگا تو اُس کی چھاتی پر سانپ لوٹنے لگیگا میری سُنسان جھونپڑی میں دن دہاڑے ڈاکہ پڑ جائیگا، لوگ چوری کا اپرادھ لگائیں گے، نہیں مجھے یہ ہار نہ چاہیئے،

منورما، تو جو کچھ تو مانگ وہی دونگی، لیکن دیر نہ کر مجھے اب صبر نہیں ہے، انتظار کی مطلق تاب نہیں، اس راگ کی ایک ایک تان میری روح کو تڑپائے دیتی ہے +

مانجھی، اس سے اچھی کوئی چیز دیجئے +

منورما، آہ ظالم، تو مجھے باتوں میں لگائے رکھنا چاہتا ہے، میں جو دیتی ہوں وہ لیتا نہیں، آپ کچھ مانگتا نہیں، تجھے کیا معلوم میرے دل کی اس وقت کیا حالت ہورہی ہے، میں اس روحانی نعمت پر اپنا سب کچھ قربان کرسکتی ہوں +

مانجھی، اور کیا دیجیگا +

منورما، میرے پاس اس سے بیش قیمت کوئی چیز نہیں ہے، لیکن تو ابھی ناؤ کھول دے تو وعدہ کرتی ہوں کہ تجھے اپنا محل دیدونگی جسے دیکھنے کے لئے شاید کبھی تو بھی گیا ہو، خالص سنگِ مرمر ہے، ہندوستان میں اس کا ثانی نہیں، اب ایک لمحہ کی بھی دیر نہ کر +

مانجھی (ہنسکر) اس محل میں رہ کر مجھے کیا آرام ملے گا، اُلٹے میرے بھائی بند دشمن ہوجائیں گے، اس ناؤ پر اندھیری رات میں بھی مجھے ڈر نہیں لگتا، آندھی چلتی رہتی ہے اور میں اس پر پڑا رہتا ہوں، لیکن وہ محل تو دن ہی کو پھاڑ کھائیگا، میرے گھر کے آدمی تو اُس کے ایک کونے میں سما جائیں گے، اور آدمی کہاں سے لاؤنگا، میرے نوکر چاکر کہاں ؟ اتنا مال اسباب کہاں ؟ اُسکی صفائی اور مرمّت کہاں سے کراؤنگا، اُس کی پھلواریاں سوکھ جائینگی، اس کی کیاریوں میں گیدڑ بولیں گے اور اٹاریوں پر کبوتر اور ابابیلیں گھونسلے بنائیں گی +

منورما دفعتہً ایک عالمِ مستی میں اُچھل پڑی، اُسے معلوم ہوا کہ نغمہ قریب تر آگیا ہے، اُس کی نزاکت اور لطافت زیادہ روشن ہوگئی تھی، جیسے بتّی اُکسا دینے سے چراغ زیادہ روشن ہوجاتا ہے، پہلے دلکش تھا تو اب ولولہ خیز ہوگیا تھا، منورما نے بیتاب ہوکر کہا آہ! تو پھر تو اپنی زبان سے کیوں کچھ نہیں مانگتا، اُف! کتنا مسرت انگیز راگ ہے، کتنا وجد میں لانے والا، میں اب مطلق صبر نہیں کرسکتی، پانی نشیب میں جانے کے لئے جتنا بیقرار ہوتا ہے، سانس ہوا کے لئے جتنی بیقرار ہوتی ہے، بُو اُڑ جانے کے لئے جتنی بیقرار ہوتی ہے، میں اس نغمہ کے لئے اتنی ہی بیقرار ہوں، اس نغمہ میں کوئل کی سی مستی ہے، پپیہے کا درد ہے، شیاما کا گداز ہے، اسمیں آبشار کا زیر ہے، طوفان کا بم ہے، اس میں وہ سب کچھ ہے، جس سے معرفت بیدار ہوتی ہے، جس سے روح وجد کرتی ہے، جس سے قلب مرتعش ہوتا ہے، مانجھی اب

ایک چھن کی دیر بھی میرے لئے عذاب موت ہے، جلد ناؤ کھول جس پھول کی یہ مہک ہے، جس چراغ کی یہ روشنی ہے، اُس تک مجھے پہنچادے، میں دیکھ نہیں سکتی اس نغمہ کا خالق کہیں قریب ہی بیٹھا ہوا ہے، بہت قریب۔

مانجھی، آپ کا محل میرے کام کا نہیں ہے، میری جھونپڑی اس سے کہیں زیادہ سہاؤنی ہے +

منورما، ہائے تو اب تجھے کیا دوں، یہ نغمہ نہیں ہے، یہ اس فضاء وسیع کی نزہت ہے، یہ سارے پھولوں کی راحت ہے، ساری شیرینیوں کا عطر ہے! ساری حلاوتوں کی ساری کیفیتوں کا خلاصہ ہے، ناؤ کھول، میں جب تک جیونگی تیری خدمت کرونگی، تیرے لئے پانی بھر دونگی تیرے جھونپڑے کی خاک روبی کرونگی، ہاں میں تیری راہ کے کنکر چنونگی، تیرے جھونپڑے کو پھولوں سے سجاؤنگی تیری مانجھن کے پیر ملونگی، پیارے مانجھی، اگر میرے پاس سو جانیں ہوتیں تو میں اس نغمہ کے نذر کرتی، ایشور کے لئے اب مجھے مایوس نہ کر، میرے صبر کا آخری قطرہ خشک ہوگیا، اب اس اشتیاق میں شعلہ کی سوزش اور جلن ہے، اب یہ سر تیرے قدموں پر ہے +

یہ کہتے کہتے منورما ایک جنون وجد کی حالت میں مانجھی کے قریب جاکر اُس کے پیروں پر گر پڑی، کہ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا وہ نغمہ روح پرور کسی شمع روشن کی طرح نور برساتا ہوا میری طرف چلا آتا ہے، اس کے روئیں کھڑے ہوگئے وہ مست ہوکر جھومنے لگی، ایسا معلوم ہوا کہ میں ہوا میں اُڑی جاتی ہوں، اُسے اپنے پہلو میں ستارے جھلملاتے ہوئے دکھائی دیتے، اُس پر ایک بیخودی کا سرور چھا گیا اور تب وہی مستانہ نغمہ، وہی دلکش راگ، اُس کے منہ سے نکلنے لگا، وہی آبِ حیات کی بوندیں اُس کے لبوں سے ٹپکنے لگیں وہ خود اس نغمہ کا منبع تھی۔ ندی پار سے آنے والی روح پرور صدائیں اُسی کے مُنہ سے نکل رہی تھیں +

منورما کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہوگیا تھا اور آنکھوں سے پریم کی شعاعیں نکل رہی تھیں +

(غیر مطبوعہ بوساطت دارالاشاعت)

پریم چند

تُرکی ٹوپی

(افسانہ)

[مشہور افسانہ نگار ڈوورنوئی کا شاہکار]

(خاص برائے نیرنگِ خیال)

نسیم کو بس اتنا ہی یاد رہا تھا، کہ کبھی وہ تُرک تھا اور جوانی میں سر پر ترکی ٹوپی پہنے، مٹھائی کا خوانچہ اُٹھائے قہوہ خانوں کے آگے آگے چکر لگاتا اور برف کی سی سفید "راحت جاں" اور بادامی کیک بیچا کرتا تھا +

شباب کے وہ دن بھی کیسے دن تھے، دل میں ہزاروں اُمنگیں تھیں، کمانے کا نیا نیا شوق بھی تھا، نہ بھوک کی فکر تھی نہ فاقے کا ڈر، کاندھے پر پیتل کا چمکیلا خوانچہ ہاتھ میں دمشق کی کھجور کی چھلنی، بس اسیقدر سامان کے ساتھ دو دن یہاں، چار دن وہاں، مُلک مُلک کا پانی پیتا، نئی نئی صورتیں دیکھتا، مہ جبینوں کو اپنی "راحت جاں" کی شیرینیوں میں پھسلا کر، باتوں ہی باتوں میں اپنا جی خوش کرتا ہوا، تمام دنیا میں گھوم چکا تھا +

اُس کی آنکھوں میں کچھ ایسی کشش تھی کہ ہر شخص اُسکی طرف خود بخود کھنچا آتا تھا، ہونٹوں پر ہر وقت مُسکراہٹ رہتی تھی، ہر وقت ہشاش بشاش نظر آتا تھا، ہر ایک سے ہنسکر ملنے اور ملیمی سے بات کرنے کی اُسے عادت ہوگئی تھی +

اُسے کچھ معلوم نہ تھا کہ میرے ماں باپ کون ہیں، ابھی بچہ ہی سا تھا کہ فکرِ معاش نے اُسے وطن سے دور لا پھینکا تھا، وہ زمانہ اچھا، بُرا جیسا کچھ بھی کٹا، کٹ گیا مگر اب اُس کی حالت بہت کچھ سنور چکی تھی، مُلک مُلک میں ٹھوکریں کھانے سے اُس کا دل اُچاٹ ہوگیا تھا، اور اب اُس نے ٹھان لیا تھا کہ کہیں ایک جگہ جم کر بیٹھ جائے اور زندگی کے باقی دن آرام اور چین سے گذار دے، اسی لئے پیرس کی فضا کو اپنے موافق پاکر وہ یہیں کا ہو رہا تھا +

اُس کے سر کے بال اور بڑی بڑی مونچھیں سفید ہونی شروع ہوگئی تھیں، وہ ایک انوکھی اور نرالی زبان بولا کرتا تھا، جس جس ملک میں پہنچا، وہاں وہاں کے محاورے اور الفاظ اُس کی زبان پر چڑھتے گئے، ہوتے ہوتے اُس کی بولی مل جل کر ایک ایسی معجون بن گئی کہ دنیا بھر میں شاید ہی کوئی زبان ہوگی جس کا ایک آدھ محاورہ یا لفظ اُس کی بولی میں نہ ملا ہوا ہو، پھر بھی چاہے اُس کی بات کسی کی سمجھ میں آئے، چاہے نہ آئے، لیکن اُس کی آواز میں ایک ایسا ترنم تھا کہ جو کچھ بھی کہتا سُننے والے کو گیت کی طرح لبھا لیتا تھا +

پیرس میں رہ کر اُس نے اپنی وضع بدل ڈالی تھی، سر پر ترکی ٹوپی کی جگہ ایک لمبا سا ٹوپ پہنتا اور تن پر بھورے رنگ کا فراک کوٹ اور ڈھیلے پائنچے کی پتلون۔ گلے میں بڑی سی سفید نکٹائی، پاؤں میں ولائتی بوٹ اور ہاتھ میں نیزوں سے بھرا ہوا ایک صندوقچہ لئے، بڑی آن بان کے ساتھ پیرس کے قہوہ خانوں میں گھوما کرتا تھا، اُس کے صندوقچہ میں کئی قسم کے زیور تھے، انگوٹھیاں تھیں، جن پر

پھول کی پنکھڑی کی وضع کے تین تین موتی جڑے ہوئے تھے، اور موتیوں کے بیچ میں الماس کا ایک ایک نگینہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گل سہ برگ پر شبنم کی ایک بوند لرز رہی ہے، کانوں کے لئے نیلم کے آویزے تھے، سونے کی تاروں میں پروئے ہوئے پکھراجوں کا ہار، لاکٹ وغیرہ اس کے علاوہ اُس کی ہر جیب میں دو ہرے کیس والی ایک ایک گھڑی تھی، ان گھڑیوں کو نکال نکال کر گاہک کو دکھایا کرتا تھا +

"مونسی! سونا ہے سونا!"

جہاں "مونسی" نے ذرا سا بھی شوق ظاہر کیا، یہ بڑے تحمل کے ساتھ اُس کے برابر ہی دوسری کرسی پر جا بیٹھا اور ایک لمبی "فو" کے ساتھ اپنے صندوقچہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ ایسے ایسے عجائبات دکھانے والا ہے جو نہ آنکھوں نے دیکھے، نہ کانوں نے سُنے، اب زیور دکھانے بیٹھتا تو اُسی وقت بس کرتا جب صندوقچہ میں کوئی چیز نہ رہتی جو گاہک نے دیکھ نہ لی ہو وہ نہایت خوبصورتی اور نزاکت کے ساتھ اپنے زیور کی نمائش کیا کرتا تھا جب کسی خاتون کے گلے میں موتیوں کا ہار یا اُنگلی میں انگوٹھی پہناتا تو اُس کا ہاتھ کبوتر کے پَر کی طرح پھیل جاتا +

اس خیال سے کہ یہ نہ سہی وہ ہی کچھ تو لے ہی لیگا وہ گاہک کو جواہرات دکھاتے دکھاتے اپنی جیبوں سے گھڑیوں کو بھی نکال کر دکھانے لگ جاتا اگر گاہک کوئی معمولی سا شخص ہوتا تو اُس کے مطابق اپنی جیب سے ایک سیدھی سادی کم قیمت والی گھڑی نکالتا، اور اگر گاہک کوئی بانکا چھبیلا عاشق مزاج ہوتا تو اُس کے لئے وہ خوشنما، بڑھیا اور صحیح وقت بتلانے والی گھڑی نکالتا جس کی پشت پر ایک مستِ شباب حسینہ کی رنگین تصویر نقش ہوتی تھی، جو شامپین کی بوتل مُنہ سے لگائے غٹاغٹ شراب چڑھا رہی ہو +

"مونسی، بالکل نایاب چیز ہے"+

آدھی رات کے قریب پھر پھرا کر، وہ ہیلڈار کے محلے میں، چھٹی منزل پر اپنے کمرے میں واپس آجاتا، کیونکہ وہ آخر اپنے لئے تھوڑی سی جائداد بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا، گرمی کے موسم میں جب تمام پیرس پر اُداسی سی چھاتی ہے، اور بازاروں میں آتے جاتے لوگ یوں دکھائی دیتے ہیں، جیسے کسی جنازے کے ساتھ جا رہے ہوں، وہ اپنے ہی گھر میں پڑا رہتا، لیکن جب بیکار پڑے پڑے طبیعت گھبرا جاتی تو وہ یونہی دل بہلانے کے لئے چھڑکاؤ کرنے والی گاڑی کے گاڑی بان، سپاہی اور پھول بیچنے والوں کو اپنی چیزیں دکھایا کرتا +

وہ تجن قہوہ خانوں میں گانے والی میڈموازیل تجن کے سوا اور کسی کو بھی نہیں جانتا تھا، جو کبھی کبھی، ایسے وقت اُس سے ملنے آجاتی تھی، جب اُسے روپے کی ضرورت ہوا کرتی تھی، یہ تجن ایک خوفناک عورت تھی، چالیس کے لگ بھگ، گال نسیم کی "راحت جاں" سے کہیں زیادہ رنگے ہوئے لیکن جن میں نسیم کی "راحت جاں" سے کہیں کم مٹھاس تھی، پر وہ اُسے دل و جان سے چاہتا بلکہ پرستش کیا کرتا تھا، جب وہ تجن کو ملنے آتی تو وہ اُس کی طرف خوف سے دیکھا کرتا تھا، کیونکہ وہ اُس کے صندوقچہ کے جواہرات اُڑا لینے میں ذرا بخل سے کام نہ لیتی تھی، وہ صندوقچہ سے کبھی کوئی انگوٹھی، کبھی مالا، کبھی طلائی زنجیر اسی طرح اُٹھا لیتی، جس طرح ایک طشتری میں رکھے ہوئے انگور کے گچھے سے کوئی انگور توڑ لے، اٹھارہ برس سے اُس کی جھڑکیوں، ظلموں، بے رحمیوں، مکاریوں اور

بے وفائیوں نے نسیم کو کچل رکھا تھا، اس پر بھی وہ اسکی محبت کا ویسے ہی دم بھرتا تھا، اُس نے اپنے کمرے کی ایک چابی اُسے دے رکھی تھی، اسی لئے جب اُس کا جی چاہتا بے روک ٹوک چلی آتی تھی +

اُس وقت دربان نسیم کو مذاق کے طور پر کہا کرتا "نسیم جلد پہنچ تیری اونٹنی کب سے تیری راہ تک رہی ہے" یہ سُنکر نسیم کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا، وہ حد درجہ کا ملنسار حد درجہ کا ہنس مکھ، حد درجہ کا خوشامدی بن جاتا، اُس وقت اُس کی یہی خواہش ہوتی کہ ہر شخص اُس سے خوش ہو، جواب میں دربان سے کہتا "کیوں جی دربان صاحب کیا میڈم — اے، اے میری اونٹنی نے کچھ پوچھا تو نہیں تھا؟

پھر وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہوتا اور رجّن کے پاس پہنچکر لمبی سانس لے کر کہتا :-

"میری فاختہ! میں ہوں، فکر نہ کر" +

کئی بار رجّن نسیم کو وحشیانہ خوشی سے الوداع کہہ کہہ کر نامعلوموں کے ساتھ شہر بہ شہر گھومنے کو چل دی تھی، جہاں سے اُسے دولت اور شہرت حاصل ہونے کی توقع ہوتی تھی، مگر جہاں سے وہ ہمیشہ بے عزت ہو کر اور اپنا سا مُنہ لیکر واپس لوٹ آتی تھی، چہرہ اُترا ہوا، پہلے سے بھی دُبلی، اور بد مزاج، اور مزا یہ کہ اپنی ناکامی کا سارا غصّہ نسیم پر نکالا کرتی تھی، اس عورت کا غلام نسیم اسے دوبارہ دیکھتے ہی خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا، اس بے درد عورت نے، جس کے پاؤں وہ ادب اور احترام سے چوما کرتا تھا، کچھ ایسا جادو کر دیا تھا کہ بلا سے وہ نسیم کے کتنے ہی جواہرات کیوں نہ چھین لے، بلا سے کتنی ہی اذیتیں کیوں نہ پہنچائے، وہ اُف تک نہ کرتا تھا +

ایک رات گھر لوٹا تو رجّن کو اپنے بستر پر بایا، خوشی سے اُس کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا، اپنی دانست میں وہ اُسے کھو بیٹھا تھا، سمجھ چکا تھا کہ یورپ کے کسی دور دراز حصّے میں روپوش ہو گئی ہے، مگر وہ تین ہفتے اِدھر اُدھر گھوم کر آج پھر آ دھمکی تھی +

نسیم نے اُس کی طرف پیار سے دیکھا ہی تھا کہ وہ بولی "کیوں بے تو یہاں کیا بنا رہا ہے"؟

اس انوکھے سوال پر نسیم کچھ چونکتا ہو گیا، وہ پھر بولی "میں تجھ سے یہ پوچھتی ہوں کہ آخر تو یہاں کیا بنا رہا ہے جبکہ تیرے سب بھائی جنگ کے میدان میں اپنی جانیں لڑا رہے ہیں"؟

اُس نے اس سوال کو ہنسی ہنسی میں ٹالنا چاہا +

"جنگ؟ میری فاختہ میں بوڑھا آدمی ہوں، مجھے ان سیاسی باتوں سے کیا سروکار، میں تو جواہرات بیچتا ہوں جواہرات، اور کسی بات کی طرف دھیان نہیں دیتا ——"

"کیا تو تُرک ہے، بتا ہے کہ نہیں"؟

"نہیں، نہیں میں تو جوہری ہوں" +

"اخبار نہیں پڑھتا"؟

اُس نے سر ہلا کر نفی میں جواب دیا، اخبار پر گرہ سے پیسے خرچ ہوتے تھے، اور پھر پڑھنا بھی بالکل نہیں آتا تھا، غرض اس قسم کی باتیں نسیم کے لئے کچھ دلچسپی کا باعث نہ تھیں، اُس کی سب سے بڑی خوشی یہی تھی کہ رجّن اُس سے پیار اور محبت کی باتیں کرے، جن کی ابتدا کبھی کبھی پَروں والی ٹوپی یا بوٹ کی فرمائش پر ہوا کرتی تھی، مگر نہ جانے کیوں رجّن آج اسی بات پر اڑی ہوئی تھی +

"اچھا بتا تو کہاں سے آیا ہے"؟

اُس نے خیال دوڑایا، وطن سے آئے ہوئے ایک زمانہ

ہو چکا تھا، سوچ سوچکر ایک عجیب سا مگر بھلا سا نام لیا، اس سرزمین میں ویسی ہی دھوپ ویسا ہی نیلگون آسمان تو تھا مگر نہ تو وہاں پیرس ایسی دلکشیاں تھیں نہ آزادیاں، خیال نے نظروں کے آگے اُس کے وطن کی تصویر کھینچ دی، بچپن کا زمانہ آنکھوں کے سامنے تھا، معمولی کُرتہ پہنے، کبھی کھلونوں کی جگہ گتّے کے پتّوں سے کھیلتا، تو کبھی ہم عمر بچّوں کے ساتھ، روٹی کے ایک ٹکڑے کے لئے بلبلا رہا ہے +

اُس نے اپنے شانوں کو جھٹک دیا، بھلا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُس فاقوں کے مارے، گندے غلیظ بچّے اور اُس ایسے معزز جوہری میں کسی قسم کا کچھ تعلّق ہو، جس کے پاس جواہرات کا بھرا ہوا صندوقچہ ہو، اچھے سے اچھا لباس زیب تن کرتا ہو، پورا پورا سوداگر بن گیا ہو، پیرس ایسے شہر میں رہتا ہو گھر کا سب ساز و سامان بھی اُسی کی ملکیت ہو، پھر ان سب پر طرفہ یہ کہ بجن جیسی سُنہری بالوں والی نازآفریں محبوبہ پہلو میں ہو؟

منّت بھری آواز میں کہنے لگا:۔

"پیاری اپنے نسیم کو چوم لے، اور ان خون خرابے کی باتوں پر خاک ڈال، جانے دے اُن غریب فقیروں کا کیا ذکر کرتی ہے ...."

"اگر وہ تجھے زبردستی جنگ پر بھیجدیں تو تیری ڈر کے مارے رُوح ہی فنا ہو جائے، اچھا بتا تیری کتنی عمر ہے؟"

اُس نے ایک ہلکا سا اشارہ کیا، وہ نہیں جانتا تھا، اپنے متعلق کچھ علم نہ تھا، وہ نسیم تھا اور بس، کبھی وسیع دنیا میں ٹھائیں بیٹھا پھرا کرتا تھا، مگر اب پھر پھر کر تھک گیا تھا، اُس کی خواہش تھی کہ ایک چھوٹا سا گھر بنا لے اور آرام سے اپنی زندگی گذار دے، اپنے بیوپار اور بجن کے سوا اور کسی چیز کا خیال تک دل میں نہ لاتا تھا، پھر بھلا ان گئی گذری باتوں کے پوچھنے سے فائدہ!

جھنجھلا کے اس نے اپنے ماتھے کو ٹھونکا، اور کہا "میری فاختہ بس یہ سمجھ لے ایک بوڑھا بہت بوڑھا حیوان ہے، جو تجھے پیار کرتا ہے ...."

لیکن آج اُس کی پھسلا لینے والی سب میٹھی میٹھی باتیں بے اثر ثابت ہو رہی تھیں، مُسکراہٹ میں وہ پہلی سی شگفتگی نہیں رہی تھی، آنکھیں جو قہوہ خانوں کے ہنڈوں کی تیز روشنی سے چندھیائی ہوئی تھیں، آج اپنی طرف کھینچنے کی بجائے التجاؤں کے ساتھ ڈبڈبا رہی تھیں +

"تو تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ تیرا مُلک لڑ رہا ہے، اچھا ٹھہر" یہ کہکر وہ اُٹھی اُس کے چہرے سے ترشروئی کے وہ آثار ظاہر ہو رہے تھے جو کبھی تنگی کے دنوں میں پائے جاتے تھے اور حرکات میں وہ پھُرتی، جو اُن موقعوں پر آجاتی تھی، جب وہ کوئی نیا فتنہ بپا کرنے والی ہو +

"لے میں تیرے ہی لئے اخبار خرید لائی ہوں اُس تجھے پڑھکر سُناتی ہوں" +

نسیم نہیں چاہتا تھا کہ ان فضول باتوں سے اپنا وقت گنوائے، لیکن مجبور ہو کر بیٹھ گیا، سر سے ابھی ٹوپ بھی نہیں اُتارا تھا، صندوقچہ گھٹنوں پر ہی تھا، گھنیوں سے اپنے پہلوؤں کو بھینچ رکھا تھا کہ اگر بجن زور سے دھکا دے بھی تو گھڑیوں کو ٹھوکر نہ لگے اور وہ ٹوٹ نہ جائیں +

وہ اخبار جو بجن ساتھ لیتی آئی تھی، نکال کر میز پر پھیلا دیا +

"دیکھ تیرے ترکوں کی کیسی گت بن رہی ہے تجھے ابھی سب معلوم ہو جائیگا"+

نسیم نے اُس کی طرف بےچینی سے دیکھا، کیا ہی اچھا ہو اگر مزے سے لیٹ کر صرف ایک دوسرے ہی کے خیال سے لو لگائے میٹھی نیند سو جائیں، لیکن نہ جانے آج بجن کو کیا

ہوگیا تھا کہ وہ ایک ہی خیال پر تُلی ہوئی تھی، اُس نے پڑھنا شروع کر دیا، نسیم جوں جوں سُنتا رہا اُس کے دل میں بچن کی ایک عظیم عزّت پیدا ہوتی گئی، وہ عظیم عزت جو اَن پڑھ کے دل میں پڑھے لکھے کے لئے پیدا ہوجاتی ہے، کیسی ہوشیار ہے یہ بچن! کیسی رسیلی، کیسی پیاری آواز پائی ہے .....

پھر یک لخت وہ سب سمجھ گیا، یہ ایک دہشتناک شکست کی خبر تھی، بندوقوں کے انبار . . . موت . . . . دہشت . . . ہیضہ . . . . بھوک، پھر وہ بھی ترکوں کی بھوک جس سے نسیم اچھی طرح واقف تھا، اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ اُٹھا +

"دیکھا کیسی گت بنی، دیکھا کیسی گت بنی" بچن نے دیوانہ مسرّت سے چلّا کر کہا +

بے گور و کفن لاشیں . . . . قیدی . . . . دم توڑنے والے زخمیوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں . . . . ناگہانی موت . . . . سخت عذاب کی موت . . . گاؤں کے نام جو ایک ایک کر کے چھین لئے گئے تھے، نسیم کے دماغ میں بھولے ہوئے خواب کی طرح یاد آنے لگے، مدّت ہوئی وہ اُن ناموں کو سُن چکا تھا، ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دُہرانے لگا، بونار حصار . . . کراغاج . . . . وزعا . . . آہ" +

جب بچن پڑھ چکی تو اُس نے آنکھیں اُٹھا کر دیکھا، نسیم ابھی تک جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا، صندوقچہ گھٹنوں ہی پر تھا، مگر وہ تھر تھر کانپ رہا تھا، بچن نے اپنی عمر میں کبھی کسی کو اس طرح کانپتے نہ دیکھا تھا، وہ کچھ گھبرا سی گئی +

"بیمار تو نہیں ہو"؟

وہ اور بھی تھرّانے لگا، بچن نے حقارت سے تنقید لگایا،

"ابے جا گدھا، مکّار، فریبی کہیں کا" +

مگر نسیم اُٹھا، اور تن کر بچن کے سامنے آگیا، یکایک بچن پر دہشت چھا گئی، نسیم کی حالت دگرگونہ ہو رہی تھی، ان چند لمحوں میں، اُس نے ایسی سخت، ایسی شدید، ایسی ناقابلِ برداشت تکلیف اُٹھائی، جیسے ہزاروں نشتر اُس کے بدن میں چبھوئے جا رہے ہوں، پھر اچانک اُس کی ساری تکلیف، قہر اور غصّے میں بدل گئی، آنکھوں سے خون برسنے لگا چاہتا تھا کہ اس ناپاک عورت کی مونڈی مروڑ کر رکھ دے +

بچن دل ہی دل میں پچھتا رہی تھی، اُسے کیا خبر تھی کہ نسیم کے دل میں اس کی شرارت سے اسقدر ٹھیس لگیگی، اُسے کیا معلوم تھا کہ نسیم کے دل میں جوش پیدا ہوجائیگا، جسے اپنے ملک اور ہم وطنوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں تھی اب معلوم ہوا کہ اُس سے کیسی سخت غلطی ہوئی، اُسے یہ باتیں نہ کہنی چاہیئے تھیں، اس تکلیف دہ ذکر چھیڑنے سے تو اچھا تھا کہ اُسی وقت پڑھ کر سو جاتے، وہ نسیم سے معافی مانگنے لگی، لیکن نسیم نے اُس کی ٹوپی اور لباس اُس کی طرف پھینکدیا، اور ڈپٹ کر کہا:-

"بس ہٹ جا، ابھی نکل جا، دُور ہو جا" +

خونخوار ہو کر بچن نے جلد جلد لباس پہنا، اب کیا تھا آن کی آن میں وہی بے وقوف بوڑھا ایک پورا ترک بن گیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر بچن جلد ہی آنکھوں کے آگے سے دُور نہ ہوئی، تو اُٹھا کر کھڑکی سے نیچے پھینکدیگا +

وہ کوارٹر کو زور سے دھکا دیکر ہانپتی کانپتی باہر نکل بھاگی، نسیم اکیلا رہ گیا، اُس نے ایک صندوق کھولا، اور کپڑوں کو اُلٹ پلٹ کر نیچے سے اپنی پُرانی ٹوپی نکال لی، یہ وہی ترکی ٹوپی تھی جسے وہ اُس زمانہ میں پہنا کرتا تھا، جب "راحت جاں" اور بادامی کیک بیچا کرتا تھا، یہ ٹوپی اگرچہ سب کی سب کرم خوردہ تھی مگر اُس نے اپنا اونچا ٹوپ سر سے اُتار کر حقارت سے دور پھینکدیا، اور یہی ترکی ٹوپی

بن لی، پھر کسی زبردست قوت نے اُس کا سر نیچے جھکا دیا
الفاظ رسیلے مگر عجیب عجیب سے، اُس کے ہونٹوں سے نکلنے
لگے، یہ وہی الفاظ تھے جنہیں جب وہ بچہ تھا توتلا بولا کرتا تھا +
نورانی الفاظ، خوشبو بھرے الفاظ، درد بھرے الفاظ
الفاظ جن کے معنے اُس کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا کہ
یہ سب مل کر ایک دعا بن جاتے ہیں +
وہ سسکیاں لیتا ہوا گھٹنوں کے بل گر پڑا ......
اور اُس کا مُنہ مکّہ کی طرف پھر گیا +

غلام عبّاس

پسِ پردہ مجموعہ مضامین جناب آغا حیدر صاحب دہلوی، مطبوعہ مسلم یونیورسٹی پریس حجم ۱۰۰ صفحات قیمت عہر یہ مجموعہ مضامین جناب مولانا عبدالباسط صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ کا یکجا کردہ ہے مولانا باسط کی یہ کوشش ہر پہلو سے کامیاب اور اُردو علم ادب میں گرانقدر اضافہ کا باعث ہے، ٹائیٹل، کاغذ لکھائی چھپائی کی خوبیوں کے علاوہ حُسنِ انتخاب نے اس کتاب کو چار چاند لگا دئے ہیں، آغا حیدر اُردو زبان کے مشہور ادیب ہیں، آپ کے مضامین "عورتوں کی زبان" میں لکھے ہوتے ہیں، جو بہت پسند کی جاتی ہے، ہر ایک مضمون نہ صرف زبان کی چاشنی رکھتا ہے بلکہ حیات انسانی کے مختلف مراحل پر ناقدانہ انداز میں نظر ڈالتا ہے +

دفتر علی گڑھ میگزین، علی گڑھ سے طلب کیجئے +

نظامی قدوسی

"تارا"

(افسانہ)

[محترمہ سلطانہ سعید کے قلم سے]

اب سے بارہ برس پہلے ڈاکٹر صغیر احمد نے کلکتہ میں ڈکریہ کی مشہور سڑک کے اختتام پر اپنا مطب کھولا، آجکل ڈاکٹروں کی ویسے ہی کثرت ہے، اور کلکتہ جیسی جگہ میں جہاں اس جیسی ہزاروں ہیں اور ان میں لاتعداد ڈاکٹر، کسی کو اس واقعہ کی خبر بھی نہیں ہوئی، آس پاس کے دس بیس آدمیوں کے سوائے کسی کو اس کا پتہ بھی نہیں ہوا کہ یہاں ایک اور حکیم کا اضافہ ہو گیا ہے +

جیسی استطاعت تھی اُنہوں نے بالاخانے کے چار کمرے کرایہ پہ لئے، ایک میں اُن کا دوائی خانہ تھا، اور اسی میں مریض بھی دیکھ لیا کرتے تھے، دوسرے کمرے میں کھانے اور سونے کا انتظام تھا، باقی دو چھوٹے چھوٹے کمروں میں غسل خانہ باورچیخانہ اور نوکر کے لئے جگہ تھی +

ڈاکٹر صاحب نے حالانکہ اپنی ڈاکٹری جمانے میں روپیہ تھوڑا ہی خرچ کیا تھا مگر اُمیدیں بہت قوی تھیں، ایسی اُمیدیں کم ہی پوری ہوا کرتی ہیں، ایک اور چیز تھی جس میں اُن کا کافی روپیہ خرچ ہوا تھا، اور وہ "سائن بورڈ" تھا، پورے پچاس روپے میں اتنا بڑا بورڈ تیار ہوا کہ جتنی اُس مکان یا دکان کی لمبائی تھی +

ڈھائی مہینہ ہو گئے مگر دو تین روپیہ روز سے زیادہ کی آمدنی نہیں ہوتی تھی، اس سے زیادہ کا تو مکان کا کرایہ ہی تھا، مگر ڈاکٹر صاحب ایسے خوش دل اور بے فکرے واقع ہوئے تھے کہ جب سنیچر کے دن رات کو دکان بند کی اور آمدنی میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہوا تھا تو وہ اس طرح سیٹی بجا رہے تھے کہ جیسے پچاس ساٹھ روپیہ کی آمدنی ہوئی ہے +

جب تمام دن کی محنت کر چکے تو ایک جگہ کلکتہ بھر میں ایسی تھی جہاں ان کو اپنی آمدنی کے خیال کو رفع کرنے کا کافی انتظام تھا، کوئی ایک میل کے فاصلہ پر بابو جگدیش چندر بوس کا مکان تھا، ان کی خوبصورت لڑکی ترلا کماری کو اُنسے اسقدر اُنس تھا جتنا کہ مریضوں کو بے اعتقادی تھی +

ایک نئے ڈاکٹر اور ایک نئے دوست میں بڑا فرق ہوتا ہے، شروع شروع میں ڈاکٹر صاحب ایک ملاقاتی تھے

پھر رفتہ رفتہ دوست بن گئے۔ آخیر کو یہ نوبت آئی کہ جگدیش چند اُن کو اپنا بیٹا سمجھنے لگے +

نرملا کو ایک ساتھی، وہ کسقدر خوش تھی، جب ڈاکٹر صاحب آتے تو اُس کے پاس ہزاروں باتیں کرنے کو ہوتیں مریض کیسے پیش آتے ہیں؟ آج کتنی آمدنی ہوئی؟ آج کیوں دیر سے آئے؟

ڈاکٹر صاحب ان سب کا جھوٹا سچا جواب دیدیا کرتے، ایک مہینہ سے آمدنی میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی، نرملا نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب میں ایک پیر صاحب کو جانتی ہوں وہ بڑے پہنچے ہوئے ہیں، وہ بڑے اچھے تعویذ دیتے ہیں ایک میری سہیلی کو ضرورت تھی، اُس کا شوہر برسوں سے چھوٹا ہوا تھا، اس تعویذ کے دیتے ہی ہفتہ بھر میں آگیا، ایک اور کمار کو جانتی ہوں، اس کو کہیں روزی نہیں ملتی تھی، جب سے اُنہوں نے تعویذ دیا ہے، کام سے لگا ہوا ہے اور کسی کا محتاج نہیں +

ڈاکٹر کو ایک لمحہ کے لئے تو خیال ہوا کہ وہ ڈاکٹر ہے ان تعویذ وغیرہ پر یقین کرنا فضول ہے، مگر بیکاری تھی کیا نہ کرتا، نرملا سے کہا کہ کیا اچھا ہوتا کہ ایک تم مجھے بھی منگوا دیتیں، اس طرح یہ طے ہوا کہ وہ اور نرملا پیر صاحب کے پاس جائینگے

اگلے دن چار بجے دکان بند کرکے نرملا کے ساتھ ڈاکٹر صاحب پیر صاحب کے پاس پہنچے، پیر صاحب سے کہا کہ اس اس طرح سے ایک مہینہ ہوگیا ہے اور آمدنی ہی نہیں کوئی دعا کریں، یا تعویذ دیں، نرملا نے بھی ہاتھ جوڑ کر التجا کی کہ میرے بھائی بڑی تکلیف میں ہیں، کچھ ہو جانا چاہئے میری سہیلی اب تک آپکو دعا دیتی ہے +

پیر صاحب نے اپنے مراقبہ سے اُٹھ کر اُن کو ایک پیتل کا تارا دیا جس پر کچھ عربی کے الفاظ کھدے ہوئے تھے اور کہا "جا، اس کو اپنے دروازہ پر لگالے، تیرا کام ہوجائیگا اور جب کام ہوجاوے تو سو مسکین کھلا دینا، خدا تیرے لئے برکت دیگا" نرملا نے بڑے اعتقاد سے کہا کہ بھائی جی کہیں اس کی بے ادبی نہ ہو جائے، اس کو بڑے احتیاط سے مکان کے دروازہ پر لگا دیجیگا، اور دیکھئے بہت بڑی کیل سے لگائیگا، کوئی چرا نہ لیجائے، دروازہ پر لگا ہوا جانے والے دیکھیں گے اور سب ڈاکٹروں کو چھوڑ کر آپ کے پاس آئینگے، اور آپ ہی آپ کا نام ہوگا، اور آمدنی +

ڈاکٹر صغیر احمد اس نقش کو پاکر اسقدر خوش تھے کہ انکو ساری دولت مل گئی، یا کم از کم اس کی کنجی، اگلے دن صبح ہی ایک لوہار کے یہاں سے تین انچ کی کیل خریدی اور اپنے دروازہ کے بیچ میں وہ تارا ٹھونک دیا، ایک قدم پیچھے ہٹے اور دیکھا، سڑک پر گئے اور دیکھا، تعجب کی بات تھی کہ حالانکہ وہ تارا کسی طرح سے ایک روپیہ سے زیادہ بڑا نہ تھا، اور نہ ہی بہت چمکدار، مگر سڑک کے دوسرے کنارے سے بھی صاف طور سے دکھائی دیتا تھا، راہ چلتے رُکتے تھے کہ اس کو غور سے دیکھ سکیں، ایک دو دفعہ ٹریم بھی رُکی، شاید اسی کے دیکھنے کے لئے لوگوں نے رُکوائی ہو، اب وہ مطمئن تھے، ان کے خیال میں مریضوں کا ایک غول آجاویگا اور بھیڑ ایسی ہوگی کہ انتظام نہ ہوسکیگا، مگر ان سب میں سے کچھ نہیں ہوا، لوگ آئے روزانہ سے زیادہ مگر بھیڑ پانچ دن کے لوگ جمع کرکے بھی نہ ہوتی +

شام کو حساب لگایا تو اُس دن دس روپے کی آمدنی ہوئی

چھ بجے شام کے ایک بہت بڑی اور لمبی موٹر گذری، اس میں ایک بڈھا جس کے چہرہ پر ہزاروں جھرّیاں تھیں بیٹھا تھا، اُس نے تارے کو بڑے غور سے دیکھا اور ڈرائیور

سے کچھ کہا، ڈاکٹر صاحب سمجھے کہ روکنے کو کہتا ہے، اگر موٹر چلی گئی، جیسے اور بہت سی دن میں گذر جاتی تھیں +

رات کے وقت قریب دس بجے کے کسی کی موٹر دروازہ پر رُکی، ڈاکٹر صغیر احمد اس وقت پلنگ پر لیٹے دن کے واقعات پر غور کر رہے تھے، پھر زینہ پر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور آخرکار، دستک کی آواز آئی، آج تک دس بجے رات کو ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی نہیں آیا، ڈاکٹر صاحب نے گھبرا کر دروازہ کھولا +

دیکھا تو وہی بڈھا تھا جو موٹر میں سے تارے کو غور سے دیکھ رہا تھا +

ڈاکٹر نے بڈھے سے پوچھا کہ اس وقت کیسے آئے،

بڈھا۔ "کیا ڈاکٹر صغیر احمد آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں"

بڈھے نے ذرا مشتبہ نگاہ سے غور کیا، جیسے کوئی اناڑی ڈاکٹر کو پرانا تجربہ کار مریض بھانپتا ہے، اور پھر اُس نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب مجھے بدہضمی ہو رہی ہے، کیا آپ سوڈا کھانے کا دے سکتے ہیں، اس وقت آپ کتنا دے سکتے ہیں؟"

ڈاکٹر صاحب ذرا چونکے کہ اس وقت بڈھے نے اتنی تکلیف صرف سوڈا لینے کے لئے کیوں کی، محض بدہضمی کے لئے اور خاص طور سے میری دُکان پر کیوں آئے، بہرحال یہ خیال کرتے ہوئے کہ اب اس کو خوش کرنے کیلئے دے ہی دیا جائے تو کیا حرج ہے، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا:۔

"آپ کو کتنا چاہئے"؟

بڈھے نے کہا "آدھی چھٹانک! کیا آپ پورا آدھی چھٹانک دے سکتے ہیں"+

"ضرور" اور جلدی سے جا کر احتیاط سے آدھی چھٹانک سوڈا تولا اور ایک پیکٹ بنا کر اُس پر چیرے کی مُہر لگادی اور لاکر بڈھے کو دیا +

بڈھے کی باچھیں پیکٹ کو دیکھ کر کان تک کھل گئیں "اور اُس نے اتنی جلدی مجھ سے لیکر اپنے کوٹ کی اندر کی جیب میں رکھ لیا کہ میں سمجھا کہ ضرور یہ کوئی سوڈے کا پاگل ہے، اپنی جیب سے دوسرا لفافہ نکال کر مجھے دیا کہ اُس میں ٹھیک ہوگا" اور چلنے لگا، دروازہ کے پاس جا کر رُکا اور کہا کہ "یار تم نے تارا تو بہت بڑا لگایا ہے، کہیں پکڑے نہ جاؤ، اس سے چھوٹا کیوں نہیں لگایا"+

ڈاکٹر ہنسا، اُنھوں نے پڑھا تھا کہ ہاضمے کے درست ہونے سے آدمی بشاش ہوتا ہے، مگر بدہضمی کے بعد بھی یہ آدمی کتنا خوش تھا، اس نے لفافہ کھولا تو اس میں سَو سَو کے پانچ نوٹ تھے +

وہ ان کو دیکھ کر دنگ رہ گیا، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار آنے کی چیز کے یہ بڈھا پانچ سو روپیہ دے جاوے، ضرور اس نے کوئی غلطی کی ہے، خیر پھر کبھی آئیگا تو لیجائیگا +

اگلے دن شام کو وہ نرملا کے پاس گیا، نرملا نے دوڑ کر پوچھا "بھائی جی اس تارے کا کچھ اثر بھی ہوا، یا نہیں"؟ ڈاکٹر نے کہا "کوئی خاص اثر تو نہیں ہوا، صرف ایک واقعہ پیش آیا ہے" اور اُس نے بڈھے کی سرگذشت اور پانچ سو روپیہ کا حال سُنایا، نرملا نے کہا کہ بڑھاوہ روپیہ آپ ہی کو دے گیا ہے، بھلا کوئی غلطی سے بھی روپیہ دیدیا کرتا ہے، یہ سب اسی تارے کا اثر ہے، اب کوئی اس روپیہ کو لینے نہیں آئیگا، اور دیکھئے اس روپیہ کو آپ بینک میں جمع کر دیں، وہاں سے واپسی پر ڈاکٹر نے اپنے دوست کے کہنے کے بموجب اس روپیہ کو بینک میں جمع کر دیا +

یہ پہلی رقم تھی جو وہ جمع کر سکے +

اُس دن معمول سے زیادہ آمدنی ہوئی، شام کو میزان اکیس روپیہ تھا۔ لوگ آنا شروع ہو گئے تھے اور وہ اب ضرور ایک کامیاب ڈاکٹر ہو جائیگا، ڈاکٹر کو یقین ہونے لگا کہ تارے کا کچھ کچھ اثر ضرور ہو رہا ہے +

دن بھر کے کام کے بعد جب وہ مکان بند کر کے آرام کے لئے بیٹھا تو کسی نے دروازہ پر دستک دی، جا کر دروازہ کھولا تو ایک عورت دکھائی دی، بظاہر تو تندرست معلوم ہوتی تھی مگر چلنے پھرنے میں رعشہ تھا، اس کا چہرہ زردی مائل سیاہ تھا، مگر کپڑوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایسی نہیں کہ خود اپنا علاج کرتی پھرے، اس نے سوال کیا :-

"کیا آپ کا نام ڈاکٹر صغیر احمد ہے"؟

"جی ہاں" ڈاکٹر نے کہا +

اور اسی طریقہ سے جیسے اُس بڈھے نے اسکا جائزہ لیا تھا، اس عورت نے بھی دیکھا، اس نے اشارہ کیا کہ دروازہ بند کر دیا جائے، ڈاکٹر اس پر ذرا متعجب ہوا مگر اس کو خوش کرنے کے لئے بند کر دیا +

دروازہ بند ہونے کے بعد عورت نے کہا "مجھے بدہضمی ہے، مجھے کچھ سوڈے کی ضرورت ہے، آپ کتنا دے سکتے ہیں"؟

"سوڈا! ہاں میں سوڈا دے سکتا ہوں" ڈاکٹر کو تعجب ہوا کہ اس سے لوگ سوڈا کیوں مانگتے ہیں، اس کے یہاں کسی خاص طور کا سوڈا تو نہیں ہوتا +

عورت نے کہا "میں نے آج ہی وہ تارا دیکھا ہے کتنا خوبصورت ہے مجھے یقین ہے، مجھے بدہضمی کی شکایت ہو گئی ہے، اور سوڈے کی ضرورت ہے، کیا آپ آدھی چھٹانک دے سکتے ہیں"؟

"ابھی لاتا ہوں" ڈاکٹر نے کہا اور وہ دوائی خانہ میں سوڈا لینے گیا، وہ سوچتا رہا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے کہ ایسے رئیس آدمیوں کو بدہضمی ہوتی ہے، اور اس کے علاج کے لئے خاص طور پر میرے پاس آتے ہیں، اُس بڈھے اور اس عورت سے کوئی خاص تعلق تو نہیں؟ ان دونوں نے اسی قسم کے سوالات کئے ہیں، مگر یہ ممکن نہیں ہو سکتا، اور سوڈا، ایسی معمولی چیز کسی اور دوکان پر بھی مل سکتی ہے، میرے یہاں، میرا نام پوچھ کر سوڈا کیوں خریدا جاتا ہے!

اور جیسے اُس بڈھے نے جلدی سے سوڈے کا پیکٹ لیا تھا اس عورت نے بھی وہ پیکٹ لیا +

"میں آپ کا بہت شکریہ ادا کرتی ہوں، قیمت گلدان کے پاس رکھی ہے" یہ کہکر وہ چلی گئی +

ڈاکٹر اُس کے پیچھے پیچھے باہر تک گیا، دیکھا کہ وہ عورت تیزی سے اِدھر اُدھر دیکھ دیکھ کر جا رہی ہے، کوئی پچاس قدم پر ایک لمبی موٹر کھڑی تھی اس میں وہ سوار ہو گئی اور موٹر چلی گئی +

وہاں سے لوٹ کر ڈاکٹر گلدان کے پاس آیا، اس کے خیال میں وہاں ایک چونی پڑی ملیگی، مگر وہاں پانچ سو کے نوٹ رکھے ہوئے تھے، اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، اُس نے ایک دفعہ دوبارہ آنکھیں ملیں کہ آیا وہ پانچسو کے نوٹ ہیں یا ایک چونی، وہ نوٹ ہی تھے +

اب اسے کچھ کچھ خیال ہونے لگا کہ کہیں اس تارے کا جادو تو نہیں کہ لوگ اس طریقہ سے روپیہ دے جاتے ہیں، مریضوں کی تعداد بھی اب پہلے سے دُگنی ہو گئی تھی، اور روزانہ پچیس روپیہ کی آمدنی ہوتی تھی، نرملا کے کہنے کے بموجب اُس نے وہ روپیہ بھی بینک میں جمع کیا +

اگلا دن بہت ہی مبارک ہوا، شاید تارا زیادہ چمک رہا ہوگا، اُس دن پانچ آدمی اور ایک عورت مختلف اوقات میں آئے سب کے سب اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے، سب کے چہرے زردی مائل تھے، نوسب کے سب کو رعشہ تھا، اُنکی موٹریں بڑھیا قسم کی تھیں، سب کو بدہضمی کی شکایت اور سوڈے کی ضرورت، سب نے آدھی چھٹانک سوڈے کے لئے پانچسو روپے دیئے، ڈاکٹر صغیر خوش تھے کہ ان رئیسوں کو جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہوتی ہے کیا خبطی بنا رکھا ہے، بلاوجہ مجھے اسقدر رقمیت دے جاتے ہیں، اس میں اس کا کیا ہرج تھا، روپیہ اس کو چاہئے تھا، اور وہ تارا اس کو دلوا رہا تھا، واقعی وہ فقیر بہت پہنچا ہوا ہے، مگر دیکھئے کیسی سادی وضع میں رہتا ہے اگر وہ چاہے تو خود جانے کتنے لاکھ کا سوڈا لا بیچ لے +

دُکان بند ہونے کے قریب ایک پچاس برس کا آدمی جو تقریباً پھٹے کپڑے پہنے تھا آیا، اُس نے منہ شاید کئی دن سے نہیں دھویا تھا، کیونکہ اُس کی آنکھوں میں چیپڑ تک سوکھ گیا تھا، اُس کے ہاتھوں میں رعشہ بیحد زیادہ تھا اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا +

ڈاکٹر کو خیال ہوا کہ یقیناً اسے کوئی پُرانا مرض ہے، اور اسکو ایک عرصہ تک ان کی ضرورت رہیگی، اس آدمی نے آکر ان کو سلام کیا اور کہا کہ "مجھے بدہضمی ہے اور سوڈا چاہئے"

اب اس کو خیال ہوا کہ یہاں تارا اپنا ضرورت سے زیادہ کام کر رہا ہے اور اسے اپنی عقل اور خداترسی سے بھی کام لینا چاہئے، اس آدمی کو ٹھیک علاج کی ضرورت ہے نہ کہ سوڈے کی، ڈاکٹر نے کہا:-

"دیکھئے آپ کو باقاعدہ علاج کرانا چاہئے، اگر آپ کو مجھ سے علاج کرانا ہے تو ٹھیک ٹھیک علاج کرائیے، محض سوڈے سے کچھ نہیں ہوگا، آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہے اور اگر آپ کو صرف سوڈے کی ضرورت ہے تو آپ ایک معمولی دُکان سے خرید سکتے ہیں" +

اس آدمی کو بہت تعجب ہوا، اور اس نے رُک رُک کر پوچھا "کیا یہ وہی چیز نہیں"؟

ڈاکٹر، "ہاں یہ وہی چیز ہے، اور آپ لوگ روز آدھی چھٹانک کیوں لیتے ہیں، میں آدھ سیر دے سکتا ہوں، سوڈا بالکل معمولی چیز ہے +

آدمی دھک سے رہ گیا، "تو کیا وہ جو آپنے اُس مارواڑی سیٹھ کو دیا تھا محض معمولی سوڈا تھا"؟

ڈاکٹر، "جی ہاں، معمولی سوڈا، اُنہوں نے یہی مانگا تھا" +

آدمی، "مگر یہ تارا کیوں لگا ہوا ہے"؟

ڈاکٹر، "اس کو میں کیا کروں، میں نے روپیہ کمانے کیلئے لگایا تھا، ایک فقیر نے دیا تھا، اور جب سے لگایا ہے لوگ پانچ پانچ سو روپیہ دے رہے ہیں، میری رائے میں تو سب کے سب پاگل ہوئے جا رہے ہیں، اگر میں نے کچھ دنوں اور لگایا تو تمام کلکتہ کے رئیس پاگل ہوجائیں گے" +

آدمی اب کچھ سوچنے لگا، آخر اُس نے کہا "دیکھو مارواڑی کیا اُلو بنا، سوڈے کے لئے اتنا روپیہ دے گیا ہے، خیر کمپوڈر صاحب، اب آپکا تارا سلامت رہے، اس کی کچھ فکر نہ کیجئے میں کہیں اور سے خرید لونگا، خدا حافظ" یہ کہکر وہ چلا گیا +

اُس نے ان کو کمپوڈر کہا جس سے ان کو سخت غصہ آیا جی چاہا کہ دوڑکر اُس کے تھپڑ رسید کرے، مگر پھر یہ خیال آیا کہ یہ ڈاکٹری پیشہ کے خلاف ہے کہ کسی مریض کو مارا جائے +

بہرحال تارا ایک بڑی اچھی چیز تھی، کوئی پُرانا ڈاکٹر بھی ایک دن میں اتنا ہزار روپیہ نہیں کما سکتا، اور ڈاکٹر صغیر کو تو ..... چھ مہینہ ہی ڈاکٹری امتحان پاس کئے ہوئے تھے، واقعی

یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی اور ڈاکٹر کے خیال میں ایک بڑے عالیشان اسپتال، ایک بنگلہ، اور موٹر سب ہی چیزوں کی تصویر گھومنے لگی +

اگلے ہفتہ بھر اسی طرح روپیہ ٹپکتا رہا اور اس کی سوڈے کی بوتل خالی ہوگئی، اور دوسری لانا پڑی، روزانہ موٹریں آتیں اور سوڈا صرف سوڈا خرید کر لے جاتیں +

ڈاکٹر کی آمدنی اب پچھلے ہفتہ سے چوگنی ہوگئی تھی جس جگہ اتنے بڑے آدمی آتے ہوں وہ ڈاکٹر کیسے گمنام رہ سکتا ہے تھوڑے ہی دنوں میں ڈاکٹر صغیر کی قابلیت کا شہرہ ہوگیا، پرانے ڈاکٹروں نے بھی کان کھڑے کئے، کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے

اخیر کار ایک دن اس کو پتہ لگا کہ یہ کیسا تارا ہے اور یہ کیسی بکری ہے، جبکہ وہ نرملا کے یہاں سے واپس آرہا تھا رات ہوچکی تھی اور شاید ٹریم کا یہ آخری چکّر ہوگا، گاڑی میں صرف ایک اور آدمی تھا۔ وہ آدمی اس کے پاس آیا، وہ ایک چینی تھا جس کی چوٹی کی لمبائی سے پتہ لگتا تھا کہ اس کی عمر کم از کم پچاس سال کی ہوگی، آنکھیں بچّو کی طرح چھوٹی چھوٹی اور رنگ پیلی مٹی کی طرح، اس کی مونچھوں میں چوہے کی طرح صرف چند بال تھے، وہ ڈاکٹر کے قریب آکر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:۔

وہ "تم کو اور چاہئے تو مجھ سے لے لینا، میرے پاس بہت سی ابھی آئی ہے"+

"اور تازی ہے"+

ڈاکٹر، چونک کر، "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

وہ مسکرایا "میں خوب جانتا ہوں، یار مجھ سے چھپاتے ہو، تم نے مارا تو اتنا بڑا لنگا رکھا ہے اور روپیہ بھی کما رہے ہو، دوست ہم سوڈے کی بوتل خود تمہارے مکان میں پہنچا دیتے ہیں"

اب ڈاکٹر کی سمجھ میں آیا کہ یہ تارا کیا ہے اور اس کا کیا مطلب: یہ ایک قسم کی نشانی ہے کہ "کوکین یہاں بکتی ہے" یہ آدھی چھٹانک اور اتنی قیمت کا کیا مطلب ہے، یہ تو کمانے کی اچھی ترکیب ہے: کتنی تھوڑی محنت سے آدمی کتنا زیادہ کما سکتا ہے، اتنے میں ٹریم رکی اور چینی نے آہستہ سے کہا کہ "میں ہنر پارا میں رہتا ہوں، جب چاہے آجانا، اور لے جانا، تین دفعہ کھٹکھٹانا" یہ کہہ کر اس نے سلام کیا اور چلا گیا +

رات بھر ڈاکٹر صغیر سوچتا رہا، کہ کیا کرنا چاہئے، آخر اس نے طے کیا کہ یہ سب جرم ہے، اس کی اطلاع پولیس کو دیدینا چاہئے +

صبح کو وہ جگدیش چندر کے پاس گیا اور اس کو تمام واقعہ ٹریم کا سنایا وہ بھی چونک پڑا کہ کیسے عجیب عجیب طریقہ سے لوگ یہ پیشہ کرتے ہیں، ان دونوں نے سب سے پہلے جاکر اس تارے کو نکالا، اور پھر پولیس کو خبر کی کہ ہنر پارا میں اتنی بہت کوکین ابھی آئی ہے +

صحیح مخبری پر پولیس کی طرف سے ڈاکٹر صغیر احمد کو پانچ سو روپیہ انعام ملا، اور یہ آخری آمدنی تھی جو تارے کی وجہ سے ہوئی +

(غیر مطبوعہ)

سلطانہ سعید (علیگڑھ)

کالا علم

(افسانہ)

[ایڈیٹر کے قلم سے]

میں جب افسانہ لکھنے بیٹھتا ہوں تو مجھے دو ہی باتوں کا خیال ہر وقت مدنظر رہتا ہے، یا یوں سمجھئے کہ دو نظریے ہر وقت میرے قلم سے لپٹے رہتے ہیں، اور میرے قلم کو سرمو اِدھر سے اُدھر نہیں ہونے دیتے +

یہ دو اصول انسانی فطرت کا تتبع اور واقعیت کا اظہار ہے،

میں لاکھ کوشش کروں یہ دو میرا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتے، واقعہ نگاری میں خواہ افسانے کے رنگ میں ہی ہو اس اصول کی متابعت تو خود بخود ہو ہی جاتی ہے، مگر ترجمہ اور اخذ اور تاثرات میں بھی میں اصل مصنف کے خیالات پر ان دو رنگوں کی آمیزش کرتا جاتا ہوں، اور افسانہ کچھ سے کچھ بن جاتا ہے، لیکن سچ پوچھئے تو افسانہ خواہ وہ پلاٹ کی خوبیوں، علو تخئیل اور شوکتِ الفاظ سے کتنا ہی موثر ہو جو لطف کسی چھوٹے سے سچے واقعہ سنانے میں آتا ہے وہ ایس میں کبھی نہیں ملتا، لیکن میرے دوست اس حقیقت کے تسلیم کر لینے پر تیار نہ تھے ✦

رات کا وقت تھا کمرہ میں لوہے کی انگیٹھی رکھی تھی جس میں کوئلے چیتے کی آنکھوں کی طرح سرخ سرخ دہک رہے تھے، سردی کا موسم تھا، رات ابھی زیادہ نہ گئی تھی یہی کوئی دس کا عمل ہوگا، لیکن سردی اس بلا کی تھی کہ رات کے دس بجے پر بارہ ایک کا شبہ ہوتا تھا، آسمان پر بادل شام سے منڈلا رہے تھے، اور ہوا کی خنکی گرد و نواح میں ژالہ باری ہونے کا یقین دلا رہی تھی، ایسے وقت میں کون گھر سے باہر نکلتا، پھر کبھی تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بازار میں سے اِکّے دُکّے آدمی کے پاؤں کی چاپ ہوا کے ہلکے ہلکے شور میں مل کر وحشت خیز بن جاتی تھی، کمرہ کی تمام کھڑکیاں بند تھیں، ہم کمبلوں میں لپٹے بیٹھے تھے، اخبارات، رسائل انگریزی مصور میگزین، کتابیں اِدھر اُدھر بکھری پڑی تھیں روزانہ اخبارات ختم کر چکے تھے، تبادلہ کے رسائل پر ناقدانہ نظر ڈال کر اُن کی موجودہ روش پر بحث کر چکے تھے، ہر رسالہ کی خوبیوں کو جذب کر لینے اور بُرائیوں سے بچنے کے متعلق خیالی بحث دیر ہو چکی تھی، بعض تصویروں کے حسن و قبح اُن کے بازاری اور ادنیٰ ترین آرٹ کا نمونہ ہونے پر مدیروں کی بدذوقی کی داد دے چکے تھے اور اب ہر شخص چاہتا تھا کہ نیند سے ہم آغوش ہو، لیکن نصیر میں یہ بہت بُری عادت تھی کہ جبتک وہ خود سونا نہ چاہے وہ نہ دوسروں کو سونے دیتا اور نہ اُنہیں اپنے گھروں کو جانے دیتا ہے، کسی نہ کسی حیلہ بہانہ سے اُنہیں اپنے پاس بٹھائے رکھتا، آج بھی اُسے نیند نہ آتی تھی، اس لئے وہ ایک موضوع کے ختم ہونے پر دوسرا پیش کر دیتا، آخر میں اُس نے ایک رسالہ اٹھا کر پانچ چھ صفحہ کا پورا افسانہ پڑھ سنایا، اس میں مدراس میں ایک ریلوے انجن کو کسی مردہ ڈرائیور کے بھوت کا جذبۂ انتقام میں لئے پھرنے کا تذکرہ تھا، نہایت خوفناک افسانہ تھا، پڑھے لکھے آدمیوں پر بھی بعض اوقات احول کا اثر

خونی آنکھوں سے ہوتا تھا، ہیڈ کلرک بھی دیکھتا کہ اس کے تیور بدلے ہوئے ہیں، وہ اس تبدیلی پر حیران تھا +

رات کے تین بجے گھڑی کا الارم سلیم کو بیدار کر دیتا، اور وہ اُٹھ کر پہرہ داروں سے بچتا ہوا شہر کے قبرستان کی طرف جاتا اور وہاں ایک بھنگی کی قبر پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے جٹا دھاری فقیر کا بتایا ہوا عمل پڑھنا شروع کرتا، پہلے چند دن تو اُس کو سخت تکلیف رہی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ مردہ بھنگی کی لاش سے لپٹا ہوا بیٹھا ہے، اور کبھی وہ یہ محسوس کرتا کہ لاش کی جگہ خود پڑا ہے، اور اُس پر بھنگی چڑھا بیٹھا ہے، کبھی دیکھتا کہ برہنہ لاشیں اُس کے سامنے کھڑی ناچ رہی ہیں، اور ہڈیوں کے ڈھیر دانت نکالے قبروں سے جھانک رہے ہیں، کبھی وہ اپنے جسم پر مردوں کے سرد سرد ہاتھ کی لمس محسوس کرتا، کبھی رات کی سنسناہٹ میں شیروں اور چیتوں کی آوازیں اُس کے دل پر لرزہ طاری کر دیتیں، کبھی وہ محسوس کرتا کہ بھنگی کی قبر آہستہ آہستہ رینگ رہی ہے، یہ تمام محسوسات اُسے مجبور کرتے کہ وہ آنکھیں کھول کر دیکھے اور چیخیں مارتا ہوا بھاگ جائے، لیکن فقیر کا خیال آتے ہی اُس کا حوصلہ قایم ہو جاتا، اور اس پر ہیڈ کلرک کی روزانہ اور روحانی ایذا کا تصور اُس کے جذبۂ منافرت کو بھڑکا کر اُسے خوفناک سے خوفناک انجام کو برداشت کر لینے کے قابل بنا دیتا تھا +

۳۹ راتیں گذر چکی تھیں، چالیسویں رات کو شداید و حوادث میں اس قدر زیادتی تھی کہ سلیم کو جان بچانی مشکل ہو رہی تھی، ایک بار اُس نے محسوس کیا کہ قبر کی مٹی نیچے کو دھنسی جا رہی ہے اور وہ قبر میں گرا ہی چاہتا ہے، قریب تھا کہ وہ قبر کو چھوڑ کر ایک طرف کو ہو جائے، مگر جٹا دھاری فقیر کی ایک للکار اُس کے کان میں پہنچی جس سے وہ پھر مضبوطی سے قبر پر جم کر بیٹھ گیا، اور بلند آواز سے جادو کے الفاظ پڑھنے لگا، صبح

پانچ بجے کے قریب جب عمل ختم ہوا تو اُس نے آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا، کہیں کہیں تارے نیلی ردا پر جگمگا رہے تھے، قبرستان پر سکوت طاری تھا جسے کبھی کبھی اُلو کے بولنے کی آواز توڑ دیتی تھی، یا اس تنہائی میں کسی لگڑ بگڑ کا سایہ قبروں میں سے گذرتا دکھائی دیتا +

سلیم نے چند منٹ تک انتظار کیا، اس کے بعد وہ بیتابی کے ساتھ اس عمل کا نتیجہ دیکھنے کی غرض سے ہیڈ کلرک کے مکان کی طرف روانہ ہوا، ہیڈ کلرک کا مکان چھاؤنی کے حصہ میں تھا اور سلیم شہر میں رہتا تھا، اس لئے ہیڈ کلرک کے مکان تک پہنچنے کے لئے چھاؤنی کے پہرہ داروں کے سامنے سے گذرنا پڑتا تھا، سلیم نے اسکا خیال نہیں کیا، لیکن جب وہ پہرہ داروں کے سامنے پہنچا تو اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا، Wha comes There "کون آتا ہے؟"

اب سلیم چپ تھا، کیونکہ اگر وہ بولتا ہے تو اُس کی محنت رائگاں جاتی تھی۔ سپاہی نے پھر کہا ہوکمز ویر، سلیم اب بھی چپ تھا، سپاہی نے رائفل اُٹھا کر سلیم کی چھاتی پر شست باندھ دی +

ہوکمز ویر...... خدا قسم اگر نہ بولا تو گولی مار دونگا" +

سلیم نے مجبور ہو کر کہا اچھا تیری قسمت! فرینڈز، میں ہوں، پی ڈبلیو ڈی کا کلرک" +

سلیم کی آواز سنتے ہی سپاہی چکرا کر گرا، سلیم اُس کی طرف لپکا مگر اُس کا دم نکل چکا تھا!

سلیم اُلٹے پاؤں فقیر کے پاس بھاگا بھاگا پہنچا اور فقیر اس واقعہ کو سُن کر قہقہہ مار کر ہنسا، ایسا قہقہہ جس میں فتحمندی اور تمسخر کا جذبہ بھرا ہوا تھا، اُس نے سلیم کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اپنے بھڑکتے ہوئے الاؤ کے گرد تین چکر دیئے اور کہا جاؤ، اب کبھی کسی کی ہلاکت کا ارادہ نہ کرنا، "جادو برحق لیکن خدا کے حکم کے بغیر وہ بھی نہیں ہوسکتا" +

اس واقعہ کو سبھی کان لگاکر خاموشی سے سُن رہے تھے
ختم ہوتے ہی سب کی توجہ نصیر کی طرف ہوگئی جو اس وحشتناک
واقعہ کو سُنتے سُنتے سوگیا تھا، شریف نے لحاف کے اندر ہاتھ
ڈالکر نصیر کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لیا، نصیر نے زور سے چیخ ماری
اور گھبراکر اُٹھا، وہ مارے خوف کے پسینہ پسینہ ہو رہا تھا جب ذرا
ہوش ٹھکانے ہوئی تو اُس نے کہا کہ میں خواب میں بھنگی کی قبر سے پٹا
ہوا بیٹھا تھا، کسی مُردے نے میری ٹانگ کھینچ لی، استغفراللہ،
بہت رات ہوگئی ہے، بھائی اب سوجاؤ، کالے علم کا اثر
بہت بُرا ہوتا ہے، لاحول ولا +

(طبعزاد)

ایڈیٹر

NAIRNG KHIYAL ANNUAL.

سالنامہ نیرنگ خیال

نیرنگ خیال کا سالانہ ادبی شاہکار دسمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوگا

۱- یورپ کے مصور رسائل کی طرح سے نیرنگ خیال کا ایک سالانہ نمبر ہر دسمبر کے ابتدائی ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

۲- اس کا نام **نیرنگ خیال اینول** یا سالنامہ نیرنگ خیال ہوگا۔

۳- سالنامہ کا سائز نیرنگ خیال کے سائز سے بھی بڑا ہوگا۔ موجودہ سائز ۱۰ × ۶½ انچ ہے۔ سالنامہ کا سائز ۱۱½ × ۸ انچ ہوگا

۴- سالنامہ کا حجم کم از کم ۱۵۰ صفحات ہوگا جس میں نیرنگ خیال کے سائز کے ۴۰۰ صفحات کے اور دیگر رسائل کے ۵۰۰ صفحات سے زائد مضامین ہوں گے۔

۵- سالنامہ میں تمام مضامین نظم و نثر غیر مطبوعہ ہونگے۔ اور اہمیں نیرنگ خیال کے معیار سے بھی بلند تر مضامین درج ہوں گے۔

۶- رنگین اور فوٹو کی تصاویر کا خاص اہتمام ہوگا۔ بلاکس کی کم از کم چالیس تصویریں ہونگی۔

۷- سالنامہ کی قیمت صرف ۱۲ ہوگی (بذریعہ وی پی ۱۴)۔

۸- نیرنگ خیال کا دسمبر نمبر جدا گانہ شائع ہوا کرے گا اسلیئے سالنامہ ہر ایک خریدار کو قیمتاً ملیگا۔ نیرنگ خیال کے خریداروں سے ۱۲ مع فیس رجسٹری لیئے جائینگے۔ اسلیئے اپنا آرڈر فوراً رجسٹر کرا دیجیے تاکہ شائع ہوتے ہی سالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال کر دیا جائے (وی پی ۱۴ کا ہوگا) آرڈر لکھتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے۔

سالنامہ نیرنگ خیال کی تیاریاں ابھی سے شروع کردی گئی ہیں

۹- سالنامہ میں اشتہار دیجیے کیونکہ یہ سال بھر تک ہر پڑھے لکھے آدمی کی میز پر رہیگا۔ قیمت فی صفحہ (سائز مدنظر رہے) ۲۵ روپیہ نصف صفحہ ۱۵ روپیہ۔ چوتھائی صفحہ ۸ روپیہ۔

پتہ:- منیجر، نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

فرنچ کارٹون

کونسا سر اصلی ہے اور کونسا نقلی

نگاہ حیرت
خزاں کی پیدائش

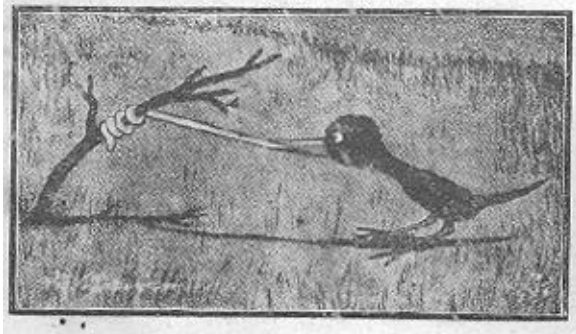

کیچوے کا شکار
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

سُرخ پھُول

ایک روسی افسانہ

(خاص برائے نیرنگ خیال)

"میں عالیجاہ آنحضور شہنشاہ پیٹراول کی طرف سے اس پاگل خانے کے معائنہ کا حکم دیتا ہوں"۔

یہ الفاظ ایک بھاری تیز اور گونجتی ہوئی آواز میں کہے گئے۔ شفاخانے کا کلرک جو ایک سپاہی تھا وہ میز پہ ایک بیٹھے ہوئے رجسٹر میں مریض کا نام درج کر رہا تھا۔ اپنی مسکراہٹ کو نہ روک سکا۔ مگر وہ دو جوان جو مریض کے ساتھ آئے تھے بالکل نہ مسکرائے۔ وہ بمشکل تمام کھڑے تھے۔ کیونکہ وہ پورے دو دن رات اس دیوانے کے ہمراہ جس کو وہ ابھی گاڑی سے شفاخانے میں لائے تھے، بےخواب رہے تھے۔

اس کی شکل خوفناک تھی۔ بھورے سوٹ پر جس کو اس نے جنوں کے دورہ میں تار تار کر دیا تھا۔ کتان کی ایک موٹی مرزائی پہنے ہوئے تھا جس کا گلا کھلا ہوُا تھا اور جسم پر خوب رفت تھی۔ لمبی آستینیں اُس کے بازوؤں کو چھاتی پر بری طرح دبائے ہوئے تھیں جو پشت پر باندھ دی گئی تھیں۔ اس کی لال انگارا آنکھیں ادہر اُدہر گھور رہی تھیں (وہ اڑتالیس گھنٹے تک نہ سویا تھا) اور ایک بیقرار آتشیں چمک کیساتھ روشن تھیں۔ ایک تو می حرکت اس کے نچلے ہونٹ کو کھینچتی تھی۔ اس کے گھنے گھونگریالے بال ایال کی طرح اسکی پیشانی پر پڑے ہوئے تھے۔ کاغذات اور کرچی کرسیوں سے بھری ہوئی پرانی الماریوں کو غور سے ملاحظہ کرتے ہوئے تیز اور بھاری قدموں کے ساتھ وہ دفتر کے اس کونے سے اُس کونے کو جاتا تھا اور کبھی کبھی اپنے ہم سفر دوستوں پر بھی ایک غلط انداز نظر ڈال لیتا تھا۔

"اسے دائیں طرف کی وارڈ میں لے جاؤ"

"مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے۔ ایک سال ہوُا میں تمہارے ساتھ یہاں آیا تھا۔ ہم ہسپتال کی بالائی منزل پر گئے تھے مجھے اس کی نسبت سب کچھ معلوم ہے اور مجھے دہوکا دینا بہت مشکل ہوگا" مریض نے کہا

اُس نے دروازے کی طرف رخ کیا جسے محافظ نے اس کے لئے کھول دیا۔ اپنے فاترالعقل سر کو بلند کئے ہوئے قریبًا دوڑتے ہوئے وہ دائیں طرف INSANITY WARD میں پہنچ گیا۔ جو لوگ اس کے ہمراہ تھے بمشکل اس کے ساتھ چل سکتے تھے۔

"گھنٹی بجاؤ" "میں نہیں بجا سکتا کیونکہ تم نے میرے بازوؤں کو باندھ دیا ہوُا ہے"۔

محافظ نے دروازہ کھول دیا اور مسافر شفاخانے میں داخل ہوئے۔

یہ عمارت دیگر پرانی وضع کی سرکاری عمارتوں کی طرح پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ دو بڑے کمرے تھے ایک کھانے کا کمرہ اور دوسرا عام خاموش مریضوں کے لئے وقف تھا ایک کشادہ راستہ تھا جس کے اختتام پر شیشے کا ایک دروازہ تھا جو ایک چمن میں کھلتا تھا۔ نچلی منزل میں قریبًا بیس خوابگاہیں تھیں، دو اور کمرے بھی تھے۔ ان میں سے ایک جو نرم تھا اور دوسرے میں تختے لگے ہوئے تھے۔ ان کمروں میں مشتعل مزاج مریضوں کو بند رکھا جاتا تھا، ایک گنبد دار تاریک کمرہ اور تھا جو غسل خانے کے کام آتا تھا۔ بالائی منزل میں عورتیں تھیں، یہاں سے برابر شور و غل کی آوازیں آرہی تھیں جن میں کبھی کبھی چیخ پکار اور گریہ وزاری بھی شامل ہوتی تھی ہسپتال ۸۰ مریضوں کے لئے بنایا گیا تھا۔ مگر چونکہ ملک کے اس حصے میں یہی ایک شفاخانہ تھا اور کئی ایک ہمسایہ صوبجات بھی اس سے ہی کام لیتے تھے، اس لئے عام طور پر تین سو مریض زیر علاج رہتے تھے۔ ہر چھوٹے کمرے میں چار سے لے کر پانچ بستر تھے موسم سرما میں جب کہ مریضوں کو باغ میں جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی اور سلاخدار کھڑکی بند رہتی تھی ہوا ناقابل برداشت

مصیبت ہے! جس وقت کوئی شخص اپنے دل میں ایک خاص خیال قائم کرنے کے نقطہ پر پہنچتا ہے' ایک عام خیال' تو اس کے نزدیک اس کا وجود اور اس کی حیات مساوی الدرجہ ہو جاتی ہیں۔ خواہ ہستی ہو یا عدم! کیا یہ امر واقعی نہیں ہے؟"

"ممکن ہے!" ڈاکٹر نے جواب دیا' وہ کمرے کے گوشے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا تاکہ مریض کا معائنہ کر سکے جو کہ سرعت کے ساتھ کمرے کے اس کونے سے اس کونے میں پھر رہا تھا اس کے گھوڑے کے چمڑے کے بڑے بڑے سلیپر آواز پیدا کر رہے تھے اور اس کا کتان کا بنا ہوا گاؤن جس پر کشادہ سرخ دھاریاں اور پھول بنے ہوئے تھے ہوا میں اڑ رہا تھا' اردلی اور انسپکٹر جو ڈاکٹر کے ہمراہ آئے تھے دروازے کے قریب ATTENTION ہوئے کھڑے تھے'

"میں نے اسے پا لیا ہے" مریض نے چلا کر کہا' "جب وہ مجھے ملا تو میں نے محسوس کیا۔ جیسے میں نے دوسرا جنم لیا ہے' میری حسیات زیادہ تیز ہو گئیں' میرا دماغ پہلے کی نسبت کہیں اچھا کام دینے لگا۔ میں اس نکتے پر پہنچا ہوں جو فلسفے کی رو سے حاصل کیا گیا ہے پس اس اہم مطلب کا جو مکان اور وقت کی حکایات کی نسبت ہے بذات خود تجربہ کر رہا ہوں' میں ہر صدی میں زندہ رہا ہوں' میں مکان ہوں میں ہر جگہ ہوں اور کہیں نہیں ہوں۔ تم بزعم خود جو چاہو خیال کرو' اس لئے مجھے اس کی بالکل پروا نہیں خواہ تم مجھے یہاں رکھو خواہ جانے دو' خواہ میں آزاد رہوں خواہ مقید' میں نے ملاحظہ کیا ہے کہ یہاں میری طرح کے اور لوگ بھی موجود ہیں' مگر باقی لوگوں کے لئے یہ بات بہت رنج دہ ہے۔ تم انہیں رہا کیوں نہیں کر دیتے؟ کسے ضرورت ہے...."

یہاں ڈاکٹر نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "تم تو کہتے تھے کہ تم تو کہتے تھے کہ تم وقت اور مکان کی حدود سے باہر ہو اور دوسری طرف اس سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ ہم تم اور میں اس کمرے میں ہیں اور یہی بات اب بھی ہے' ڈاکٹر نے جیب میں سے اپنی گھڑی نکالی۔ مئی ۱۹۲۸ء کی تاریخ ½ ۱۰ بجے تمہارا اس کی نسبت کیا خیال ہے؟"

"کچھ نہیں' میرے لئے یہ ایک ہی بات ہے کہ میں کہاں ہوں اور میں کب ہوں' میرے نزدیک یہ سب کچھ یکساں ہے تو کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ہر جگہ ہوں اور ہمیشہ ہوں'۔

ڈاکٹر مسکرایا۔

"عجیب فلسفہ ہے!" اس نے اٹھتے ہوئے کہا "شاید تم راستی پر ہو گئے گڈ مارننگ! کیا تم ایک سگار پیو گے؟" "شکریہ! وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے ایک سگار لیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ایک سرا توڑ دیا' اس وجہ سے مجھے غور کرنا پڑتا ہے کہ یہ دنیا ہے' ایک طرف انگلی ہے دوسری جانب تیزاب ہیں یعنی یہ مساوات عالم ہے جس سے کہ مفردات کی تاثیروں کو گھٹایا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب! خدا حافظ!

ڈاکٹر اپنے دورے پر چلا گیا' بہت سے مریض بستروں کے نزدیک کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے کسی افسر کی ایسی عزت نہیں ہوتی جیسے کہ پاگل خانے کے انچارج ڈاکٹر کی اس کے مریض کرتے ہیں۔ جب مریض کو اکیلا چھوڑ دیا گیا وہ بدستور کمرے میں ادھر ادھر پھرتا رہا' اس کے لئے کچھ چائے لائی گئی' وہ ایک آبخورہ کھڑے ہی کھڑے دو گھونٹوں میں پی گیا اور سفید روٹی کا ایک بڑا ٹکڑا ایک آن میں نگل گیا' پھر وہ کمرے سے باہر گیا اور کئی گھنٹوں تک بغیر ٹھہرنے کے عمارت کے اس سرے سے اس سرے تک اپنی تیز رفتار کے ساتھ چلتا رہا' اس دن بارش ہوئی تھی اور مریض کو باغ میں جانے کی اجازت تھی' جب اردلی نے نئے مریض کو تلاش کیا اسے راستے کے اختتام پر لے گئے اور وہاں اس نے اسے شیشے کے ساتھ منہ لگائے ہوئے غور سے چمن کی طرف دیکھتے ہوئے پایا اس کی توجہ پوست کے ایک غیر معمولی سرخ پھول کی طرف مبذول تھی'۔

"مہربانی کر کے ادھر آؤ اور اپنا وزن کراؤ" اردلی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا جب مریض اس کی طرف متوجہ ہوا اس کی مستانہ آنکھوں میں شرارت اور نفرت کی ایسی وحشیانہ جھلک تھی جس سے اردلی دہشت زدہ ہو کر لڑکھڑانے کو تھا' جب اس نے دیکھا کہ وہ اردلی ہے تو اس نے فوراً اپنے چہرے کے اثرات کو تبدیل کر دیا اور بغیر کچھ کہے' اطاعت سے اس کے پیچھے چلا گیا جیسے کسی گہری سوچ میں مستغرق ہو' وہ ڈاکٹر کے بیٹھنے کے کمرے میں چلے گئے۔ مریض خود بخود لوہے کے وزن کرنے والے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا' اردلی نے اس کا وزن لیا اور ایک رجسٹر میں اس کے نام کے آگے ۱۰۹ پونڈ درج کر دیئے' اگلے دن اس کا وزن

۱۰۷ ہوگیا اور اس سے اگلے دن ۱۰۶

"اگر اسی طرح ہوتا رہا تو یہ شخص زیادہ دیر تک زندہ نہ رہیگا" ڈاکٹر نے کہا اور اُس نے حکم دیا کہ مریض کو جہاں تک ممکن ہو اچھی سے اچھی خوراک دی جائے۔ باوجود ان کوششوں اور مریض کی غیر معمولی بھوک کے وہ ہر روز زیادہ دُبلا ہوتا گیا۔ اور ہر روز رات والی رجسٹر میں پہلے سے کم پونڈ درج کرتا۔ مریض مشکل سے سوتا تھا اور متواتر حرکات میں دن گزار رہا تھا۔

(۴)

اسے خیال تھا کہ وہ پاگل خانے میں ہے اور اس کو اس کا بھی علم تھا کہ وہ بیمار ہے بعض وقت جیسا کہ پہلی رات ہوا وہ تمام دن کی وحشیانہ حرکات و سکنات کے بعد رات کی خاموشی میں اُٹھ بیٹھتا اور اعضا میں سخت درد اور سر میں سخت گرانی محسوس کرتا لیکن اس کے ہوش و حواس درست ہوتے تھے شاید داخلی اثرات کا معدوم ہونا اور رات کی نیم سیاہی اس کا موجب ہوتی تھی یا شاید ایک آدمی کے دماغ کا کمزور عمل جو صرف فوراً ہی ٹھیک ہوا ہو اس کا باعث ہوتا تھا اس وقت وہ اس کی حالت کا پورا پورا یقین کرا دیتی تھی اور وہ بھلا چنگا معلوم ہونے لگتا لیکن دن کے ہونے ہی اور روشنی کے آتے ہی ہسپتال کے نفوس کی بیداری کے ساتھ ہی اس کو اثرات کی لہریں آن پکڑتی تھیں جنکو اس کا ناقص دماغ قابو میں نہ لا سکتا تھا اور پھر ایک دفعہ وہ پاگل ہو جاتا تھا اس کی حالت سلیم رائے اور بے ہودگی کا ایک عجیب معجون مرکب تھی وہ جانتا تھا کہ وہ دیوانوں سے گھرا ہُوا ہے لیکن وہ اسی وقت یہ بھی خیال کرتا کہ ان میں سے ایک ایک آدمی وہ ہے جس سے وہ پیشتر سے واقف ہے یا جن کے متعلق اس نے کتابوں میں پڑھا ہے یا جن کا ذکر وہ سن چکا ہے جو خفیہ طور سے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے یا پوشیدہ کر دیا گیا ہے۔ ہسپتال میں ہر ملک اور ہر عمر کے آدمی مقیم تھے وہ یہاں پر زندہ اور مردہ دونو کو دیکھتا تھا۔ اس جگہ پر روئے زمین کے مشاہیر شہ زور اور وہ جنگجو سپاہی بھی تھے جو لڑائی میں زخمی ہو چکے تھے اس کو گمان تھا کہ وہ سحر میں مبتلا ہے حصار سحر کے اندر ہے اور دنیا کی تمام طاقتیں اس کے اندر جمع ہو گئی ہیں۔ نخوت اور غرور سے آپ کو اس ڈرامے کا مرکز سمجھتا۔ ہسپتال میں اس کے دوست آتے گویا ایک بڑا کام سرانجام دینے کی نیت

سے جمع تھے جو اس کو معمولی طور سے دنیا کی تکالیف کی بربادی کے لئے ایک عظیم الشان کام معلوم ہوتا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کس طرح سرانجام پائے گا لیکن محسوس کرتا تھا کہ اسکو سرزد کرنے کی اس میں کافی طاقت ہے وہ دوسرے آدمیوں کے خیالات کا اندازہ کر سکتا تھا اور ہر ایک چیز میں اس کی تمام سوانح حیات دیکھتا ہسپتال کے باغ میں بڑے بڑے شیشم اس کو زمانہ ماضی کے پرانے افسانے یاد دلاتے تھے اور عمارت جو ایک اچھا خاصہ عرصہ ہُوا تعمیر ہو چکی تھی اس کو وہ سمجھتا تھا کہ پیٹر اعظم نے تعمیر کیا ہے وہ سوچتا تھا کہ قوم طس جنگ یا لتوا کیو قت یہاں پر سکونت رکھتی تھی۔ وہ اس نتیجے کو ہر در و دیوار ہر اینٹ و پتھر سے جنکو وہ باغ میں پاتا اخذ کرتا تھا گویا باغ اور مکان کی تمام تاریخ ان پر تحریر ہے اس چھوٹی عمارت کو جو مردہ گھر کا کام دیتی اور جس میں سینکڑوں آدمی مر چکے تھے دیکھتا اور وہ اس چھوٹی کھڑکی پر ٹکٹکی باندھے رکھتا جو فرش سے باغ کے کونے میں کھلتی تھی اور ناہموار اور رنگ برنگ کے پرانے شیشوں کے عکس میں وہ شکلیں دیکھتا۔ جن سے وہ اپنی زندگی میں روشناس تھا یا جن کی تصاویر وہ دیکھ چکا تھا۔

عمدہ اور خوشگوار موسم آگیا۔ مریض تمام دن باغ میں کھلی ہوا میں بیٹھے رہتے اور باغ کے اُس حصے میں جو انکے لئے مخصوص کیا گیا تھا گھنے دار درخت تھے اور جہاں پر کچھ جگہ تھی۔ وہاں پر پھولوں کی کیاریاں تھیں اور ناظم و منتظم نے یہ کہہ رکھا تھا کہ جو کام کرنے کے لائق ہوتے انکو اس باغ میں رکھتا۔ سارا سارا دن وہ رستوں کو صاف کرتے کرتے یا ان پر ریت ڈالتے رہتے۔ پھولوں کی کیاریں، خربوزے، تربوز جو انہوں نے خود کاشت کئے تھے پانی دیتے رہتے۔ باغ کے ایک کونے میں لیچی کے درخت تھے جن کے گرد شیشم کی باڑ تھی اور اس کے وسط میں ایک مصنوعی ٹیلے پر باغ کے خوبصورت ترین پھولوں کی کیاریاں تھیں اور اس ٹیلے کا بلند ترین حصہ پھولوں سے گھرا ہُوا تھا اور اس کے بیچ میں نایاب بسنتی اور سُرخ گیندا تھا۔ یہ گیندا باغ کی بلند ترین جگہ اور عین وسط میں تھا اور یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر مریض اس میں ایک غیبی طاقت خیال کرتے تھے اور نئے مریضوں کو بھی یہ کچھ عجیب معلوم ہوتے تھے۔ یہ عمارت اور باغ کا ایک قسم کا سردار تھا۔ تمام راستوں کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں مریضوں نے لگائی تھیں

گلاب۔ موتیا، چنبیلی، نرگس، گل اشرفی، جتنے قسم کے پھول کہ دنیا میں پائے جاتے تھے سب لگے ہوئے تھے اس جگہ پر پہنچنے کے نزدیک لالہ کے ایک خاص قسم کے تین پودے تھے جو معمولی گل لالہ سے خرد تر تھے گہری سرخی میں ان سے مختلف تھے، یہ پھول مریض کو ہسپتال میں پہلی صبح بہت بھایا تھا جو دروازے کے شیشے میں سے نظر آتا تھا۔

پہلی دفعہ جب وہ باغ میں گیا سیڑھیوں سے اترنے سے پہلے ان پھولوں کے دیکھنے کو ٹھیر گیا، وہ صرف دو پھول تھے جو اتفاقیہ اس جگہ اگے ہوئے تھے جہاں پر پانی نہ دیا گیا تھا، اس کے چاروں طرف خودرو گھاس تھی۔

مریض ایک ایک کرکے دروازے سے گزرتے رہے، ہر ایک نے داروغہ سے سفید ٹوپی جس میں فیتہ بندھا ہوا تھا اور سامنے کی طرف سرخ صلیب کا نشان تھا لی۔ یہ ٹوپیاں جنگ کے ایام میں استعمال ہوئی تھیں اور نیلامی سے ہسپتال کے لئے خرید لی گئی تھیں۔ لیکن مریض قدرتی طور پر اس سرخ صلیب سے کچھ اور معنے اخذ کرتے تھے، اس نے اپنی ٹوپی اتاری، صلیب کی طرف اور پھر گل لالہ کی طرف دیکھا۔ پھول خوش نما تھے۔

مریض نے کہا "انہوں نے فتح پائی۔ لیکن ہم معلوم کرینگے"۔ وہ چمنے کی طرف چلا۔ داروغہ کو دیکھے بغیر جو اس کے عقب میں کھڑا تھا پھولوں کی کیاری پر سے گزر گیا اور پھولوں کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ لیکن انکے توڑنے کا ارادہ نہ کر سکا، اس نے اپنے پھیلائے ہاتھ میں پھولوں کے توڑنے کا جذبہ اور حرارت کی لہر دوڑتی ہوئی محسوس کی، گویا کہ ایک نامعلوم طاقت کی رو سرخ پتیوں سے اس کے تمام بدن میں دوڑ گئی، وہ بہت قریب آگیا۔ اپنا ہاتھ پھول کے بالکل نزدیک لے گیا۔ لیکن اسے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ گویا وہ اس کو زہریلا سانس لینے سے روک رہے ہیں، اس پر کچھ غفلت سی چھا گئی اور اس نے ایک بے سود کوشش کی اور پیشتری رکاوٹ میں پھنس گیا، اچانک ایک بھاری ہاتھ اس کے شانے پر رکھا گیا اور یہ داروغہ تھا جس نے اسے پکڑ لیا۔

بوڑھے نِٹس ردسی نے کہا "تم کو پھول ہرگز نہ توڑنے چاہئیں اور تم کو پھولوں کی کیاری پر سے بھی نہ گزرنا تھا تمہارے جیسے بہت سے دیوانے ہیں، اگر تم میں سے ہر ایک ایک ایک پھول توڑے تو تمام باغ خالی ہو جائے" اس نے یہ اس کا کندھا پکڑے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

مریض نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑا کر سرعت کیساتھ اپنا راستہ لیا، اس نے دل میں کہا،

اے بدقسمت ہستی! تو نہیں دیکھتی اور تو ایسا اندھا ہے۔ کون! تو اُسے بچاتا ہے، اگر میں اس کو برباد کر دیتا تو اس میں میرا کیا نقصان تھا، اگر آج نہیں تو کل ضرور پھر کوشش کرونگا اور اگر میں مر گیا تو کیا یہ اچھا ہوگا دوسرے مریضوں سے ملاقات کرتا اور عجیب گفتگو کرتا ہوا اخیر شام تک باغ میں گھومتا رہا۔ اس کی گفتگو میں ہر ایک دیوانے نے صرف اپنے مجہول خیالات کے جواب سنے جو ایک مبہم زبان اور بیہودہ الفاظ میں بیان کئے گئے تھے۔ مریض کبھی ایک کبھی دوسرے ساتھی کے ساتھ دن بھر پھرتا رہا مگر اس کو پورا اعتماد تھا "تمام تیار ہیں" جسے اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "ہاں جلدی اور بہت جلدی یہ لوہے کی سلاخیں تباہ کردی جائیں اور قیدی آزاد ہو کر زمین کے ہر گوشے میں پھیل جائیں، دنیا میں ہل چل مچ جائے گی۔ یہ جلد اپنا پرانا چولا بدل لے گی اور نئی اور شاندار خوبصورتی میں ظاہر ہو گی" وہ پھولوں کی قطعاً بھول گیا لیکن جب وہ باغ سے جانے لگا اور قدم بڑھایا اُس نے پھولوں کی سیاہی مائل اور شبنم پڑے ہوئے گھاس میں دیکھا جو دو انگاروں کی طرح روشن تھے، پھر مریض پیچھے مڑا اور ایسی جگہ ہو کر جہاں سے اس کو داروغہ نہ دیکھ سکے موقعہ کا منتظر رہا۔ کسی نے اس کو پھولوں کی کیاری پر سے کودتے نہ دیکھا۔ اس نے چپکے سے ایک پھول توڑا اور کرتے کے نیچے اپنی گود میں رکھ لیا، جب ٹھنڈی شبنم سے بھیگی ہوئی پتیوں نے اس کے بدن کو چھوا وہ مردے کی طرح زرد ہو گیا اور خوف سے اسکی آنکھیں پتھرا گئیں، اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے آ گئے۔

ہسپتال میں چراغ روشن ہو گئے۔ بہت سے مریض کھانے کے انتظار میں اپنے بستروں میں تھے صرف چند بے چین جلدی جلدی کمرے کے اندر باہر آتے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک وہ بھی تھا جو پھول چھپائے ہوئے تھا، جسکی بغل میں پھول تھا، وہ ادھر اُدھر اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھے ہوئے پھرتا تھا۔ ایسا

ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس پھول کو جسے وہ چھپائے ہوئے ہے تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے۔ جب وہ کسی سے ملتا تو انکے راستے سے بہت دور ہو جاتا اور انکے کپڑے تک کو چھونے سے ڈرتا۔

"میرے قریب مت آؤ! میرے قریب مت آؤ" وہ چلاتا تھا۔

ہسپتال میں بہت کم توجہ اس آواز کی طرف مبذول ہوئی اور وہ لمبے لمبے قدم بڑھا کر جلدی جلدی چلنے لگا۔ بہت دیر تک مضطرب پھرتا رہا۔

"میں تمہیں تنگ کر دوں گا۔ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں گا" اس نے سخت لہجے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ بعض وقت وہ دانت پیستا تھا۔

کھانے کے کمرے میں کھانا چن دیا گیا۔ بہت سے بڑے بڑے لکڑی کے سنہری پیالے جوار کے دلئے سے بھرے ہوئے ہر ایک میز پر رکھے ہوئے تھے جو بغیر میز پوش کے تھی۔ تمام مریض پنچو نہر میز کے گرد بیٹھ گئے ہر ایک کو باجرے کی ایک ایک روٹی دے دی گئی۔ قریباً آٹھ آدمیوں نے لکڑی کے چمچے کے ساتھ ایک ہی پیالے میں کھایا۔ جن کے لئے اچھی خوراک کا حکم تھا۔ ان چند اشخاص کو علیحدہ کھانا دیا گیا۔ ہمارے مریض نے اپنا حصہ جلدی ہڑپ کر لیا جسے خادم اس کے کمرے میں لایا تھا۔ جو کچھ اسے ملا اس سے سیر نہ ہوا اور کھانے کے عام کمرے میں چلا گیا۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں"؟ اس نے ناظم سے پوچھا

"کیا تم نے کھانا نہیں کھایا؟"

ناظم نے سوال کیا۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے اور مجھے اتنی خوراک ملنی چاہیے جتنی کہ میں کھا سکتا ہوں، خوراک ہی پر میری زندگی کا انحصار ہے تم جانتے ہو کہ میں بالکل نہیں سویا۔"

"بھلے آدمی! کھا لو اور خدا کرے یہ تمہیں سود مند ہو۔ مارس اسے ایک چمچہ اور کچھ روٹی دے دو۔"

دو پیالوں میں سے ایک کے سامنے بیٹھ گیا اور دلئے کی کافی مقدار کھا گیا۔

"بس اب یہ کافی ہے، بہت ہے" آخر کار ناظم نے کہا، جب دیگر سب اپنا کھانا ختم کر چکے اور ہمارا مریض ایک ہاتھ سے پیالا پکڑے اور ایک ہاتھ چھاتی سے لگائے کھا لے گیا،

"تم حد سے زیادہ کھا جاؤ گے۔"

کاش کہ تم جانتے کہ مجھے کتنی قوت کی ضرورت ہے، خدا حافظ! نکولے! مریض نے میز پر سے اٹھتے ہوئے اور ناظم کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے کہا "خدا حافظ!"

"تم کہاں جا رہے ہو؟" ناظم نے مسکرا کر پوچھا۔

میں؟ کہیں نہیں، میں یہیں رہوں گا۔ لیکن شاید کل کو ہم نہ مل سکیں، میں آپ کی تمام عنایات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور اس نے پھر ایک دفعہ ناظم کا ہاتھ دبایا، اس کی آواز تھرانے لگی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

صبر کرو! بھلے آدمی! انسپکٹر نے کہا "تمہارے اتنے منحوس خیالات کیوں ہیں۔ بستر پر جاؤ اور جلدی سو جاؤ، تمہیں نیند کی زیادہ ضرورت ہے۔ جتنی جلدی تم سو جاؤ گے اتنا ہی مفید ہوگا"

مریض سسکیاں بھرنے لگا۔ ناظم نے نوکروں کو حکم دیا کہ جلدی جلدی کھانے کے برتن سنگواؤ۔ نصف گھنٹے کے اندر اندر ایک آدمی کے سوا سب لوگ سو گئے جو اپنے کپڑوں سمیت سرے کے کمرے میں بستر پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بیقراری سے کانپ رہا تھا اور مروڑ کر اپنے ہاتھوں کو سینے پر رکھے ہوئے تھا گویا اسے گمان تھا کہ اس کے اندر زہر مہلک بھرا ہوا ہے۔

(۵)

وہ تمام رات نہ سویا، اس نے وہ پھول اس لئے توڑا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کا توڑنا اس کی قسمت میں لکھا ہے، جب اس نے پہلی مرتبہ دروازے کے شیشے میں سے دیکھا تھا چمکدار سرخ پتیوں نے اس کی توجہ کو کھینچا تھا اور اسے اس گھڑی یہ معلوم ہوا کہ وہ اچھی طرح دنیا میں اپنے فرض کو سمجھتا ہے، اس سرخ پھول میں دنیا کی تمام آفات جمع ہیں، وہ جانتا تھا کہ افیم بھی پوست ہی سے بنائی جاتی ہے، غالباً اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ اس نے ایک عجیب وحشت انگیز یقین کی شکل اختیار کر لی اس کی نگاہ میں وہ پھول تمام مصائب کا مرکز اور اس کی سرخ پتیاں کسی بے گناہ کے خون سے سینچی گئی تھیں اور یہی اس کے سرخ رنگ کا باعث تھا۔ اس میں مخلوق کے تمام آنسو اور معاصی اور تلخیاں جذب تھیں اور یہ ایک مبہم اور خوفناک ہستی خدا کے مخالف ہے، یہ شیطان

ہے جس نے نازک اور مسکین شکل اختیار کر لی ہے اور اسے توڑنا اور تباہ کر دینا لازمی تھا، لیکن اتنا ہی کافی نہ تھا تمام دنیا کو اس کے مہلک اثر سے بچانا ضروری تھا، اور اسی وجہ سے وہ اسے اپنی بغل میں چھپائے ہوئے تھا۔ اسے امید تھی کہ صبح تک پھول کی تمام قوت ضائع ہو جائے گی، اس کا شر اس کے سینے میں اور اس کی روح میں داخل ہو جائیگا، مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید وہ ہی غالب آئے پھر وہ مر جائے گا موت ..... لیکن جوانمرد کی موت رستم دوراں کی طرح کیونکہ دنیا کی تمام مصیبتوں سے جنگ کا کسی کو حوصلہ نہ ہوگا۔

اُنہوں نے اسے نہ دیکھا، میں نے اسے دیکھ لیا، کیا میں اس کو زندہ چھوڑ سکتا تھا۔ مر جانا اچھا ہے" وہ اپنی زائل ہوتی ہوئی طاقت کے ساتھ اس وہمی اور بے بنیاد کشمکش و پیچ میں پڑا رہا۔

اگلی صبح ڈاکٹر نے اسے قریباً مردہ پایا، چند گھنٹوں کے بعد وہ اپنی اصلی حالت میں آ گیا اور بستر پر سے کود پڑا اور حسب معمول ہسپتال میں دوڑتا اور مریضوں کے ساتھ گفتگو کرتا پھرنے لگا اُس کو باغ میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ ڈاکٹر نے یہ دیکھ کر کہ اُس کا وزن روزانہ گھٹتا جاتا ہے اور وہ سو نہیں سکتا۔ اور وہ تمام دن پھرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ڈاکٹر نے اس کی جلد میں افیم داخل کرنے کا حکم دیا اس نے کچھ انکار نہ کیا اور اس کے مجنونانہ خیالات اس وقت اس عمل جراحی سے منقطع ہو گئے وہ جلد ہی سو گیا اور اس کی وحشیانہ حرکات کا خاتمہ ہو گیا، اور وہ بلند نغمہ جو اس کے بے قاعدہ قدموں سے پیدا ہو کر اس کے کانوں میں گونجتا تھا ختم ہو گیا، وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کے خیالات کا سلسلہ بھی رُک گیا۔ یہاں تک کہ دوسرے سرخ پھول کے توڑنے کا اہم خیال بھی نہ رہا۔

تین دن کے بعد وہ کسی نہ کسی طرح وہ پھول توڑنے کے قابل ہو گیا، اور وہ بھی ناظم کے سامنے جو اُسے وقت پر باز نہ رکھ سکا دارو غہ چلاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا، مریض چیخیں مارتا اور آہ و زاری کرتا ہوا گھر میں گھس گیا، اپنے بستر پر لیٹ کر جلدی سے پھول کو اپنے کُرتے کے نیچے چھپا لیا۔

"تمہیں پھول توڑنے کی کس طرح جرأت ہوئی" دارو غہ نے جو اس کے پیچھے پیچھے آتا تھا دریافت کیا، مریض نے جو پہلے ہی سے حسب دستور اپنے ہاتھ بغلوں میں دئے لیٹا ہوا تھا ایسی بے ہودہ بکواس شروع کی کہ دارو غہ نے صرف بہ تعجیل اُس کے سر سے سرخ صلیب والی ٹوپی ہٹائی جس کو وہ جلدی میں سر سے اتارنا بھول گیا تھا اور اسے تنہا چھوڑ دیا۔

خیالی کشمکش پھر شروع ہو گئی مریض نے محسوس کیا کہ خبیث کی لہریں پھول سے نکلکر طویل اور زہریلے سانپوں کی طرح اُس جسم میں سے گزر کر اس کے اعضا کو دباتی اور اس کے تمام جسم کو اپنے زہریلے ڈنکوں سے زخمی کر رہی ہیں، وہ رونے لگا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے دشمن پر لعنت و پھٹکار بھیجنے سے فارغ ہوا تو خدا سے دعا مانگنے لگا۔ شام تک پھول مرجھا گیا، مریض نے سیاہ پودے کو اپنی ایڑیوں کے نیچے مسل کر احتیاط سے فرش پر سے تمام پتیاں اٹھائیں اور انہیں غسل خانے میں لے گیا، اس نے ان بے جان سبز پتیوں کو دہکتی ہوئی روشن آگ میں پھینکدیا اور دیکھتا رہا کہ کس طرح اس کا دشمن جلکر راکھ ہو جاتا ہے اُس نے اس پر پھونک ماری اور وہ اُڑ گئی۔ اگلے دن مریض کی حالت اور بھی خراب ہو گئی۔ زرد مردہ رنگت، پچکے ہوئے گال اندر کو گھسی ہوئی چمکدار آنکھیں اب وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے پھرتا اور اکثر اپنی مجنونانہ رفتار میں کانپتا اور برابر بکواس کئے جاتا۔

"مجھے طاقت کا استعمال نہ کرنا چاہئے تھا" سول سرجن نے ڈاکٹر سے کہا۔

لیکن اب اس کی حالت کو روبہ اصلاح لانا ممکن ہے آج اس کا وزن صرف ۹۳ پونڈ ہے اگر اس کی یہی حالت رہی تو دو دن میں مر جائے گا۔

سول سرجن نے دل میں خیال کیا۔

"افیم کلورا فارم" اس نے چپکے سے کہا صرف کل تک افیم کا کچھ اثر نہ تھا، اُسے بستر سے کس کر باندھ دیا جائے۔ مجھے امید نہیں کہ وہ اب زندہ رہے،

(۶)

مریض کو کس کر باندھ دیا گیا۔ وہ کتان کی جیکٹ پہنے چوڑے چوڑے پٹوں سے اپنے لوہے کی ٹانگوں والے بستر سے جکڑا پڑا تھا مگر اس کی وحشیانہ حرکات کا خاتمہ نہ ہوا وہ اور بھی زیادہ ہو گئیں بہت گھنٹوں تک وہ اپنے بندوں سے آزاد ہونے کی کوشش کئے گیا آخر کار ایک زبردست جدّوجہد کیساتھ وہ بندوں میں سے ایک کو توڑنے میں کامیاب ہو گیا، اور اپنی ٹانگیں چھڑا لیں اور اسی طرح سے دوسرے بندوں میں سے نکل جانے کا انتظام کر لیا۔

تب اس نے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ ہر قسم کی بیہودہ اور وحشیانہ بکواس کرتے ہوئے کمرے میں ادھر ادھر پھرنا شروع کیا۔

"ارے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کو کس شیطان نے مدد دی ہے؟ گرشا!! یوں!! ادھر آؤ پاگل نے بندھن تڑوا لئے ہیں" محافظ نے چلا کر کہا۔

پھر تینوں اس پر جھپٹ پڑے اور ایک طویل جدوجہد شروع ہوئی، جو کہ محافظوں کے لئے تکلیف دہ اور مریض کیواسطے جو خود کو بچانے کے لئے اپنی بقیہ طاقت کو استعمال میں لا رہا تھا ایک مصیبت تھی۔ آخر کار وہ اسے بستر پر پھینک دینے میں کامیاب ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اُسے پہلے سے بھی زیادہ کس کر باندھ دیا

"تم نہیں جانتے کہ تم کیا کر رہے ہو"۔ مریض نے ہانپتے ہوئے چلا کر کہا۔

تم سب تباہ ہو جاؤ گے۔ میں نے ایک تیسرا بھی دیکھا ہے جو کہ ابھی اچھی طرح نہیں کھلا تھا، اب وہ اچھی طرح کھل چکا ہو گا مجھے یہ کام کر لینے دو، اُسے ضرور تباہ کر دینا چاہیے ضرور ضرور!! اس طرح سب مصائب کا خاتمہ ہو جائے گا اور سب کی جانیں بچ جائینگی، میں تمہیں ہی بھیجدوں مگر اس کام کو میں ہی انجام دے سکتا ہوں تم نے اگر اسے چھو بھی لیا تو مر جاؤ گے۔

"جناب خاموش رہئے" خاموش!" دیرینہ سال محافظ نے جو بستر پر متعین کیا گیا تھا، کہا۔ مریض یکایک خاموش ہو گیا، اُس نے نگہبان کو حکم دینے کا ارادہ کر لیا تھا، دن بھر اسے بستر کیساتھ بندھا رہنے دیا گیا، اور رات کے وقت بھی اسے اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا۔ مریض کو کھانا دینے کے بعد محافظ نے ایک چٹائی فرش پر بچھائی اور اس پر لیٹ گیا۔ ایک منٹ میں وہ گہری نیند سو گیا اور مریض نے اپنا کام شروع کیا۔

اس نے اپنے بدن کو اس طرح موڑ لیا کہ بستر کی آہنی تاروں کو چھو سکے اور چست جیکٹ کی لمبی آستینوں میں سے اپنی کلائیاں اس تک پہنچا سکے اور پھر اس نے سرگرمی سے جلدی جلدی موٹے کتاں کے کپڑے کو سلاخوں کے ساتھ رگڑنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد موٹا کپڑا پھٹ گیا اور اس نے اپنے ہاتھ کی انگلیاں بندھن سے چھڑا لیں، بعد ازاں کام سرعت سے شروع ہوا۔ اس ہشیاری اور احتیاط سے جو ایک دیوانے کی سمجھ سے باہر ہے اس نے کسی نہ کسی طرح وہ گرہ جو اس کی آستینوں کو پشت پر باندھے ہوئے تھی۔ کھول دی۔ جیکٹ کے بٹن بھی کھول دیئے اور بہت دیر تک بیٹھا ہوا محافظ کے خراٹوں کی آواز سنتا رہا۔ بوڑھا آدمی گہری نیند سو رہا تھا۔ مریض نے جیکٹ اتار دی اور خود کو بستر سے چھڑا لیا۔ وہ آزاد ہو گیا۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ اسے اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ اور چابی غالباً محافظ کی جیب میں تھی۔ جیب ٹٹولنے سے وہ اس لئے ڈرتا تھا کہ مبادا بوڑھا آدمی جاگ اُٹھے، پس اُس نے کھڑکی کی راہ سے نکلنے کا ارادہ کیا۔

رات گرم، سنسان اور تاریک تھی، کھڑکی کھلی ہوئی تھی تاریک آسمان میں ستارے چمک رہے تھے، اس نے ستاروں کی طرف دیکھا، ستاروں کے مانوس مجموعے کو شناخت کیا اور اسے فرحت ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ میرے خیالات کو سمجھتے ہیں اور مجھ سے ہمدردی رکھتے ہیں، چھپکتی ہوئی آنکھوں سے اس نے لامتناہی کہرنوں کو دیکھا جو وہ اس کی طرف بھیجتے تھے اور اس کے مجنونانہ تخیل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اس تنگ سوراخ میں سے جو جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تاریک گلی میں کھلتا تھا، گزرنے اور پتھر کی بلند دیوار پر چڑھنے کے لئے موٹی آہنی سلاخوں کو موڑنا ضروری تھا، وہاں آخری جدوجہد شروع ہو گی اور اس کے بعد شاید موت .....

اس نے ننگے ہاتھوں سے موٹی سلاخوں کو جھکانے کی کوشش کی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر اس نے کتاں کی جیکٹ کی مضبوط آستینوں کا رسہ بنایا اور اسے سلاخ کے سرے کی ایک میخ کے ساتھ باندھ دیا اور اس کے ساتھ لٹک گیا، بہت سی بیسود کوششوں کے بعد جنہوں نے اس کی طاقت کو قریباً زائل کر دیا، میخ جھک گئی، ایک تنگ راستہ کھل گیا۔ اس نے خود کو اس میں سے نکال لیا۔ کندھوں، کہنیوں اور برہنہ گھٹنوں کو رگڑ کر وہ جھاڑیوں میں سے نکل گیا اور دیوار کے نزدیک پہنچ گیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ رات کی بتیوں کی ٹمٹماتی ہوئی مدھم سی روشنی بڑی عمارت کی کھڑکیوں سے باہر آ رہی تھی۔ گلی میں کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ اُسے کسی نے نہ دیکھا۔ وہ بوڑھا جو اس پر متعین تھا گہری نیند سو رہا تھا۔ ستارے اس پر محبت کی نگاہیں ڈال رہے تھے اور انکی شعاعیں اس کے دل میں جذب ہو رہی تھیں۔

"میں تمہاری طرف آرہا ہوں" اس نے آسمان کی طرف دیکھکر آہستہ سے کہا وہ اپنی تمام کوششوں کے بعد بالکل خستہ ہوگیا، اس کے بازوؤں اور گھٹنوں سے خون بہ رہا تھا اور ناخن ٹوٹ گئے تھے، اب اس نے دیوار پر چڑھنے کے لئے موزوں جگہ تلاش کرنا شروع کی، اس نے دیکھا کہ اس مقام سے جہاں کی دیوار گلی کے ساتھ ملتی تھی چند اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں ان کو ٹٹولتے ہوئے اور ان سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرتے ہوئے وہ دیوار پر چڑھ گیا اور املی کے درخت کی جو دوسری طرف اگاہ ہوا تھا شاخیں پکڑ کر انکی مدد سے چپکے سے زمین پر آگیا۔

وہ دہلیز کے قریب اس معلوم جگہ پر پہنچ گیا۔ پھول اپنی نصف کھلتی ہوئی پتیوں کے ساتھ سیاہ سا معلوم ہو رہا تھا "آخری! بس آخری!" مریض نے آہستہ سے کہا، آج یا تو فتح ہے یا موت! میرے لئے یہ ایک ہی بات ہے، "ٹھیر دیں ابھی تمہارے پاس آتا ہوں" اس نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا اس نے پودے کو اکھاڑ دیا، اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اسے بالکل کچل دیا اور اسے خوب مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اسی راستے سے جس سے کہ آیا تھا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔

بوڑھا آدمی ابھی تک سویا ہوا تھا۔ بستر پر پہنچتے ہی مریض اس پر گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔

صبح کے وقت وہ مردہ پایا گیا۔ اس کا چہرہ خاموش اور پر رونق تھا۔ کمزور خط و خال سے، نازک ہونٹوں اور اندر کو گھسی ہوئی آنکھوں سے مغرور مسرت کا اظہار ہوتا تھا۔ جب انہوں نے اسے تختۂ مرگ پر ڈالا تو اس کا ہاتھ کھولنے کی کوشش کی اور سرخ پھول نکالنا چاہا، مگر اس کے اعصاب اینٹھ چکے تھے اور وہ اپنی فتح کی نشانی اپنے ساتھ قبر میں لے گیا۔

(ترجمہ) (محمد اکبر خاں
دیال سنگھ کالج لاہور)

نقد و نظر

(نظامی قدوسی کے قلم سے)

باقیات فانی

سرود ہمستاں

جناب شوکت علی خاں فانی بدایونی ۔ بی اے ۔ ایل ۔ ایل بی (علیگ) کے دیوان کا دوسرا ایڈیشن پیش نظر ہے ۔ تقریباً ایک سو بیس صفحے کا دیوان ہے اور بیاسی صفحہ کے دیباچے ہیں ۔ ان دو سو صفحوں کی قیمت تین روپے ہے ۔ جناب صدیقی کا دیباچہ "سرود ہمستاں" ایک کتابی صورت میں بھی مل سکتا ہے ۔

مقدموں کا انداز وہی جلیگانہ ہے ۔ یعنی ؎

هم ہویا تم ہوئے یا میر ہوئے — اور جو بھی ہوئے حقیر ہوئے

غالب اور فانی کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے !! (یہ موازنہ) اب ان حدود سے گزرنے لگا ہے جکو مال اندیشی محفوظ قرار دے سکے ... ارباب نظر خود کسی نہ کسی "خاموش" فیصلہ پر پہنچ جائیں گے" یہ تو رہا غالب ۔ اب میر کی حقیقت سن لیجئے "میر کا سوز و گداز لطافت زباں اور نزاکت ادا فانی کی شاعری کا اصلی جوہر ہے" ۔ اور فرق کوئی ہے تو وہ "متقدم و متاخر کا ہے" اس کے بعد مومن کی باری ہے "استاد مومن خاں کی غزل کی جان مقطع ہوتا ہے یہ خصوصیت فانی کی شاعری (؟) کا بھی ایک نمایاں جوہر ہے مگر اسی پر اکتفا نہیں کیا ۔ بارِیش بابا ہم بازی کا ملاحظہ ہو ۔ "اقبال کی مانند انکے کلام کا مطالعہ کرنے سے ..." اور پھر "اقبال اور فانی دونوں نے نہایت محنت اور کشادہ بینی کے ساتھ مختلف زبانوں کا مطالعہ کیا ...." اور پھر ع

. . . .

مگر کلام فانی میں اس قدر شعریت ضرور ہے کہ وہ ان گلا گھونٹنے والی تعریفوں کے باوجود دیرتک زندگی کے سانس لیتا رہے گا ہر چند کہ یاسیت شاعر کے سر پر سیاہ بھوت کی طرح سوار ہے مگر فیضان الہام کے درخشاں لمحے جا بجا جلوہ ریز نظر آتے ہیں فانی غالب کے خرمن کا خوشہ چیں ہونے کے باوجود ایک آزاد تفکر کا مالک ہے۔ اس لئے جہاں کہیں وہ جذبات میں غرق ہو کر لکھتا ہے۔ طبیعت پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ صدیقی صاحب نے اپنے مقدمے میں زیادہ تر ایسی مثالیں لی ہیں۔ جن سے شاعر کے ذہن کی طراری نمایاں ہوتی ہے مثلاً ؎

حسن ہے جاوداں بے آغاز
عشق آغاز جاوداں انجام

دل کچھ نہ تھا تمہاری نظر نے بنا دیا
دنیا ہے درد عالم حسرت جہان داغ

دنیا میں حالِ آمد و رفت بشر نہ پوچھ
بے اختیار آ کے رہا بے خبر گیا

نگاہِ شوق کے دم تک تھی آنکھیں
اب آنکھیں یادگار ہیں نظر کی

راز نیرنگیٔ حقیقت ہوں
میں ہوں فانی حقیقت نیرنگ

کچھ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

بہلا نہ دل نہ تیرگیٔ شامِ غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

یہ محض ذہن کی تفریح گاہ ہی ہے۔ خوشنوا الفاظ کی یہ ترکیب بازی بہت جلد ذہن کو شل کر دیتی ہے اور سامع مبہوت ہو کر محض آوازیں سنتا رہتا ہے ؎

خطاب سوز حشر کی صدائے باز گشت ہوں
جواب بے سوال ہوں سوال بے جواب کا

وہ حرفِ صد یقین سہی حیات پھر حیات ہے
کہاں سے لاؤں اعتبار مرگِ کامیاب کا

اختیار ایک ادا تھی میری مجبوری کی
لطف سعیٔ عمل اس مطلب حاصل سے اٹھا

مگر جب فانی نظام کائنات کی توجیہات بیان کرنے کی بجائے کہ محض جو کچھ محسوس کرتا ہے اسے ظاہر کرتا ہے یعنی فلسفہ کی بجائے موضوعِ فلسفہ کو لیتا ہے تو اس وقت وہ ایک سچا شاعر معلوم ہوتا ہے ؎

دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

دل کی صورت آ کے پہلو میں تمہیں جانا نہ تھا
اور گئے بھی تھے تو جانِ بے وفا کیوں ہو گئے

اپنے دیوانے پر اتمام کرم کر یا رب
در و دیوار دئے اب انہیں ویرانی دے

اس دیوان میں کچھ ایسے شعر بھی ہیں جو فانی جیسے خشائق پسند شاعر کی شان کے شایاں نہیں ؎

فرصتِ رنج اسیری دی نہ ان دہڑکوں نے ہائے
اب چھری صیاد نے لی اب قفس کا در کھلا

اب انہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

ہائے میں کشتۂ انداز ہوں یا رب کس کا
حور آئی مرے لینے کو قضا کے بدلے

تیر سے تیغ سے خنجر سے سناں سے مارا
کئی پہلو لئے قاتل نے قضا کے بدلے

قضا آئی طبیب آیا وہ آئے دیکھ کون آیا
کسی نے اے جنوں زنجیر کھڑکائی مرے در کی

مگر بلند اور پست کس کے کلام میں نہیں۔ فانی اس وقت اردو کے چند غزل گو شعرا میں شمار ہوتا ہے اور جسکو اردو شاعری سے ذرا بھی مس ہے اس کے پاس دیوان فانی کا ہونا ضروری ہے۔ تصنعات کے سلسلے میں ایک عروضی بحث بھی ہے۔ اور شبہ ہے کہ جب بحر منسرح ہندوستانی کانوں کے لئے نامانوس ہے تو عروض سے ناواقف ہوتے ہوئے اس پر

طبع آزمائی کیوں کی جائے۔ فانی صاحب کی غزل ۔

ع غیر سے بھی اب وہ ارتباط نہیں۔ اور تو اور ناقابل معافی سکتوں سے بھری ہوئی ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ مولانا شوکت علی خان فانی بدایونی بی اے ایل ایل بی وکیل اٹاوہ { ملنے کا پتہ درج نہیں غالباً مصنف سے مل سکتا ہے ... ...

ہندوستان ہمارا

(از ابوالاثر حفیظ جالندھری)

دارالاشاعت پنجاب کی تازہ ترین سرگرمیوں کا بہترین نمونہ یہ باتصویر کتاب ہے۔
اردو کے نامور شاعر حضرت ابوالاثر جالندھری نے تاریخ ہند کی سبق آموز کہانیوں کو اس طرح نظم کیا ہے کہ ملک کے نونہال کسی سردرد کے بغیر نہایت مسرت قلب کے ساتھ ہندوستان کی شاندار روایات کو ازبریاد کرسکتے ہیں۔" رامائن کی کتھا" سے لے کر "راجہ رنجیت سنگھ" تک کے واقعات سہل ترین زبان میں منظوم کئے گئے ہیں جیسا کہ پرنسپل عبداللہ یوسف علی دیباچہ میں لکھتے ہیں "زبان سادہ اور موثر ہے۔ واقعات بے تکلفی روانی اور قادر الکلامی کے ساتھ مناسب بحروں میں نظم کئے گئے ہیں اور تاریخ کے خشک واقعات کو شاعر کے رنگین تخیل نے دلاویز بنادیا ہے .... اردو زبان میں یہ پہلی کوشش ہے کہ تاریخ ہند کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے"۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔ کرشن جی کے متعلق لکھتے ہیں ؎

کرشن گوکل کے گوالوں کی طرح پلتا رہا   خوب صورت پھول۔ بن میں پھولتا پھلتا رہا
جا کے بن میں نند کی گائیں چراتا تھا کبھی   گوپیوں میں بیٹھ کر بنسی بجاتا تھا کبھی

"اورنگ زیب کی رواداری" کے عنوان میں لکھا ہے ؎

لوگ کہتے ہیں نہیں تھا کارواں اورنگ زیب   دوسری قوموں پہ تھا نامہرباں اورنگ زیب
چاہتے تھے لوگ گالیچھرے اڑائیں شوق سے   اور غریبوں بیکسوں کا مال کھائیں شوق سے
لیکن اس نے کردیئے برخواست سب ایسے امیر   پاس اپنے رکھ لئے سب نیک اور لائق مشیر
اسکی فوجوں کا تھا افسر ایک ہندو راجپوت   اور عہدوں پر تھے اکثر نیک ہندو راجپوت
تیرتھوں اور مندروں کو اس نے جاگیریں بھی دیں   اور باغی مفسدوں کو سخت تعزیریں بھی دیں

محمد شاہ رنگیلے کا حال بہت دردناک ہے ؎

پاٹے تموریوں نے میٹھی میٹھی تانوں کے مزے   اور تلواریں لگیں لینے میانوں کے مزے

"نادر شاہ کا ذکر دیکھو۔ بچوں کی ذہنیت کا کس قدر مطالعہ کیا ہے۔ پہلا شعر ہے ؎

ہند میں مشہور ہے کیوں نام نادر شاہ کا   تھا یہ ایرانی۔ یہاں کیا کام نادر شاہ کا؟

"پانی پت کی تیسری لڑائی" ؎

ہو رہی تھی جنگ دیووں کی کہانی کی طرح   بہ رہا تھا اس زمین پر خون پانی کی طرح

غرض ایسی کتاب ہے کہ ہر ہندوستانی گھر میں ہونی چاہئے۔ درجن سے زیادہ رنگین تصاویر ہیں۔ جن میں اکبر اور اورنگ زیب کی تصاویر قابل ذکر ہیں۔ مجلد۔ حجم ۲۴۰ صفحے۔ قیمت

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور

مرآۃ الشعرا

اردو میں مولوی عبدالرحمٰن معلم السنہ مشرقیہ دہلی یونیورسٹی نے اردو زبان پر بیحد احسان کیا ہے کہ انہوں نے اس پایہ کی کتاب کو شائع کیا۔ ہماری زبان میں شاعری کی حقیقت پر اس سے زیادہ معنی خیز کتاب شاید ہی لکھی گئی ہو گو فاضل مصنف کا اصل موضوع عرب شاعری تھا مگر انہوں نے فارسی اور اردو کی مثالیں دے کر اس کتاب کو تمام مشرقی شاعری کا آئینہ بنا دیا ہے۔ عربی کی مثالوں کا لفظی ترجمہ بھی دے دیا ہے۔ اس طرح حصول زبان کے لئے بھی یہ کتاب بے حد مفید ہے انداز بیان نہایت سلجھا ہوا ہے۔ جس شخص کو شعر و شاعری کا تھوڑا سا بھی شوق ہے اس کے پاس یہ کتاب ضرور ہونی چاہیئے۔ یہ دائمی سرمایۂ لطف صرف تین روپے (۳ روپے) کو ملسکتا ہے۔ حجم ۴۰۸ صفحات۔ کاغذ عمدہ۔ سرورق نہایت اعلےٰ۔

ملنے کا پتہ:۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب معلم السنہ مشرقیہ سینٹ سٹیفنس کالج۔ دہلی

محشر خیال

اس مجموعہ پر تنقید کرتے رہنے مجھے یہ خوف ہے کہ کہیں میری تحسین کو محض حسن اخلاق کا نتیجہ نہ سمجھا جائے جوہر نقاد مرحوم مصنف کے ساتھ برتنے پر مجبور ہوتا ہے۔ میں ابتداً ہی یہ کہہ دیتا ہوں کہ یہ مجموعہ اردو کے نوادر میں شامل ہونے کے قابل ہے اور "افادات مہدی" کے سوائے ایسی طرار نثر اور کہیں نظر نہیں آسکتی۔ ہماری بدقسمتی کہ افادات مہدی کے مصنف بھی مرحوم ہیں اور "محشر خیال" کے مصنف سجاد علی انصاری۔ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (علیگ)، بھی مرحوم ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو مردہ نہیں کہنا چاہیئے ادبیات کی دنیا میں انکا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔

"محشر خیال" انصاری مرحوم کی نظم اور نثر دونوں کا مجموعہ ہے۔ نظم اور نثر دونوں میں آزادی خیال اور طرز تحریر کی جدت خاص طور پر نمایاں ہے اور کئی بار تو انکا اشہب خیال ایسی دو تیرہ زمینوں کو پامال کرتا ہے کہ ہم "رسم و رہ عوام" کے پابند جھجک کر رہ جاتے ہیں۔ انکی تحریر میں اوسکر وائلڈ کی سی شوخی ہے اور ویسی ہی فقرہ بازی! لکھتے ہیں "محبت! محبت نام ہے چند احمقانہ اعتبار اور چند طفلانہ بے اعتباریوں کا" "حسن کائنات کا ایک نہایت لطیف راز ہے۔ شرم و حیا صرف اس لئے ہے کہ حسن نسوانی کا راز دنیا پر افشا نہ ہوجائے" "میرا دامن خیال معصیت فلسفہ کے داغ سے ہمیشہ پاک رہا اور جب تک محققین نفسیات کا عبرت آموز حشر نگاہوں کے سامنے ہے میں کبھی ارتکاب تحقیق کا مجرم نہیں ہوسکتا" وسعت نظر کا اندازہ عنوانات سے ہو سکتا ہے:

"محبت کی ماہیت نفسی" "پیام زلیخا" "مذہب اخلاق" "اجتہاد و تحقیق" "مسلمانان ہند اور تحریک اصلاح" "محاسن و معاصی" وغیرہ ...... مذاق کی پاکیزگی کے لئے "روح ادب" کی تنقیص سے بڑھکر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے اور پھر یہ فقرے!! "اقبال کو جب پڑھتا ہوں خدا یاد آجاتا ہے ... پیغمبری صرف مذاہب تک محدود نہیں۔ زندگی کے ہر نظام میں ایک حقیقی پیغمبر ہوتا ہے۔ اقبال جب کہتے ہیں کہ "مرا حسنے ست در دل" تو میں اسی خلوص سے ایمان لاتا ہوں جس طرح روحیں پیمان الست کے سلسلے میں ایمان لائی تھیں میں تنہا اخلاقی سیرت کا قائل نہیں۔ اگر کوئی دل رکھتا ہے اور دماغ بھی۔ ایسے میں ان تمام ہستیوں پر ترجیح دیتا ہوں جن کی عمریں محض محاسن کے ارتکاب میں ضائع ہوئیں۔ میرے نزدیک اقبال ... حقیقی معنوں میں فوق البشر ہیں"۔!!

مگر اس مجموعہ میں جو معرکے کی چیز ہے وہ انصاری مرحوم کا "نظریۂ شیطنت" ہے۔ "حقیقت عریاں" اور "انسان" وہ ایسے مضامین ہیں کہ محض ان ہی کی اشاعت کسی مصنف کو زندہ جاوید کر سکتی ہے۔ "رعنائی خیال" کا اس سے زیادہ مرغوب نمونہ ملنا محال ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسے پُرنفاست ادیب کے اشعار بھی ایک خاص شان رکھتے ہوں گے۔ لکھتے ہیں ؎

افسانۂ حیات سے گھبرا کے اٹھ گئے — پلٹی نہ تھی مری نگہ واپسیں ابھی
کچھ ذوقِ طرفہ کار ہے کچھ بدگمانیاں — ہے ابتدائے عشق گلہ آفریں ابھی

ایک سادہ سی غزل ہے ؎

آنکھ جب تک فریب کار نہ تھی — پھول میں شوخیٔ بہار نہ تھی
اس سے پہلے بھی تیری خاموشی — تھی مگر ایسی طرفہ کار نہ تھی
یاس پر تو نے کر دیا مجبور — ورنہ امید مجھ پہ بار نہ تھی
میرے حسنِ نظر کا پرتو تھا — چمنِ دہر میں بہار نہ تھی
مَیں نے دیکھا تیری نگاہوں کو — ان میں وہ شانِ اعتبار نہ تھی

؎ جا راز کو اپنے فاش کر دے — دلداریٔ راز دار کب تک
تاکہ سکونِ غم ہے بہتر — پر غم کا بھی اعتبار کب تک

دنیائے ادب کو خواجہ منظور حسین ایم۔ اے (علیگ) کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنے مرحوم دوست کے ان جواہر پاروں کو ایک نہایت ہی شایان شان طریقے سے شائع کیا ہے ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو کی بہت کم کتابوں میں کتابت و طباعت اور کاغذ کی ایسی نفاست پائی جاتی ہے۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحہ ۱۶۱، قیمت دو روپے آٹھ آنے (۲ عہ ۸)

ملنے کا پتہ:۔ شرکتِ ادبیہ۔ قرول باغ۔ دہلی

کلام کیفی حیدرآبادی

حیدرآباد کے مشہور شاعر سید رضی الدین حسن کیفی مرحوم کے ادبی۔ اخلاقی۔ اور تاریخی کلام کا یہ مختصر سا مجموعہ جو فقط آٹھ آنے (۸/) پر محمد سردار علی صاحب کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد دکن سے ملسکتا ہے اسکا اہل زبان حضرات کے لئے بے حد افادہ بخش ہوگا۔ زبان کے اجارہ دار حضرات ایک خالص حیدرآبادی کی ایسی شستہ زبان دیکھ کر ایکبار تو چونک اٹھیں گے اور پھر شاید داغ دہلوی کی برکت کا نمونہ سمجھ کر دل کو تسلی دے لیں حضرت کیفی کی طبیعت ایک اُٹھتا ہُوا طوفان ہے۔ کئی دو غزلے اور سہ غزلے کہہ ڈالے ہیں الفاظ لونڈی غلاموں کی طرح بندھے چلے آتے ہیں۔ مگر ہے وہی الفاظ ہی کی شیشہ گری! امیر کے "صنم خانۂ عشق" کا رنگ ہے یعنی داغ کے محض طرزِ تحریر کا تتبع ہے ؎

ترے انداز ظالم کیسا ہیں کچھ بولا نہیں جاتا — سمجھ جاتا ہوں لیکن مجھ سے سمجھایا نہیں جاتا
تیرا چہرہ برابر دور سے دیکھا نہیں جاتا — جھجکتا کیوں ہے؟ آ۔ نزدیک آ رہیں کہا نہیں جاتا
ترے جور و ستم بھولے ہم اپنے درد و غم بھولے — مگر ظالم تیرا یہ بھولنا بھولا نہیں جاتا!
طبیعت کی۔ رضی ان کی۔ دل اس کا خوشی اس کی — جہاں جی چاہے جاتا ہے۔ نہیں جاتا۔ نہیں جاتا
ذرا دل لینے والے بھی تو سوچیں اپنی گھاتوں کو — کسی پر ادا کر تو میرا دل آ نہیں جاتا

غرض اسی انداز کا کلام ہے کہیں کہیں گفتگو کا مزا آ جاتا ہے مگر سب سے زیادہ دلچسپ ایک بلا قافیہ نظم ہے جس کا عنوان ہے "بیگمی کا کرشمہ"! یہ ایک مکالمہ ہے یا ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس میں عورتوں کی لڑائی کا نقشہ کھینچا گیا ہے ؎

جمیلہ بی (پڑوسن سے) اڑیں گے اے پڑوسن آ — حمیدہ (اس کی ہمسائی) لڑے تجھ سے بلا میری
جمیلہ بی - بلا تیری ترے سر پر ترے گھر پر — حمیدہ - اے تجھے صدقہ کروں گھر سے کیوں لونڈی
جمیلہ بی - اری لونڈی کی لونڈی بے حیا بدذات — مجھے صدقہ کرے گی تو؟ ذرا منہ دیکھ کل موئی
حمیدہ (آگے بڑھ کر) منہ سنبھال اپنا تو اے کتیا — نہیں تو مارے جوتوں کے ترے سب دانت توڑ دونگی
جمیلہ (دوڑ کر بال اس کی چٹیا کے پکڑ کر) مارا — ذرا میں بھی تو دیکھوں کتنی لمبی ہے تیری جوتی
حمیدہ (سر پچک کر) مر گئی میں مر گئی - اُف — اسے لوگو مجھے تو اب یہ ڈائن مار ڈالے گی
جمیلہ - کیوں مزا چکھا نہ اپنی لن ترانی کا — (ذرا اترا کے) کیوں اب سے کسی کے دانت توڑیگی!
(حمیدہ ہو کے جز بز مارتی ہے لات پیٹر دمیں) — جمیلہ گرتے گرتے بچ کے اٹھتی ہے بصد سختی

ہوا سارا محلہ ایک ان دونوں کی اودھم سے
کرشمہ ہے یہ بے فکری کا یا ہے مفت کی کشتی

مخزن حکمت یا گھر کا ڈاکٹر و حکیم

دور حاضرہ کے بہترین طبی مصنف جناب شمس العلماء ڈاکٹر غلام جیلانی کی مشہور تصنیف ہے۔ جس کے چار ایڈیشن ۱۶ ہزار کی تعداد میں فروخت ہو چکے ہیں۔ حال ہی میں اس کتاب کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا ہے جو اس وقت میرے پیش نظر ہے۔

پانچواں ایڈیشن بہت انتظار کے بعد شائع ہوا ہے۔ مگر دیر آید درست آید کے مصداق۔ اس میں ان عظیم تغیرات پر کماحقہ روشنی ڈالی گئی ہے جو جنگ عظیم کے دوران میں زیر تجربہ آئے تھے۔ سچ پوچھئے تو گذشتہ سات سالوں میں طبی دنیا میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے اور جو اطبا اس تعلیم سے بے بہرہ ہیں انہیں اپنا علم نامکمل ہی سمجھنا چاہئے۔ مخزن حکمت کے پانچویں ایڈیشن میں ان پر مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ خون کی ماہیت۔ خون اور روح۔ کلاہ گردہ وجواہر جوانی۔ افعال و وظائف دماغ۔ حفظان الصحت کے جدید نظریئے تیمارداری کے مفصل و مشرح قواعد۔ علم الجراثیم پر قدیم و جدید نکتہ نگاہ سے ایک عالمانہ بحث کی گئی ہے۔

متعدی امراض سے بچنے کے لئے ایسے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔ جن کا مطالعہ کرنا ہر ہندوستانی پر فرض ہے

امراض کا بیان اس قدر مدلل اور مفصل ہے کہ کوئی طبی کتاب اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہر مرض کی کیفیت و ماہیت۔ اسباب علامات۔ تشخیص۔ تاریخ وغیرہ کے علاوہ اول انگریزی طریق پر مفصل علاج لکھا گیا ہے اور اس میں چھوٹے بڑے نسخوں سے لے کر تمام پیٹنٹ ادویات کا بھی مفصل تذکرہ کیا ہے۔ پھر یونانی طریق علاج میں اعلےٰ پایہ کے مفید اور مجرب نسخہ جات درج ہیں۔

عام امراض کے علاوہ مردوں، عورتوں، بچوں اور حمل و حاملہ کے امراض۔ اتفاقی حادث زہروں کے علاج پر جداگانہ ابواب ہیں۔ ہر ایک باب اپنی اپنی جگہ بالکل مکمل ہے۔ زبان سادہ اور سلیس اور فواحش سے پاک ہے۔ تعلیمیافتہ عورتیں اور مرد اس کتاب سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یقیناً یہ کتاب ہر پڑھے لکھے گھر میں موجود ہونی ضروری ہے۔ اس کتاب کا حرف حرف قابل اعتماد ہے۔ کتاب میں جس قدر نسخہ جات انگریزی زبان میں ہیں وہ کتاب کے اخیر میں بطور ضمیمہ خوبصورت انگریزی ٹائپ میں لگا دیئے ہیں۔ ان نسخہ جات کی تعداد ۶۱۷ ہے۔

کتاب دو حصوں پر منقسم ہے حصہ اول حجم ۱۲۰۰ صفحات قیمت مجلد ۱۲ محصولڈاک ۱۴ حصہ دوم حجم ۱۲۰۰ صفحات مجلد ۱۲ محصولڈاک ۱۴ محصولڈاک ہر دو حصہ عہ ۔ اڑھائی ہزار صفحوں کی کتاب جو بیش بہا مضامین، بہترین لکھائی چھپائی اور مضبوط خوبصورت جلد رکھتی ہو ساڑھے گیارہ روپے میں بہت ارزاں ہے۔ ملنے کا پتہ:- **طبی کتب خانہ گمٹی بازار لاہور**

شباب

سائز ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۱۴۴ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ نظر فریب

دفتر کتب خانہ حامیُ الصحت چھتہ بازار لاہور سے ۱۲؎ میں طلب کیجئے

اس کتاب کو جناب حکیم ڈاکٹر مرزا امام الدین صاحب سابق میڈیکل آفیسر خاندان شاہی کابل نے تصنیف فرمایا ہے۔ اس کتاب میں امراض مردانہ کے متعلق معقول پیرایہ میں بحث کرنے کے علاوہ ان تمام امراض کے لئے نسخہ جات بھی درج کئے گئے ہیں۔ جن کی فی زمانہ کمزور آدمیوں کو ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ قابل مصنف نے علمی اور عملی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ حاجتمند اصحاب مندرجہ بالا پتہ سے طلب کریں ؂

چار سہیلیاں

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۱۰۰ صفحات۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

جناب ایم اسلم صاحب نے جنہوں نے بچوں اور لڑکیوں کے لئے متعدد دلچسپ اخلاقی افسانے سلیس اردو زبان میں لکھے ہیں ہمیں اپنی تازہ ترین تصنیف چار سہیلیاں برائے ریویو ارسال کی ہے۔ ہم جناب میاں محمد اسلم صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انکی یہ تازہ تصنیف ہر پہلو سے مکمل ہے۔ اس کتاب میں چار دلچسپ کہانیاں ہیں۔ طلسمی انگوٹھی۔ کالی پٹاری۔ گل لالہ اور طلسماتی صراحی۔ کتاب میں تین بلاک کی تصاویر بھی ہیں۔ جن میں سے ایک سہ رنگی ہے۔ کتابت لکھائی چھپائی نظر فریب۔ کہانیاں ازحد دلچسپ اور سبق آموز۔ نسیم بکڈپو اردو بازار لاہور سے طلب کیجئے

کھنڈی کلاتھ

مشہور مزدور لیڈر مسٹر مکلات والے جو آج کل ہندوستان کا دورہ فرما رہے ہیں۔ اپنی ایک تقریر میں فرمایا ہے کہ ہندوستان کی ترقی کا راز کھدر میں نہیں بلکہ ایسے کارخانے قائم کرنے میں ہے۔ جو یورپ کے مقابلہ میں مال تیار کر سکیں۔ اس کے متعلق ہم نے نیرنگ کے تیسرے نمبر ہی میں چرخہ کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا۔ بلاشک شبہ ہندوستان کی ترقی صرف ایسی مصنوعات کے تیار کرنے پر منحصر ہے جو بدیسی مصنوعات کے مقابلہ میں فروخت ہو سکیں۔ اس لئے جب کبھی کوئی فرم اپنی کسی دیسی ایجاد سے ہمیں اطلاع دیتی ہے تو ہم اس کے متعلق کچھ لکھنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ کھنڈی کلاتھ یورپ سے آکر بکثرت فروخت ہوتا ہے اور گرمیوں میں انگریز اور ہندوستانی اسے بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ سید عباس علی شاہ احسان اینڈ کمپنی سوداگران لدھیانہ نے بالکل ولایتی قسم کا کھنڈی کلاتھ تیار کر دیا ہے۔ جس کا دو گز کپڑا ایک کوٹ کے لئے کافی ہے۔ عرض ۱½ گز ہے۔ قیمت فی گز ایک روپیہ چودہ آنہ (۱۴/عہ) یہ کپڑا دھلانے سے خوبصورت نکلتا آتا ہے اور مضبوط اس قدر ہے کہ ولایتی کپڑا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا جو لوگ کھنڈی کلاتھ کے کوٹ گرمیوں میں پہننے کے شائق ہوں۔ انہیں احسان اینڈ کمپنی لدھیانہ سے ضرور طلب کرنا چاہیئے ؂

رنگین قطعات

سات سات اور آٹھ آٹھ رنگ میں بڑے سائز پر رنگین قطعات شائع کرنے میں حافظ قمر الدین اینڈ سنز موچی دروازہ لاہور نے عام پبلک مذاق کو سدھارنے میں قابل قدر امداد دی ہے۔ مفصل حالات اس ضمیمہ سے ملاحظہ فرمایئے جو لمعاتِ نور کی پشت پر درج ہے ؂

منظومات

میٹھے بول

غیر مطبوعہ

جناب خواجہ دل محمد ایم۔اے پروفیسر ریاضی اسلامیہ کالج لاہور میونسپل کمشنر و فیلو پنجاب یونیورسٹی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ ایک برگزیدہ شہری اور شاعر کی حیثیت سے تمام ملک میں مشہور ہیں۔ اس وقت ہم ان کے کلام کا ایک ایسا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو ہمارے خیال میں اُردو زبان میں اپنا نمونہ آپ ہی ہے۔ پاکیزہ جذبات کو ایسی سادہ زبان میں (جو بقول آپ کے اُردو۔ ہندی اور پنجابی کا عادِ اعظم ہے) پیش کیا گیا ہے کہ شاید اس انتہائے فن کو فقدانِ فن تصور کیا جائے۔ مگر ماہرینِ بلاغت خوب جانتے ہیں کہ سہل ممتنع کلام اسی کو کہتے ہیں۔ ہم بالخصوص ان نوجوانوں کو جو خلافِ طبع تتبع غالب میں وقت ضائع کر رہے ہیں۔ مشورہ دیتے ہیں۔ کہ وہ خواجہ صاحب کی اِس ایجاد کو مشعلِ راہ بنائیں۔

ایڈیٹر

زندگی اور عمل

زندہ ان کو مت سمجھ لاشیں پھریں تمام — زندہ وہ جو مر چکے اور زندہ ان کے نام
شاہ راہ پر وقت کی دھوپ کہیں پر چھاؤں — ننھی ننھی زندگی چلتی ننگے پاؤں
تل ننھا سا بیج ہے تل کے اندر تیل — تیل کے اندر نور ہے تو دِل کو تل سے میل
ٹہر چلی ٹکسال سے لے کر چہرہ لال — گھس گھس ہلکا مال ہو جوں جوں گزریں سال

تقدیر

سرپٹ دُلکی پوئیا۔ جو چاہے چال چلائے — آنکھیں بندھی کمیت کی مالک نظر نہ آئے
سوئی سر کے بل چلے قسمت سے کیا زور — مُڑ مُڑ پیچھے دیکھتی ہاتھ پیا کے ڈور

درسِ عبرت

کلی چٹک کر پوچھتی کیوں مرجھایو پھول — پھول کہے مت پھول میں گیا پھول کر بھول

رہٹ چلے تو دیکھ کر منعم عبرت پائیں
باسن بھر بھر آرہے اور خالی ہو ہو جائیں

چڑیا لیجا گھونسلا چھوڑ اب مرا مکان
چڑیا پوچھے ہیں میاں کیا یہ ترا مکان

پتہ ٹوٹے شاخ سے شاخ بڑہائے ہاتھ
کانپے لرزے سر دُھنے پات نہ آئے ہاتھ

انڈا اپنے خول میں سونا رکھے چھپا
اس سونے کو پر لگیں خول توڑ م اڑ جائے

قناعت

ہیرے موتی چاب کر بھرے نہ تیرا پیٹ
دو روٹی کے واسطے کیوں اِتنی السیٹ

قدرت

چڑیا تیرے واسطے اُگے سبھی پھل پات
قُدرت چوگا دے رہی لبے کر کر ہاتھ

سیّد القوم خادمھم

اپنی فکر نہ کچھ کریں مُلک وطن کے داس
سوئی ننگی خود رہے اور سب کا سئے لباس

آج اور کل

پچھلا کل دفنا چکے اگلا کل کل ہو
اِس کل کل کو چھوڑ دے آج نہ بیکل ہو

عطیۂ عزیز

صبح

غیر مطبوعہ ل

جمالِ مہر انجم سوز محوِ گرمجوشی ہے
گلوں میں ہر طرف ہنگامۂ شبنم فروشی ہے

چمن مطرب، تجلی نغمہ زن، عالم نشاط افزا
اگر زاہد بھی پی لے مے تو وقتِ چشم پوشی ہے

شجر ہیں وجد میں سرشار ہے معمورۂ دُنیا
نسیم صبحگاہی مستِ شغل مے فروشی ہے

افق سے پھیلتی جاتی ہیں کرنیں مست ہے ہر شے
چھلکتا جام ہے ٹوٹی ہوئی مہرِ خموشی ہے

شفق کا بادۂ گلرنگ اور یہ جامِ مینائی
طلوعِ صبح بھی تمہیدِ رسمِ بادہ نوشی ہے

عزیزؔ آزاد طائر شاخ گل پر چہچہاتے ہیں
حیات اپنی مگر وابستۂ حلقہ بگوشی ہے

عزیز لکھنوی

ل خیابان کے نادرہ نمبر میں جو ابھی وصول ہوا ہے یہ نظم درج ہے

مزدور کا گیت

(از جناب محمد الدین صاحب تاثیر ایم۔ اے)

اِس قسم کی نظم اُردو ہی نہیں، بلکہ مغرب کی کسی زبان میں بھی نہیں لکھی گئی۔ سہل ممتنع زبان میں اقتصادی مسائل کو مذہب۔ جمالیات اور سیاسیات سے ٹکرایا گیا ہے۔ اور مزدور کے نقطۂ نظر کو سب سے بالاتر بتایا گیا ہے۔ ہماری نظر سے آجتک ایسی کامیاب نظم نہیں گزری۔
ایڈیٹر

چکّی پیسو ۔ روٹی کھاؤ اپنی محنت کا پھل پاؤ
ہندو ۔ مسلم ۔ سب جھوٹے ہیں لایعقل ہیں یہ الجھاؤ
ان جھگڑوں میں تم مت آؤ
چکّی پیسو ۔ روٹی کھاؤ

حسن کی دُنیا ۔ حسن کی دولت! عیش و عشرت ۔ ناز و نعمت
خسرو اور فرہاد کو دیکھو لاحاصل ہے عشق میں محنت
خون پسینے پر نہ بہاؤ
چکّی پیسو ۔ روٹی کھاؤ

ہندی کا ہو ہندی آقا اچھّا ۔ صاحب ۔ پھر کیا ہوگا
وہ کیا ہم سے کام نہ لے گا کام کی جب اُجرت ہے پھر کیا؟
کام کرو اور خوب کماؤ
چکّی پیسو ۔ روٹی کھاؤ

نا ۔ ایسے ہیں ۔ نا ۔ ویسے ہیں یہ لیڈر بھی ہم جیسے ہیں
ان کو بھی ہے پیٹ کا دھندا ان کا مقصد بھی پیسے ہیں
ان کی باتوں میں مت آؤ
چکّی پیسو ۔ روٹی کھاؤ

غیر مطبوعہ

حُسن

(از جناب مولانا غلام رسول صاحب مہرؔ بی اے)

اے حُسن جوہرِ دل کون و مکان ہے تو
جسمِ جہاں میں صورتِ روح و روان ہے تو

شاداب ہے سرشکِ وفا سے چمن ترا
پردوں سے سازِ کُن کے بنا پیرہن ترا

قائم ترے وجود سے ہے بزمِ سوز و ساز
پوشیدہ نظمِ کون و مکاں کا ہے تجھ میں راز

پستِ جہاں ادائے سجودِ نیاز ہے
اے حسن یہ تری ہی سراپا نماز ہے

برقِ نگاہ تیری نظر سوز دیدہ ہے
چشم آفرینِ حلقۂ جیبِ دریدہ ہے

قائم جہاں میں زینتِ ہستی تجھی سے ہے
گل میں ہے بو، شراب میں مستی تجھی سے ہے

اس دورِ خیرہ چشم میں پوشیدہ ہو کے بیٹھ
عہدِ کہن کی جلوہ نمائی کو رو کے بیٹھ

غافل ہے تجھ سے محفلِ نو کی نگاہ دیکھ
اب عشق ڈھونڈھتا نہیں تیری پناہ، دیکھ

یہ انجمن مٹی ہوئی جام و سبو پہ ہے
دستِ ہوس دراز تری آبرو پہ ہے

پہلی سی عشق میں وہ کہاں جاں گدازیاں
مل جائیں خاک میں نہ تری پاک بازیاں

چھوڑا ہے غزنوی نے وہ سوز و گداز آج
سوءِ ادب ہے عشوہ و نازِ ایاز آج

سرجوشِ وردِ عشق کا دریا اُتر گیا
مجنوںؔ و کوہکنؔ کا زمانہ گزر گیا

ہوتا ہے آج غم میں ترے بیقرار کون
بنتا ہے اپنی آرزوؤں کا مزار کون

یہ انجمن ہے سرخوشِ کیفِ مَے فتور
ہاں اتیری رُخ نمائی کے قابل نہیں یہ طور

زلفِ طلب میں درد کا شانہ نہیں رہا
اے حسن آہ! تیرا زمانہ نہیں رہا

بس اب نہ چھیڑ تارِ ربابِ الست کو
بے نور چھوڑ چشمِ تماشا پرست کو

آزار دے نہ شیونِ غم بے سبب تجھے
کھینچے نہ کوہ و دشت میں ذوقِ طلب تجھے

بندِ قبائے صبح نہ کھولے ہوا تیری
خورشید کا دیا نہ جلائے ضیا تری

خالی رہے شراب سے تیری سبوئے گل
جھونکا ہو اک ہوا کا فقط، موجِ بوئے گل

اس غمکدے میں شمعِ تمنّا جلا نہ تو
افتادگی کے خواب سے دِل کو جگا نہ تو

مستورِ چشمِ دہر میں مثلِ نگاہ ہو
وہ دل نہیں رہا جو تری جلوہ گاہ ہو

گردِ ہوس کا ہے سرمہ کشِ چشمِ روزگار
گم ہو کہ اس پہ تیری حقیقت ہو آشکار

بے تاب پھر ہو عشق ترے اشتیاق میں
آباد کوہ و دشت ہوں تیرے فراق میں

غیر مطبوعہ

گلشنِ جنّت

وُہ ملک جو ایک سمندر ہے لمبے چوڑے میدانوں کا
مجموعہ ریگستانوں کا اور ناہموار چٹانوں کا
اِک صحرا جس کے سینے پر آتش کے شرارے پھرتے ہیں
اِک ویرانہ جس میں سنّاٹے مارے مارے پھرتے ہیں
وُہ سیر گہِ وحشت زا جو ہے عشرت گاہ بگولوں کی
سنسان بیاباں جس میں فوجیں آسودہ ہیں غولوں کی
وہ دشت جہاں پر شور ہوائیں گرد و غبار اُڑاتی ہیں
مٹّی کی چھاؤنی چھاتی ہیں مٹّی کا فلک بن جاتی ہیں
طوفانی ریگ رواں جس میں زہریلے طوفاں اُٹھتے ہیں
غصّے میں بھر کر کالے۔ نیلے۔ پیلے طوفاں اُٹھتے ہیں
وُہ مٹّی کے تودے جن پر کرنوں کی بارش ہوتی ہے
وُہ ریت جو رات کی چادر میں تاروں کے نیچے سوتی ہے
وُہ وسعت ذرّے ذرّے کو جو دشت بنائے بیٹھی ہے۔
گنتی کے نخلستانوں کو دامن میں چھپائے بیٹھی ہے
ہاں ہاں وُہ عرب جو گہوارہ ہے ظلمت سوز تمازت کا
اُس ہی میں چھپا کر رکھّا ہے۔ اللہ نے گلشن جنّت کا

غیر مطبوعہ

ابوالاثر حفیظ جالندھری

برکھا رُت

ابرِ رحمت کو برس کر عالم آرائی ملی — پتّے پتّے کو چمن میں شانِ رعنائی ملی
آنکھوں آنکھوں میں ہوئی آرائشِ بزمِ بہار — ذرّہ ذرّہ میں فسوں کو کارفرمائی ملی

وسعتِ گیتی پہ فرشِ سبزہ بچھ جانے لگا — لالہ و گل کو افق تک جلوہ آرائی ملی
چرخ پر قوسِ قزح سے موج رنگ اٹھنے لگی — میکشوں کو چشمِ ساقی کی شناسائی ملی
جھومتی شاخوں پہ مرغانِ چمن کو ہر طرف — سبزہ پوشی، بادہ نوشی نغمہ پیرائی ملی

صحنِ گلشن میں کھنچی تصویرِ حسن و عشق کی — شاخِ گل پر، گل سے ملنے عندلیب آئی ملی
خود نمائی کا تقاضا تھا وفورِ حسن کو
دیدۂ شاعر کو اس محفل میں بینائی ملی

غیر مطبوعہ

حامد اللہ خاں ایڈیٹر ہمایوں

کلامِ سیفی

شکوۂ جور نہ سمجھیں وہ حکایت میری — کہیں بدنام نہ ہو جائے محبت میری
کیا نگاہِ غلط انداز کا منشاء یہ ہے — تیر کے ساتھ نکل جائے نہ حسرت میری
کون ہیں آپ؟ یہ میں کچھ سا ہوں ان سے — دیکھئے میرا جنوں، دیکھئے وحشت میری
ایسی صندل کہیں دیکھی ہے الٰہی توبہ — اس پہ مچلے ہیں تجھے کیوں ہے محبت میری
ادبِ عشق نے کھلنے نہ دیا دل کا بھرم — بڑھ گئی ان کی حیا سے بھی مروّت میری
روتے روتے مجھے لگ جاتی ہے چپ بھی اکثر — جائیے رُک گئے کیوں؟ اچھی ہے حالت میری
ہو گیا چور سُنا کر میں فسانا دل کا — تم سے کیا حال کہا۔ آگئی شامت میری

غیر مطبوعہ

آج ٹھکرا کے وہ سیفی کی لحد سے کہتے تھے
یہ وہ ہے جس کو گوارا نہ تھی فرقت میری

سیفی سہواروی

خمخانۂ عرفان

(اکبر آباد کے نامور ترین ادیب سیّد نظام الدین شاہ دلگیر کی زمزمہ ریز غزل)

مَیں ازل ہی سے غمِ عشق فراموش نہ تھا
اُس زمانہ میں گئے ہوش کہ جب ہوش نہ تھا

حضرتِ عشق کو اللہ سلامت رکھے!
جلوۂ حسن جو دیکھا تو مجھے ہوش نہ تھا

کیوں مجھے بھول گیا وقتِ کرم داورِ حشر
خود فراموش تھا مَیں یار فراموش نہ تھا

عالمِ شعر میں ہوتی تھی مری عمر بسر
شعر کہنے کا بھی جس وقت مجھے ہوش نہ تھا

ایک یہ وقت بھی اب ہے کہ مجھے موت نہیں
ایک وُہ وقت بھی گزرا ہے مجھے ہوش نہ تھا

کونسا معجزہ ایسا تھا جو اے حضرتِ عشق
جنبشِ لب میں کسی شوخ کی روپوش نہ تھا

ہائے کیا چیز تھا وہ عہدِ تمنّا میرا!
جب کسی بات کا دُنیا میں مجھے ہوش نہ تھا

وہ بھی کیا دِن تھے کہ جب حُسن تھا ان کا معصوم
وُہ بھی کیا دِن تھے کہ جب عشق کو کچھ ہوش نہ تھا

ہاں، اِدھر دیکھ، تجھے اپنی نگاہوں کی قسم!
آج میخانہ میں باقی کوئی مے نوش نہ تھا

ہائے وُہ سادگیِ حُسن کا تیرے عالم!
جبکہ خود اپنی اداؤں کا تجھے ہوش نہ تھا

اِک زمانہ تھا کہ کرتا تھا جگر کے ٹکڑے
اِک زمانہ تھا کہ دِلگیر بھی باہوش نہ تھا

غیر مطبوعہ

دِلگیر

حضرتِ حفیظ کی تازہ غیر مطبوعہ غزل

سمجھا ہوا ہوں شومیٔ دستِ دُعا کو مَیں
کچھ روز اور دیکھ رہا ہُوں خُدا کو مَیں

ثابت قدم رہوں کہ تلاطم کا ساتھ دُوں
ساحل کے رُخ تو لا نہ سکوں گا ہوا کو مَیں

کشتی خُدا پہ چھوڑ کے بیٹھا ہے مطمئن
دریا میں پھینک دُوں نہ کہیں ناخدا کو مَیں

انسان ہوں۔ خطائے وفا بخش دیجئے
بس کیجئے۔ پہنچ تو چُکا ہوں سزا کو مَیں

مطلب پرست دوست نہ آئے فریب میں
بیٹھا رہا لئے ہوئے دامِ وفا کو مَیں

آ۔ اے جنونِ عشق کہ تکمیلِ زیست ہو
توڑوں طلسم خانۂ ارض و سما کو مَیں

ابوالاثر حفیظ جالندھری مدیر مخزن

(جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ)

کلام اصغر

نمایاں کر دیا اس نے بہار روئے خنداں کو ۱ کہ دی نغمے کو مستی۔ رنگ کچھ صحن گلستاں کو

ذرا تکلیف جنبش دے نگاہِ برق ساماں کو ۲ جہاں میں منتشر کر دے مذاق سوز پنہاں کو

ذرا روکے ہوئے لوِ رخ تبسمہائے پنہاں کو ۳ ابھی یہ لے اڑینگی بجلیاں تارِ رگ جاں کو

بس اتنے پہ ہوا ہنگامۂ دار و رسن برپا ۴ کہ لے آغوش میں آئینہ کیوں مہر درخشاں کو

سنا ہے حشر میں شان کرم بیتاب نکلیگی ۵ لگا رکھا ہے سینے سے متاع ذوق عصیاں کو

اب ان رعنائیوں پر شکوۂ جور و ستم کیسا؟ ۶ کہ خواب آلود اس نے کر لیا چشم پشیماں کو

ہوئے جو ماجرے خلوت سرائے راز میں اس سے ۷ نہ کفر اب تک ہوا واقف خبر اس کی نہ ایماں کو

یہاں کچھ نخل پر بکھرے ہوئے اوراق رنگیں ہیں ۸ مگر اک مشت پر سے پوچھئے راز گلستاں کو

دکھائی صورتِ گل پر بہار شوخیٔ پنہاں ۹ چھپایا معنیِ گل میں کبھی حسن نمایاں کو

تمنا ہے نکل کر سامنے بھی عشوہ فرما ہو ۱۰ کوئی دیتا ہے جنبش پردۂ بیتابیِ جاں کو

نہ میں دیوانہ ہوں اصغر نہ مجھ کو ذوقِ عریانی
۱۱
کوئی کھینچے لئے جاتا ہے خود جیب و گریباں کو

(غیر مطبوعہ براہ راست) (حضرت اصغر گونڈوی)

غزل

مولانا سُہا کا غیر مطبوعہ کلام

محبّت ہے تو پھر اُس کی ستمگاری کا ڈر کیوں ہو
مرے لب پر معاذ اللہ کیوں ہو الحذر کیوں ہو

محبّت ہو، وفا کا پاس ہو، خود تم کو الفت ہو
جو تم چاہو تو کیا کچھ ہو نہیں سکتا مگر کیوں ہو

مُکر جا اپنے جانے سے کہ غیریت رہے باقی
خدارا یہ نہ کہہ ظالم کہ وہ دُشمن کا گھر کیوں ہو

تیری افزائشِ حُسن و ادا کا یوں تو کیا کہنا
مگر دُنیا کو جو برباد کر دے اس قدر کیوں ہو

سُہا اس درجہ مایوسی اور ایسے کثرتِ ارماں
قفس میں جینے والوں کو ہوائے بال و پر کیوں ہو

مرسلہ۔ کنور محمد یٰسین علی خاں

غزل

(از جناب سیّد ذوالفقار علی خاں بخاری ممبر بورڈ آف اگزیمینرز)

آج ہم نے خانۂ امید ویراں کر دیا
اور اپنے دل کو نذرِ چشمِ گریاں کر دیا

ساری دُنیا کا مجھے ہی دیدیا رنج و محن
ساری دُنیا کو مرے ہی دل میں پنہاں کر دیا

ساحلِ دریائے الفت پر دلِ پر آرزو
ایک بستی تھی جسے اشکوں نے ویراں کر دیا

دید کی امید تھی میرے لئے سامانِ زیست
اور کیا کرتا اسی کو نذرِ مہماں کر دیا

جس کا دل ٹوٹا ہُوا ہو اس کو دُنیا سے غرض؟
میرے نزدیک آپ نے دُنیا کو ویراں کر دیا

شرم سی آتی تھی مجھ کو خیر گزری اُٹھ گئے
دوستوں نے میرا مرنا مجھ پہ آساں کر دیا

گوہرِ معنی کہاں سے آئے جب افکار نے
میری فکرِ نارسا تک کو پریشاں کر دیا

(غیر مطبوعہ) بخاری

کلامِ فانی

واہمہ کی یہ مشق پیہم کیا — یاس و امید شادی و غم کیا
گرم و سردِ زمانہ جو کچھ ہو — ورنہ فردوس کیا جہنّم کیا
اُن کے آگے غم اک فسانہ ہے — اُن سے کہئے فسانۂ غم کیا
تا کجا آہِ زیرِ لب آخر — انتہائے سکوتِ برہم کیا
تم کو اس رازِ ماسوا کی قسم — تم پہ چھایا ہُوا ہے عالم کیا
سوزِ غم کی حدیں نہیں ملتیں — بُجھ گئی آتشِ جہنّم کیا
عیشِ رفتہ کے یاد سے حاصل؟ — قصّۂ خلد و ذکرِ آدم کیا
غمِ دُنیا بقدرِ ظرف نہیں — حسرتِ بیش و شکوۂ کم کیا

موت جس کی حیات ہو فانی
اُس شہیدِ ستم کا ماتم کیا

(غیر مطبوعہ)

زمزمۂ تغزّل

از جناب پنڈت ہری چند صاحب اختر بی اے

تری میعادِ غم پوری ہوئی اے زندگی خوش ہو — قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے میں تجھے آزاد کرتا ہوں
مَیں اپنے دِل کا مالک ہوں مرا دِل ایک بستی ہے — کبھی آباد کرتا ہوں کبھی برباد کرتا ہوں
ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں۔ ملاقاتوں کے بعد اکثر — وُہ مجھ کو بھول جاتے ہیں مَیں اُن کو یاد کرتا ہوں
خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا — خودی کی انتہا یہ ہے خُدا کو یاد کرتا ہوں
جفاکارو مری مظلوم خاموشی پہ ہنستے ہو — ٹھہر جاؤ ذرا دم لو۔ ابھی فریاد کرتا ہوں

بُتوں کے عشق میں کھویا گیا ہوں ورنہ اے اختر
خُدا شاہد ہے مَیں اکثر خُدا کو یاد کرتا ہوں

(غیر مطبوعہ)

اختر

غزل

۴

ابوالحسان جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری تلمیذ حضرت حالی مرحوم

انتہائے یاس و حسرت ہو گئی — زندگی سامانِ کلفت ہو گئی
اب فریبِ مہربانی رائگاں — زندگی بھر کو نصیحت ہو گئی
اب امیدِ چشمِ الفت بے محل — نامرادی وجہ عبرت ہو گئی
یاس کل تک جس سے ہم واقف نہ تھے — آج امیدوں کی غایت ہو گئی
بیکسی جس سے کبھی بیگانہ تھے — اب شریکِ رنج و راحت ہو گئی
وہ امیدِ وصل جو دمساز تھی — خوبیٔ قسمت سے حسرت ہو گئی
قصۂ ناکامیابی کیا کہوں — آہ! ہر کوشش اکارت ہو گئی
اب غمِ فرقت نہ ارمانِ وصال — آس کیا ٹوٹی کہ فرصت ہو گئی
عرض حالت کرکے خود حیران ہوں — کیا کہوں کیونکر یہ جرأت ہو گئی
کیا کریں اہل نیاز اب کیا کریں — بے نیازی اس کی عادت ہو گئی
کیا بتا سکتا ہوں۔ کچھ دیکھا بھی ہو — پردہ اٹھنا تھا کہ حیرت ہو گئی
آج تک ارمان باقی ہیں تو ہوں — شادمانی بل کئے رخصت ہو گئی

کچھ تو اے آزاد حالِ دل بتا
کچھ تو کہہ آخر یہ کیا گت ہو گئی

(غیر مطبوعہ)

غزل

جناب پروفیسر محمد اکبر خاں حیدری انبالوی سکرٹری "بزم اردو" دہلی

مری غم دوستی میں اب نئے پہلو نکلتے ہیں — مسرت کی پذیرائی کو بھی آنسو نکلتے ہیں
بہت دلکش ہیں نظارے مری بربادیٔ دل کے — نگاہِ ناز کے نشتر بہت دلجو نکلتے ہیں
وفورِ یاس میں جو اک متاعِ بے حقیقت تھے — ہجومِ شادمانی میں وہی آنسو نکلتے ہیں
فسانے حسن و الفت کے بہت معصوم ہیں لیکن — مَیں دوہراتا ہوں جب ان کو تو یہ جادو نکلتے ہیں

مشیت کی پرستاری اور اس انداز سے اکبر
دعا لب پر نہیں آتی مگر آنسو نکلتے ہیں؟

اکبر حیدری

(غیر مطبوعہ)

غزل

پردے کے قریں مجمع ایسا نظر آتا ہے
پردے میں بھی وہ جلوہ گویا نظر آتا ہے

اب جوشِ جنوں حد سے بڑھتا نظر آتا ہے
یعنی کہ مجھے (——) زنداں صحرا نظر آتا ہے

آئینہ میں کیوں تجھ کو تجھ سا نظر آتا ہے
یکتائی میں اب تیری دھوکہ نظر آتا ہے

کر غور ذرا اے دل موت آئی ہے یا قاتل
یہ کون سر بالیں ہنستا نظر آتا ہے

مجھ سے نہیں آج اُس نے دشمن سے کیا وعدہ
اب وعدہ خلافی میں دھوکا نظر آتا ہے

بازارِ محبت کی اللہ رے ارزانی
اب جان کا سودا بھی سستا نظر آتا ہے

یہ بات تو دیکھی ہے اس گلشنِ ہستی میں
اچھا نہ سہی لیکن اچھا نظر آتا ہے

اب اپنی جفاؤں پر نادم ہے فلک شاید
سر سوئے زمیں اُس کا جھکتا نظر آتا ہے

کہتے ہیں کہ ہم اُس کی تقدیر میں کیوں ہوتے
ہر وقت جو بدقسمت روتا نظر آتا ہے

اب مَیں اُنہیں کیا سمجھوں جو مجھ کو بُرا سمجھیں
کہتے ہیں کہ اچھوں کو اچھا نظر آتا ہے

مرنا بھی جُدائی میں برحق نہ رہا شاید
اب تو مجھے اس میں بھی دھوکا نظر آتا ہے

مَیں اُس کو سمجھتا ہوں شامت سے رقیب اپنا
جو اپنے مقدر کو روتا نظر آتا ہے

پہنچی ہے اب اس حد کو افسردہ دلی میری
رنگِ چمنِ ہستی پھیکا نظر آتا ہے

ظاہر میں قمرؔ اُن سے غیروں کی طرح ملئے
اظہارِ محبت میں جھگڑا نظر آتا ہے

(غیر مطبوعہ) قمرؔ بدایونی

خیالاتِ مختار

نہیں ہوں کچھ بھی مگر کیا کہوں کہ کیا ہوں مَیں
فضائے قدس کی گونجی ہوئی صدا ہوں مَیں

جو آ کے دل سے نہ نکلے وہ مدعا ہوں مَیں
ٹپکتی یاس ہو جس سے وہ التجا ہوں مَیں

ہر ایک رنگ میں پاتا ہوں کچھ جھلک تیری
ذرا جو غور کی نظروں سے دیکھتا ہوں مَیں

تجلّیوں سے تری جگمگا اُٹھے ذرّے
تجھے خبر ہے کہ کب سے تڑپ رہا ہوں مَیں

جنونِ شوق میں کچھ ایسی میری حالت ہے
کہ اپنی باتوں پہ خود وجد کر رہا ہوں مَیں

ارادہ ایک بھی پُورا نہ ہو سکا افسوس
وہ دردمند الم خوگر وفا ہوں مَیں

کھلا یہ میری حقیقت کا مدعا مختار
اجل نصیب ہوں۔ پروردۂ فنا ہوں مَیں

(غیر مطبوعہ) مختار بدایونی

ع کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

غالب کی طرح پر دو غزلیں

کلامِ تاثیر

حسن کیا ہے۔ ایک پرتو ہے تری تنویر کا
معصیت کیا چیز ہے۔ سایہ اسی تصویر کا

مٹ گیا آخر۔ بُرا ہو نالۂ شبگیر کا
وہ جو تھا اِک رابطہ تعزیرِ بے تقصیر کا

طرزیہ تخئیل کا۔ اسلوب یہ تحریر کا
چھپ نہیں سکتا چھپائے سے بیاں تاثیر کا

آنکھ اب تک دیکھتی ہے لب ترے ہلتے ہوئے
کان لیتے ہیں مزا اب تک تری تقریر کا

میرے دم سے اِک "جنوں آباد" ہے زندان عشق
خندۂ وحشت اِدھر شیون اُدھر زنجیر کا

مدعائے شرحِ دردِ دل ہے شرحِ دردِ دل
آہ کرتا ہوں مگر طالب نہیں تاثیر کا

میرے دل کی آگ جا پہنچی جہنّم کی طرف
ورنہ مَیں قائل نہ تھا تقصیرِ بے تعزیر کا

عاشقی؟ کچھ بھی نہیں۔ اِک نام ہے تدبیر کا
حسن؟ اِک سرخیلِ اعظم لشکرِ تقدیر کا

(غیر مطبوعہ) تاثیر ایم۔ اے

IQBAL ACADEMY PAKIS
LIBRARY
Acc. No: 39574

کلامِ فانی

ہل گیا زنداں بُرا ہو نالۂ شبگیر کا
چونک اُٹھا گھبرا کے ہر حلقہ مری زنجیر کا

عشق کا بھی کیا تصرف ہے کہ دل اب دل نہیں
آئینہ ہے غم کی جیتی جاگتی تصویر کا

آپ کی آزردگی بے سبب بھی خوب ہے
کیا مرے کا ہے تقاضا عذرِ بے تقصیر کا

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر
کیا یہ ساری عمر مُنہ تکتی رہیں تقدیر کا

فکرِ راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

میرے دل سے پُوچھتے ہیں آپ کیا وجہِ خلش
یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

کس نظر سے اس نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اُٹھا ہر ذرّہ میری خاکِ دامنگیر کا

نامرادی حد سے گزری حال فانی کچھ نہ پُوچھ
ہر نفس ہے اِک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

فانی بدایونی